مستقل اہمیت کی حامل معیاری اور شگفتہ تحریریں

سیارہ ڈائجسٹ

ستمبر 2014

لڑتے لڑتے ہو گئی گم
ایک کی چونچ اور ایک کی دُم



القرآن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ الانعام

تم سے پہلے بہت سی قوموں کی طرف ہم نے رسول بھیجے اور اُن قوموں کو مصائب و آلام میں مبتلا کیا تا کہ وہ عاجزی کے ساتھ ہمارے سامنے جھک جائیں۔ پس جب ہماری طرف سے ان پر سختی آئی تو کیوں نہ انہوں نے عاجزی اختیار کی؟ مگر ان کے دل تو اور سخت ہو گئے اور شیطان نے ان کو اطمینان دلایا کہ جو کچھ تم کر رہے ہو خوب کر رہے ہو۔ پھر جب انہوں نے اس نصیحت کو جو انہیں کی گئی تھی، بھلا دیا تو ہم نے ہر طرح کی خوشحالیوں کے دروازے ان کے لیے کھول دیے۔ یہاں تک کہ جب وہ اُن بخششوں میں جو انہیں عطا کی گئی تھیں خوب مگن ہو گئے تو اچانک ہم نے انہیں پکڑ لیا اور اب حال یہ تھا کہ وہ ہر خیر سے مایوس تھے۔ اس طرح ان لوگوں کی جڑ کاٹ کر رکھ دی گئی جنہوں نے ظلم کیا تھا اور تعریف ہے اللہ رب العالمین کے لیے (کہ اس نے ان کی جڑ کاٹ دی)۔

(۴۲تا۴۵)(حوالہ تفہیم القرآن از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی)

الحدیث

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

والدین تمہاری جنت اور جہنم ہیں

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے حضور ﷺ سے دریافت کیا ''والدین کا حق ان کی اولاد پر کیا ہے''۔

آپ ﷺ نے فرمایا ''وہ تمہاری جنت اور جہنم ہیں''۔

یعنی والدین کے حقوق ادا کرو گے ان کی خدمت کرو گے تو جنت کے مستحق ہو گے اور اگر ان کا حق نہ پہچانو گے تو جہنم میں جاؤ گے۔

ایک دوسری حدیث اور قرآن مجید میں ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ ماں کا درجہ باپ کے مقابلے میں بڑھا ہوا ہے۔ قرآن مجید میں ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی تاکید کے معا بعد ان مصیبتوں اور زحمتوں کا ذکر ہوا ہے جو ماؤں کو حمل کے زمانے میں، دودھ پلانے اور پالنے کے زمانے میں برداشت کرنا پڑتی ہیں۔

(بحوالہ: مختصر صحیح بخاری)

اس شمارے میں

2	القرآن	ضیاء القرآن	قرآن ایک مکمل ضابطہ حیات ہے!
3	الحدیث	ادارہ	والدین تمہاری جنت اور جہنم ہیں!
14	دستک	امجد رؤف خان	دشنام طرازی کا بڑھتا رجحان
61	کاش یہ ممکن ہوتا	آسناتھ کنول	ایک لڑکی کی کہانی، وہ لاچاری ختم کر کے اپنے پیروں پر کھڑی ہونا چاہتی تھی!
65	میرا کشمیر...... میرا عشق	فرخ صابری	"سیارہ ڈائجسٹ" کے قارئین کے لیے "جنت" سے لایا ہوا اک توشۂ خاص! (ادارہ)
79	نور	عطیہ زاہرہ	ایک قوم کی کتھا، جس نے اپنے نور کو بجھا کر اندھیروں کو مقدر کر لیا تھا!



17 ہم اور ہمارے سیاسی رہنما

اڑتے اڑتے ہو گئی گم
ایک کی چونچ اور ایک کی دم

سیارہ رپورٹ

مجید نظامی ...... وہ عہد حاضر میں حق کا استعارہ تھے!

(سعد اللہ شاد) 26



84 خواجہ معین الدین چشتی اجمیری — پروفیسر غلام رسول
سلطان الہند خواجہ معین الدین اجمیری جو برصغیر کے عوام کے دلوں پر خواجہ غریب نواز کے نام سے حکمرانی کرتے ہیں!

93 ”عدالت“ — محمد سلیم اختر
ایک قاتل کے تعاقب اور انجام کی کہانی، پشتو ادب سے انتخاب!

129 وفاؤں کی قاتل — انیس طاہرہ
ایک عورت کی کہانی، وہ اپنے شوہر سے انتقام لینا چاہتی تھی!

139 کسی کی ڈفلی پر میرا راگ — نوشابہ اختر
معاشرے کی جھلک دکھاتے حقیقی واقعات جن میں عقل والوں کے لیے عبرت کا سامان ہے!

147 نیم شب......! — انیس امتیاز احمد
ایک فوٹوگرافر کی کہانی جو رات کے اندھیرے میں قتل کے مناظر کھینچتا تھا......!

خواتین کارنر
58 ☆ ”چھت کا سایہ...... موت لایا“
تحریر: عارف محمود ابل

168 ☆ سیارہ کچن کارنر

ماہِ ستمبر

135 حب الوطنی ایک جنون......!!
محسن علی



ایک فوجی کی کہانی، جو جذبہ حب الوطنی سے آشنا نہ تھا

193 شہر لاہور پر — ایم اسلم
ستمبر 65 کی جنگ میں لاہوریوں کی ہمت و حوصلہ کا آنکھوں دیکھا حال



198 خواب — حنا اصغر

203 گمانِ وفا — شوکت افضل
ایک شخص کی دلگداز کہانی جس نے جنت نظیر زندگی کا خواب دیکھا تھا!

155 قانونی جرم — یوسف جمال — ایک وکیل کی زندگی کا انقلابی واقعہ، اس نے کیسا پانی کا راز بیان کیا تھا!

161 قصہ ایک شام کا — جاوید بسام — شرلک ہومز کا دلچسپ واقعہ، اسے اپنی قیافہ شناسی کو جانچنے کا موقع ہاتھ آ گیا تھا!

172 بزم شاعری — ادارہ — باذوق قارئین کے کلام و انتخاب پر مبنی مقبول ترین سلسلہ!

178 شہنائی کے آنسو — ابوضیا اقبال — روایتی دلہن کے لیے ایک ایک انچ بڑھنے کا اس نے ارادہ کر دیکھا، وہ تو خون میں لت پت ہو گئی تھی!

187 اسماء الحسنیٰ کامیابی کا راستہ — پیر شاہ محمد قادری — اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں سے آپ کے مسائل کا حل!

38 برسات میں پھلوں سے غذائیت اور شفا حاصل کیجیے!



126 ہائی بلڈ پریشر سے بچاؤ کی تدابیر — حکیم راحت نسیم سوہدروی — ایک خطرناک مرض کے حوالے سے رہنما تحریر، جو انسان کا خاموش دشمن کہلاتا ہے!



حقیقت کہانی



43 بچھو والا — جاوید راہی — جانوروں سے سوداگری کی کہانی، وہ ایک ایسے جال میں پھنس گیا تھا

97 "اور وہ بدل گئی......!" — نواز خان — "وہ حوا کی بیٹی مرد کو حیران کرنا چاہتی تھی اور اس کے لیے کچھ بھی کر گزرتی تھی"

جلد 51 - شمارہ 9 - ستمبر 2014

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

www.facebook.com/sayaradigest
Email:editorsayyara@yahoo.com
sayyaradigest@gmail.com
editorsayyara@hotmail.com
Phone:92-042-37245412
Mobile:0300-9430206

مستقل اہمیت کی حامل معیاری اور شگفتہ تحریریں

ماہنامہ سیّارہ ڈائجسٹ لاہور

مدیر اعلیٰ
امجد رؤف خان

مدیر منتظم
کامران امجد خان

مدیر : محمد ثاقب

معاون مدیران : جویریہ کامران ۔ روفی خان ۔ فرحان امجد

سرکولیشن منیجر : بشیر احمد

مارکیٹنگ منیجر : خرم امجد خان ۔ 0333-4207684

نگران پرنٹنگ : خالد محمود ۔

طابع : اللہ والا پرنٹرز شاہراہ قائداعظم لاہور

شعبہ اشتہارات :
لاہور — خرم امجد خان ۔ 0333-4207684
طارق محمود ۔ 0300-4144781
کراچی — محمد عابد مرزا ۔ 0321-3758492

مجلس مشاورت
صغیرہ بانو شیریں رفیق غوری
ریاض آفندی فیاض عمر عارف محمود ایل

قیمت 80 روپے

امجد رؤف خان پبلشرز نے اللہ والا پرنٹرز سے چھپوا کر 240 مین مارکیٹ ریواز گارڈن لاہور سے شائع کیا۔

لاثانی®

نام بھی لاثانی معیار بھی لاثانی

www.lasaniindustries.com

عرق مہزل™

وزن گھٹائیں صحت پائیں



موٹاپے کو تمام ایک امراض کی جڑ تصور کیا جاتا ہے لیکن جدید تحقیق نے یہ ثابت کیا ہے کہ صحت اور موٹاپا دو الگ چیزیں ہیں موٹاپا صرف بیماری ہے بلکہ بہت سی دیگر بیماریوں کی جڑ ہے۔ لاثانی عرق مہزل ہر قسم کے موٹاپے کے لیے مفید ہے اس کو لاثانی فارما کی ریسرچ لیبارٹری کے تجربہ کار سٹاف نے جدید ریسرچ اور کامیاب تحقیقی مراحل کے بعد پورے اعتماد سے پیش کیا ہے مارکیٹ میں موجود دوسری ادویات سے ممتاز لاثانی عرق مہزل ہر قسم کے مضر اثرات سے پاک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملک بھر کے معالجین کی کثیر تعداد عرق مہزل پر بھرپور اعتماد کرتی ہے۔ اس کے اجزا صدیوں سے مستعمل ہیں لیکن ان کو بہترین طریقے اور تناسب سے موٹاپے کے علاج کے لیے پیش کرنے کا سہرا لاثانی کی ریسرچ اینڈ ڈویلپمنٹ ٹیم کے سر ہے۔ لاثانی عرق مہزل کے استعمال سے موٹاپا ختم اور بہترین صحت حاصل ہوتی ہے۔ مریض کسی قسم کی کمزوری محسوس نہیں کرتا کیونکہ لاثانی عرق مہزل غذا جذب کرتا ہے اور بے وقت کی بھوک ختم کرتا ہے بالکل قدرتی طریقے سے جسم کی ساخت میں غیر ضروری تبدیلی (موٹاپا) کو ختم کرتا ہے۔ مطلوبہ وزن کم کرنے کے بعد بھی اس کا استعمال وزن کو دوبارہ بڑھنے سے روکتا ہے اور آپ کو چاک و چوبند رکھتا ہے۔ لاثانی عرق مہزل کے استعمال کے ساتھ چکنائی سے پرہیز اور ورزش اس کے اثرات کو دوچند کر دیتے ہیں۔ جسمانی طور پر موٹاپے کی طرف مائل لوگ لاثانی عرق مہزل کے استعمال سے موٹاپے سے بچ سکتے ہیں۔

ترکیب استعمال:

بالغان 30 ملی لیٹر (⅛ کپ) سے 20 ملی لیٹر (⅛ کپ) تین مرتبہ روزانہ

8 سال سے 13 سال تک

15 ملی لیٹر (1/8) کپ سے 30 ملی لیٹر (⅛ کپ) 3 مرتبہ روزانہ

خوراک 20 ملی لیٹر (2 کھانے کے چمچ) رات کو سوتے وقت

ہر قسم کے موٹاپے کی وجوہات کو کم کرنے کیلئے مؤثر دوا

لاثانی فارما پرائیویٹ لمیٹڈ

فون: 042-36581200
042-36581300
فیکس: 042-36581400

اظہار خیال

جادو ٹونے کا خطرہ

محترم جناب ایڈیٹر صاحب! سدا خوش رہیں! السلام علیکم! اگست کا سیارہ خوبصورت اور دلکش سرورق کے ساتھ ملا۔ "اللہ تعالیٰ کی قدرت کا نظارہ کیجیے" واقعی غور کرنا چاہیے۔ ایمان مضبوط ہوتا ہے دنیا کی حرص کم ہوتی ہے۔ مشتاق احمد یوسفی کی تحریر 'واقعی لازوال ہے' تم میری ہو' پڑھ کر احساس ہوا کہ صغیرہ بانو شیریں اچھی رائٹر بھی ہیں، ہم صرف گھریلو ٹوٹکوں اور مفید باتوں کے حوالے سے انہیں جانتے تھے۔ 14 اگست کے حوالے سے الیس اقتباز کی تحریر 'دو بام سنگھ' زبردست رہی۔ جاوید احمد صدیقی کی 'تربیت کا اثر' بھی بہترین تحریر تھی۔ 'کالا جادو' حافظ سعید کی خطرناک تحریر تھی۔ خطرناک اس حوالے سے کہ جادو کے بارے میں سننا پڑھنا سب خطرے سے خالی نہیں ہوتا ڈر خوف پریشانی کا خطرہ لگا رہتا ہے۔ حال ہی میں میرے ایک عزیز اس طرح فوت ہو گئے ہیں تعویزوں کی معیاد ختم ہو چکی تھی اور وہ سوکھ سوکھ کر کانٹا بن چکے تھے اور آخرکار اسی حالت میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ مرحوم کی عمر صرف 37 سال تھی۔ ان کی تمام ڈاکٹری رپورٹ کلیئر تھیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت دے جو اس طرح کے جادو ٹونے کرتے ہیں کہ انسان زندگی سے ہی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ 'گمان وفا' شوکت افضل کی یادگار تحریر رہی، واقعی کہانی دلگداز ہے۔ نواز خان کی تحریر کا تو انتظار رہتا ہے 'اظہار خیال' سے معلوم ہوا وہ شہرت نہیں چاہتے تصویر بھی شائع نہیں کروانا چاہتے اور انٹرویو بھی نہیں دینا چاہتے...... کیا بات ہے؟ اللہ تعالیٰ انہیں خوش رکھے سلامت رکھے۔ ویسے دنیا تو شہرت کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہے، جبکہ واز خان ان سب باتوں سے بے نیاز ہیں۔ ایسے ہیرے قابل ستائش ہیں۔ والسلام

(یاسمین کنول/پسرور)

مشتاق احمد یوسفی کی لازوال تحریریں

محترم مدیر اعلیٰ امجد رؤف خان صاحب! السلام علیکم! سیارہ ڈائجسٹ اگست 2014ء کا ٹائٹل نظارہ کیجیے اللہ کی قدرت کا خوب سے خوب تر ہے۔ یقین کیجیے دل بہت خوش ہوا۔ اس کے بعد "مشتاق احمد یوسفی" کی لازوال تحریروں سے انتخاب سونے پر سہاگہ ہے۔ بہت بلند پائے کے رائٹر ہیں قاری کی نبض پر ہاتھ خوب رکھتے ہیں۔ پروفیسر غلام رسول نے بزرگان دین کے حالات زندگی کو جس خوبصورت اور اثر انگیز انداز سے تحریر کیا ہے۔ انہوں نے سیارہ ڈائجسٹ کو بلند مقام تک پہنچا دیا ہے۔ انتظار رہتا ہے۔ آخر میں گزارش کرنا چاہوں گا کہ کشف کے موضوع پر ایک سچی کہانی "اللہ کے راز" اشاعت کے لیے بذریعہ کوریئر سروس بھجوائی ہے۔ براہ مہربانی نوک پلک سنوار کر سیارہ ڈائجسٹ کی قریبی اشاعت میں شامل کر کے شکریہ کا موقع دیں۔ والسلام

(غلام نبی عارف)

نواز خان

محترم جناب امجد رؤف خان! السلام علیکم! سیارہ ڈائجسٹ کا ہر قاری نواز خان صاحب سے ملنا، اُن کو دیکھنا اور اُن سے باتیں کرنا چاہتا ہے۔ لیکن آپ نے اُسے نئی نویلی دلہن کی طرح ہزاروں پردوں کے پیچھے چھپا کر رکھا ہے۔ ایسا کر کے آپ سیارہ ڈائجسٹ کے قارئین کے ساتھ بہت زیادتی کر رہے ہیں۔ آپ

مہربانی کر کے کبھی کبھی اُن کی فوٹو کے ساتھ اُن کا مختصر سا انٹرویو شائع کرتے رہیں۔ اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو بہت جلد قارئین سیارہ ڈائجسٹ کے ذہنوں میں نواز خان صاحب ایک حقیقی شخصیت کی بجائے ایک افسانوی شخصیت بن جائیں گے۔

(محمد کمال/مردان)

انگوٹھی میں نگینے

مکرمی جناب امجد رؤف خان السلام علیکم! آپ کی خیریت اور عافیت کے لیے نیک تمناؤں کے ساتھ دعا گو ہوں۔ چند دن ہوئے شہر ضروری کام کے سلسلے میں جانا ہوا، وہاں بک سٹال پر تازہ پرچہ دیکھ کر میرا دل خوشی سے باغ باغ ہوگیا۔ ایسا کامیاب ڈائجسٹ نکالنے پر میری جانب سے دلی مبارک باد قبول کریں۔ اس مہنگائی کے دور میں ایسا خوبصورت اور معیاری تحریروں سے مزین جس کا اپنا ایک منفرد معیار ہے اس کے تمام سلسلے اپنی اپنی جگہ پر انگوٹھی میں نگینے کی طرح فٹ ہیں۔ ہر ماہ کے آخر پر ہمیں پرچے کا بڑی بے تابی سے انتظار رہتا ہے۔ کافی عرصے کے بعد آپ کو خط تحریر کر رہا ہوں۔ معذرت خواہ ہوں۔ میں اس کا ایک پرانا قاری ہوں۔ اس بار بزم شاعری میں غزلیں اچھی تھیں دیگر تمام تحریریں بھی بہت اچھی تھیں۔ آپ نے کافی عرصے سے ہمیں نہیں کیا۔ ہم نے بھی ہمت کر کے آپ کو یاد کیا چند غزلیں ارسال کر رہا ہوں کسی قریبی شمارے میں جگہ دے دیں۔ امید ہے کہ آپ پہلے کی طرح میری حوصلہ افزائی کریں گے۔ بشرطیکہ آپ کا ہمارے ساتھ تعاون ہو خط سے آدھی ملاقات ہو جاتی ہے۔ خدا آپ کی عمر دراز کرے اور صحت دے تحریر میں کوئی خامی ہو تو معذرت خواہ ہوں آپ کی زندگی میں سدا رنگ برنگے پھول سجتے رہیں۔ خدا آپ کو اپنی اماں میں رکھے۔ اس دفعہ آپ ہمارا خیال کرتے ہوئے پرچے میں غزل لگا دیں اس کے ساتھ ہی اجازت چاہتا ہوں زندگی نے وفا کی تو پھر ملاقات ہوگی۔ والسلام

(محمد اسلم جاوید)

سیاسی رہنماؤں کیلئے دُعا

جناب محترم مدیر صاحب! السلام علیکم! امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا! ماہ رواں کا "سیارہ ڈائجسٹ" ہمارے سامنے ہے۔ اس بار خاص طور پر ٹائٹل بہت خوبصورت ہے۔ ٹائٹل کے ساتھ تمام سلسلے بھی خوب رہے، مضامین اور غزلوں کا انتخاب لاجواب رہا۔ ہماری تحریروں کو جگہ دینے کا شکریہ مزید مواد ارسال خدمت ہیں۔ پلیز قریبی اشاعت میں جگہ دیں۔ آپ کو اور دیگر سٹاف اور "سیارہ ڈائجسٹ" کے تمام خوبصورت لکھنے والے رائٹرز اور تمام خوبصورت پڑھنے والے قارئین کو دعا سلام۔

اللہ تعالیٰ ہمارے ملک کے حالات بہتر کرے اور سیاسی رہنماؤں کو ملک کے لیے ملکر کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

(ایس۔ امتیاز احمد/کراچی)

فرد کی ذمہ داری

محترمی و مکرمی مدیر صاحب! السلام علیکم! اگست کا شمارہ رنگا رنگ کی تحریریں لیکر آوارد ہوا۔ ہر شمارہ پچھلے سے بہتر ہوتا جارہا ہے۔ یہ آپ تمام لوگوں کی انتھک محنت اور مواد کا چناؤ انتہائی عرق ریزی سے کرنے کا ثبوت ہے۔ ممتاز مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی کی تحریروں کا انتخاب انتہائی خوبصورتی سے کیا گیا تھا۔ مزہ آگیا۔ تفرقہ بازی کے حوالے سے قلندر صاحب نے مولانا حضرات کا شکوہ کیا ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ علماء کرام تو آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ اصل میں تو ہم عوام میں سے ہر ایک تو سدھرنا ہوگا۔

کیونکہ حب القوم ہر بندہ دل میں بغض، حسد، جلاپا، تکبر اور پھلتے پھولتے لوگوں کو دیکھ کر جل جانے کا زخم لیے ہوئے ہے۔ نچلی سطح پر ہر طبقے کی اصلاح چاہیے اور اس کے لیے جب تک ہر شخص ہر فرد تعلیم کی طرف نہ آئے گا ذہنی شعور کیسے حاصل ہوگا۔ تعلیم ہی سے اچھے برے کی تمیز ہوتی ہے۔ جب پوری قوم اچھے کی طرف جائے گی تو ہر کوئی اچھائی ہی کا سوچے گا۔ اللہ تعالیٰ ایسا ہی کردے (آمین)

دستک میں امجد رؤف صاحب نے نہایت تمیز اور اصلاح طلب فیشن کا ذکر کیا ہے۔ یہ شوخ بازی یہ لاابالی پن اور قانون توڑ کے تکبر کرنے والے جب تک سختی سے ٹھیک نہ کیے جائیں گے پوری قوم کبھی بھی نہ ٹھیک ہوگی۔ تعلیم کا حصول اور پھر بغیر لالچ کے قانون پر سخت ترین عمل درآمد کروانے کا وقت نہ آئے گا تو یہ کیسے سب ٹھیک ہوگا۔ آپ کی دردمندانہ تحریر کاش کام کر جائے اور معاشرہ بھی ایک بہتر سمت کی طرف رواں دواں ہو۔ تحریریں تو ایک سے بڑھ کر ایک ہیں مگر شوکت افضل، الیس امیاز، مدیحہ اصغر اور عارف محمود اُبلی کی تحریروں کو خراج تحسین پیش نہ کرنا زیادتی ہوگی۔ ایک عدد کہانی ارسال ہے معیاری ہو تو ضرور جگہ دیجیے گا۔ تمام احباب مجلس کو بے حد ادب اور دعائیں۔ مخلص

(جاوید احمد صدیقی)

جوانوں سے بہتر

جناب محترم امجد رؤف خان صاحب! السلام علیکم ورحمتہ اللہ! سیارہ ڈائجسٹ میرے والد (مرحوم) سید انوار حسین حمیدی صاحب انتہائی شوق سے پڑھتے تھے اور اس میں لکھا بھی کرتے تھے۔ میں نے بچوں کے ادب پر پی ایچ ڈی کیا اور عرصہ سے ایک سرکاری کالج میں پڑھا رہا ہوں، کراچی میں مقیم ہوں۔ ہر ماہ سیارہ ڈائجسٹ انتہائی رغبت اور شوق سے پڑھتا ہوں۔

اگر آپ اجازت عنایت فرمائیں تو بچوں کی کچھ اپنی کہانیاں یا بڑوں کے افسانے کہانیاں انشائیے روانہ کروں؟؟ الحمد للہ خود ہی مکمل کمپوزنگ کر لیتا ہوں، عمر عزیز ۵۳ سال سے اوپر ہے، ایسوسی ایٹ پروفیسر ہوں مگر اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ جوانوں سے بہتر ہوں۔ لکھنے لکھانے کا شوق چالیس سال سے زیادہ عرصہ سے جاری و ساری ہے، کالج کی لائبریری میں بھی سیارہ اور دیگر ڈائجسٹ منگواتا ہوں اور نسلِ نو کو پڑھنے پر مجبور کرتا ہوں۔ اگست کے شمارے میں جناب مشتاق احمد یوسفی، محترمہ صغیرہ بانو شیریں اور دیگر کی بہترین تحریروں نے متاثر کیا۔

اللہ تعالیٰ آپ سب کو ایمان و ایقان کی بہترین حالتوں میں رکھے، آمین مخلص۔

(پروفیسر ڈاکٹر مجیب ظفر انوار حمیدی/کراچی)

معلوماتی سلسلے

محترم مدیر سیارہ ڈائجسٹ! السلام علیکم! سیارہ ڈائجسٹ سے میرا تعلق بہت پرانا ہے۔ شاید بیس سال سے زیادہ عرصہ سے یہ میرے زیر مطالعہ ہے۔ میں نے اس کے مختلف دور دیکھے ہیں اور اس بات کا گواہ ہوں کہ سیارہ ڈائجسٹ نے کبھی اپنی اقدار اور اصولوں کی خلاف ورزی نہیں کی۔ دستک اور کورسٹوری کے صفحات میں سیاسی موضوعات پر بھی ہمیشہ وطن اور قوم کے مفاد کو سامنے رکھ کر ہی قارئین کی رہنمائی کی گئی۔ نہ کہ کسی خاص سیاسی جماعت کی طرف جھکاؤ رکھا گیا۔ کہانیاں اور مضامین بھی بہت شاندار رہے ہیں۔ مگر کچھ عرصہ سے میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ سیارہ ڈائجسٹ میں معلوماتی سلسلے کچھ کم ہو گئے ہیں۔ زیادہ عرصہ کی بات نہیں جب اس

ماہ کے واقعات اور تسنیم انور صاحب کے ترتیب شدہ الفاظ اور اُن کا مفہوم جیسے مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔ اسی طرح ماضی میں بھی "سچ تو یہ ہے" اور "سوال جواب" جیسے سلسلے شائع ہوتے رہے ہیں۔ آپ سے درخواست ہے کہ ایسے سلسلے پھر شروع کیجیے تاکہ ہم جیسے پرانے قارئین کے ذوق کا سامان بھی ہوتا رہے۔ ویسے آپ جو آج کل کی نئی تحقیقات اور جدید معلومات کے حوالے سے مضامین شائع کررہے ہیں وہ بھی بہت اچھے ہیں۔ نیز میں خاص طور پر ذکر کرنا چاہوں گا کہ سیارہ ڈائجسٹ نے ان دنوں کونٹنٹ میں جو معلوماتی اور دلچسپ چیزیں دینا شروع کی ہیں وہ بھی بہت کارآمد ہیں۔

(نعیم اللہ خان/پشاور)

☆نعیم صاحب! آپ کی تجاویز کا بہت شکریہ، ہم ان پر جلد از جلد عمل کرنے کی کوشش کریں گے۔

خصوصی نمبر اور اشتہار

جناب امجد رؤف خان صاحب! السلام علیکم!
سیارہ ڈائجسٹ جو خصوصی نمبر شائع کرتا ہے اُن کی مقبولیت اور اہمیت کے بارے میں سب کو معلوم ہے۔ اس بار رمضان المبارک میں آپ نے صدقات اور خیرات نمبر شائع کرکے دین کے حوالے سے ایک اور عظیم الشان کاوش کی ہے جس کا یقیناً آپ کو اللہ تعالیٰ کے ہاں اجر عظیم ملے گا۔ تاہم اس نمبر کا مطالعہ کرتے چند باتیں مجھے گراں گزریں۔ جن کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ اس نمبر میں بعض صفحات پر احادیث مبارکہ کا حوالہ دیا گیا ہے اور ان کے بالکل سامنے اشتہارات شائع کیے گئے ہیں جن میں انسانی تصاویر شامل ہیں۔ میرے خیال سے یہ مناسب نہیں ہے۔ آپ کم از کم خصوصی اسلامی نمبرز میں یہ اشتہار نہ دیا کریں۔ ان نمبرز میں بعض جگہ قرآنی آیات بھی ہوتی ہیں۔ اس لیے اشتہارات شامل نہ ہوں تو بہتر ہے۔ صدقات و خیرات نمبر انتہائی اہم اور قابل قدر کاوش ہے۔ مجھے یہ خصوصی نمبر پڑھ کر پہلی بار صدقات کی اہمیت کا صحیح طور پر اندازہ ہوا کہ یہ کیسے آنے والی مشکلات اور مصائب کو ٹال دیتے ہیں اور یہ بھی معلوم ہوا کہ صحابہ کرامؓ اور اولیاء اللہ نے ہمیشہ صدقہ و خیرات کی سنت پر عمل کیا اور اپنے مال کو پاکیزہ اور بابرکت بنایا۔

(ریاض ملک/لاہور)

☆ریاض ملک صاحب! ہماری ہمیشہ کوشش رہی ہے کہ اشتہارات جو کسی بھی اشاعتی ادارے کی بقا کے لیے ناگزیر ہیں ان کی اشاعت میں احتیاط سے کام لیں۔ تاہم انہیں مکمل طور پر بند کرنا ممکن نہیں ہے۔

انتظار کی کیفیت

مکرمی امجد رؤف خان صاحب! السلام علیکم!
سیارہ ڈائجسٹ اگست 2014ء کے شمارے میں شوکت افضل صاحبہ کی کہانی گمان رفا پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ مگر جب کہانی کا اصل مزہ آنا شروع ہوا تو معلوم ہوا کہ یہ تو قسط وار کہانی ہے، یعنی اب اس کی اگلی قسط کے لیے آئندہ ماہ تک کے لیے انتظار کرنا پڑے گا۔ ایک عجیب انتظار کی کیفیت میں آپ نے مبتلا کردیا ہے۔ بہرحال شوکت افضل صاحبہ تک ہمارے جذبات پہنچا دیجیے کہ ان کی یہ کہانی بھی سابقہ کہانیوں کی طرح بے حد اثر انگیز ہے اور قاری کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ پچھلے کچھ شماروں سے قارئین پروف کی غلطیوں کی نشاندہی کررہے تھے مگر اس بار غلطیاں نہ ہونے کے برابر ہیں جس پر آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

(شازیہ عابد/لاہور)

دستک

Editorsayyara@yahoo.com

دشنام طرازی کا بڑھتا رجحان

"وہ سب سے بڑا چور ہے......" "یہ سب لٹیرے ہیں، چور ہیں ڈاکو ہیں!" "یہ کرپشن کا بے تاج بادشاہ ہے" "وہ غیر ملکی ایجنٹ ہے" "فلاں پلے بوائے ہے......" یہ سب اور اسی طرح کے دیگر الزامات و دشنام اب ہمارے ہاں عام معمول بنتے جارہے ہیں۔ خاص طور پر سیاسی رہنماؤں میں یہ رجحان تیزی سے فروغ پارہا ہے اور وہ اپنے مخالفین کو بلا کسی خوف اور حدود و قیود کا خیال کیے ایسے ایسے "خطابات" سے نوازتے ہیں کہ مہذب معاشرے میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ سیاست کا میدان کارزار ایسا ہے کہ اس میں دو فریق ایک دوسرے کو نیچا دکھانے اور خود کو برتر و بہتر ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، مگر اس کوشش میں بھی چند اصولوں کا خیال رکھنا ضروری ہے، نہ کہ اقتدار کی ہوس میں سب کچھ بھول کر ہر حد پار کرلی جائے۔ پھر سیاست تو ایسی چیز ہے کہ اس میں ہم نے ماضی میں ایک دوسرے کو گالیاں دینے والوں کو تھوڑے ہی عرصے بعد ایک دوسرے کا قریبی ساتھی بنتے دیکھا ہے۔ اس کی حالیہ مثالیں دیکھنی ہوں تو پیپلز پارٹی کے پچھلے دور میں میاں نواز شریف اور آصف علی زرداری کا اتحاد دیکھ لیجیے۔ ماضی میں میاں نواز شریف اور شہباز شریف، آصف زرداری کو "مسٹر ٹین پرسنٹ" اور "کرپشن کا بادشاہ" کہہ کر بلاتے رہے۔ اسی طرح آصف زرداری بھی میاں برادران کو "آمریت کی پیداوار" اور "خاندانی سیاست کے چیمپئن" کہا کرتے تھے۔ مگر پھر "جمہوریت کی خاطر" دونوں جماعتیں ایک دوسرے کے قریب آگئیں تو اختلافات کے باوجود آصف زرداری میاں نواز شریف کو "بڑے بھائی" کہہ کر بلانے لگے اور نواز شریف بھی انھیں احترام دینے پر مجبور ہوئے۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر یہ دونوں رہنما سیاسی مخالفت میں اس قدر نہ چلے جاتے کہ جہاں الفاظ ہمیشہ کے لیے نشتر بن کر یاد آتے اور تکلیف دیتے رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کی عزت اُچھالتے ہوئے تمام حدود پار کرجانا کہاں کی دانشمندی ہے؟۔

اسی حوالے سے ایک دوسری مثال پیپلز پارٹی کے قائدین اور مسلم لیگ ق کے رہنماؤں کی ہے۔ محترمہ بینظیر بھٹو کی شہادت کے بعد آصف زرداری نے بینظیر بھٹو کے آخری خط کی روشنی میں جن افراد پر قتل کے

شبے کا اظہار کیا، اُن میں چودھری پرویز الٰہی بھی شامل تھے۔ کیونکہ مسلم لیگ ق سابق صدر جنرل (ر) پرویز مشرف کی اتحادی جماعت تھی۔ چنانچہ آصف زرداری اور پیپلز پارٹی نے مسلم لیگ ق کو ''قاتل لیگ'' کہا اور انتہائی سخت الفاظ استعمال کیے۔ یہی حال چودھری پرویز الٰہی اور چودھری شجاعت کا تھا جو آصف زرداری کو سرے محل کی کرپشن اور دیگر حوالوں سے لوٹ مار کے طعنے دیا کرتے تھے۔ مگر بعدازاں جب مسلم لیگ ن کے خلاف سیاسی قوت کی ضرورت پڑی تو یہ دونوں جماعتیں ایک دوسرے کے قریب آگئیں اور فطری اتحاد نہ ہونے کے باوجود آصف زرداری نے پرویز الٰہی کو ڈپٹی وزیراعظم کا عہدہ دیدیا۔

حالیہ انتخابات سے قبل مسلم لیگ ن کے قائدین آصف زرداری اور ان کی جماعت کے دیگر رہنماؤں کو ''علی بابا اور چالیس چور'' قرار دیتے رہے، یہی نہیں اُنھوں نے پیپلز پارٹی کے رہنماؤں پر ملک سے غداری اور وطن دشمنی کے سنگین الزامات لگا کر اُنھیں سڑکوں پر گھسیٹنے کا اعلان بھی کیا۔ مگر اقتدار میں آ کر عمران خان اور دیگر سیاسی مخالفین کے خلاف اپنی قوت برقرار رکھنے کے لیے میاں نواز شریف نے پیپلز پارٹی سے غیر علانیہ اتحاد برقرار رکھا اور ہر مشکل گھڑی میں آصف زرداری سے مشورہ کرتے رہے۔ بلکہ ایک موقع پر اُنھوں نے پیپلز پارٹی کو وزارتوں کی پیشکش کر کے حکومت میں شمولیت کی دعوت بھی دی تھی۔

عمران خان کی جماعت تحریک انصاف اور پاکستان مسلم لیگ ن اس وقت دو بڑے سیاسی حریف سمجھے جاتے ہیں۔ مگر بدقسمتی سے ان دونوں جماعتوں کے قائدین نے ماضی سے سبق سیکھنے کی بجائے وہی رویہ اپنایا ہے جو ان سے پہلے سیاسی مخالفین ایک دوسرے کے حوالے سے اپناتے رہے ہیں۔ یعنی ایک دوسرے کو غیر مہذب القابات سے نوازا جا رہا ہے اور اس مخالفت میں آئے روز شدت بڑھتی جا رہی ہے۔ مسلم لیگ ن کے رہنما تحریک انصاف کو ''ممی ڈیڈی پارٹی'' اور ''برگر پارٹی'' کا نام دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ ن لیگ کے رہنما عمران خان کو ''سیاسی طور پر نابالغ'' اور ''کھلاڑی'' کے نام سے پکارتے ہیں۔ خود میاں شہباز شریف بھی عمران خان کو غیر ملکی ایجنٹ اور جمہوریت کا دشمن قرار دے چکے ہیں۔ دوسری طرف تحریک انصاف کے قائد عمران خان نے بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ وہ اپنی تقریروں میں مسلم لیگ ن کو ''پٹواریوں کی جماعت'' اور میاں برادران کو ''مغل بادشاہ'' کہہ کر پکارتے ہیں۔ اس کے علاوہ مسلم لیگ ن کو ''کرپشن کے آرٹ کی ماہر جماعت'' کا نام بھی دے رکھا ہے۔ عمران خان وزیراعظم میاں نواز شریف پر ''امپائروں'' کو ساتھ ملا کر کھیلنے والا کھلاڑی بھی کہتے ہیں۔ اگر ان دونوں جماعتوں کے ماضی پر نظر ڈالی جائے تو عمران خان اور نواز شریف ایک دوسرے کے قریب اور آپس میں اتحادی بھی رہے ہیں۔ مگر اب سیاسی مخالفین بن کر دونوں جماعتوں کے رہنما جلسے جلوسوں اور تقاریر میں ایک دوسرے کے لیے انتہائی غیر شائستہ زبان استعمال کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔

یہی حال دیگر جماعتوں اور سیاسی قائدین کا بھی ہے۔ مولانا فضل الرحمان اور عمران خان کے درمیان بھی طنزیہ جملوں اور الزامات کی جنگ چلتی رہتی ہے اور دونوں رہنما ایک دوسرے کی ذات پر کیچڑ اُچھالتے

ہوئے کسی اصول کو خاطر میں نہیں لاتے۔ سابق وزیراعلیٰ پنجاب چودھری پرویز الٰہی اور مسلم لیگ کے رہنماؤں کے درمیان بھی ایک دوسرے پر الزامات کا مقابلہ ہوتا رہتا ہے۔ کچھ عرصہ قبل عمران خان اور ایم کیو ایم کے قائد الطاف حسین کے درمیان بھی خاصی سیاسی کشیدگی پیدا ہوگئی تھی۔ اُس وقت دونوں جماعتوں کے قائدین نے ایک دوسرے کی ذات پر دل بھر کر کیچڑ اُچھالا تھا۔

پاکستان پیپلز پارٹی کے صوبہ سندھ کے رہنماؤں اور ایم کیو ایم کے قائدین کے درمیان بھی سیاسی مخالفت میں اسی طرح کا رویہ دیکھنے میں آتا ہے۔ سندھ اور کراچی پر اپنا اثر ورسوخ قائم کرنے کے لیے یہ دونوں جماعتیں ایک دوسرے پر دہشت گردی، ناجائز اسلحہ رکھنے اور مسلح گروپ بنانے کے الزامات عائد کرتی ہیں اور سابق صوبائی وزیر ذوالفقار مرزا نے ایم کیو ایم کے رہنماؤں کے بارے میں جو زبان استعمال کی اُسے کون بھول سکتا ہے۔ دوسری طرف ایم کیو ایم کے رہنما بھی پیپلز پارٹی کے رہنماؤں پر مختلف طرح کے الزامات عائد کرتے اور اُنھیں دشنام دیتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود ان دونوں جماعتوں کے درمیان شراکت اقتدار بھی جاری رہتی ہے۔

سیاسی رہنماؤں کے اس رویئے اور اُن کی طرف سے اپنے مخالفین کو غیر مہذب ''نام'' دینے کا رُجحان ان کی جماعتوں کے کارکنوں میں بھی منتقل ہو رہا ہے اور اب سیاسی مخالفین کے درمیان ایک دوسرے کے خلاف نفرت اور عدم برداشت بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اس کا سب سے زیادہ اظہار سوشل ویب سائٹس پر دیکھنے میں آ رہا ہے۔ مسلم لیگ ن اور تحریک انصاف دونوں جماعتوں کے کارکنوں یا ان سے ہمدردی رکھنے والوں کی بڑی تعداد فیس بک اور ٹوئٹر استعمال کرتی ہے۔ مگر ان دونوں جماعتوں کے حامی ایک دوسرے کے خلاف ایسی واہیات اور غیر مہذب زبان استعمال کرتے ہیں کہ جسے پڑھ کر سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ یہی نہیں اپنے مخالف سیاسی رہنماؤں کے خلاف جذبات کا اظہار کرنے کے لیے انتہائی بے ہودہ تصاویر اپ لوڈ کی جاتی ہیں۔ بعض لوگوں کا تو کام ہی شاید یہ رہ گیا ہے کہ وہ مخالف سیاسی رہنماؤں کی جھوٹی اور جعلی تصاویر تیار کرتے ہیں اور بلا کسی خوف کے اُنھیں اپ لوڈ کرتے اور پھیلاتے رہتے ہیں۔ بے شمار لوگ ان تصاویر کو سچ سمجھ لیتے ہیں۔ یہ ایک انتہائی خطرناک اور قابل تشویش رجحان ہے۔ جو دراصل قوم کو انتشار اور انارکی کی طرف لے جا رہا ہے۔

سیاسی رہنماؤں اور قومی دانشور و مفکرین کو اس بارے میں فوری طور پر سوچنا اور ایک ضابطۂ اخلاق تیار کرنا چاہیے۔ جس پر تمام سیاسی جماعتوں اور ان کے حامیوں کو عمل کرنے کا پابند بنایا جائے۔ سوشل میڈیا کو بھی اس ضابطۂ اخلاق کے دائرے میں لایا جائے تاکہ ملک میں انتشار اور انارکی کے بجائے باہمی اتحاد اور ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا رویئہ فروغ پا سکے۔

(امجد رؤف خان)

ہم اور ہمارے سیاسی رہنما



سیارہ ڈائجسٹ

ہم اور ہمارے سیاسی رہنما

لڑتے لڑتے ہو گئی گم
ایک کی چونچ اور ایک کی دُم

ہمارے ملک میں گزشتہ کئی ہفتوں سے ایک سیاسی ڈرامہ چل رہا ہے جس کے کردار اتنا شور شرابہ کررہے ہیں کہ ہمارے ملک کا ہر شہری پریشان ہو کر رہ گیا ہے۔ ہر کوئی سوچ رہا ہے کہ اس ملک میں کیا ہورہا ہے۔ اس کا انجام کیا ہوگا؟ ہم کس طرف جارہے ہیں؟ ملک پہلے ہی اندھیروں میں ڈوبا ہوا ہے، مہنگائی کے عذاب میں ہر شہری پریشان ہے۔ کاروبار بند ہورہے ہیں۔ سڑکیں ویران ہورہی ہیں۔ لوگ اپنے گھروں میں بند ہو کر ٹی وی اور اخباروں میں ہر روز بُری سے بُری خبریں دیکھ اور پڑھ رہے ہیں۔ اس ساری صورت حال میں ہمارے سیاسی لیڈر اپنے ہی راگ الاپ رہے ہیں انہیں عوام کی پریشانی کا کوئی احساس نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اکثر سیاسی لیڈر کرپٹ اور اقتدار کے بھوکے ہیں۔ وہ اقتدار میں آ کر عوام کی خدمت کرنے کی بجائے پیسہ بنانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ ایسے لوگ ملک کی کیا خدمت کریں گے؟ اس ملک کو کیسے ترقی دیں گے جن کے خود قول و فعل میں اسقدر تضاد ہے۔ وہ آج کچھ کہتے ہیں کل کرتے کچھ اور ہیں حتیٰ کہ حکومت وقت بھی آج کچھ سوچتی ہے، دوسرے دن اس سے اُلٹ کام کرتی ہے۔ ایک دن اس کا حکم ہوتا ہے کہ ہم طاہر القادری کو ماڈل ٹاؤن سے اُٹھنے نہیں دیں گے۔ دوسرے دن کسی کے اشارے پر تمام کنٹینرز ہٹا کر اُن کو جانے کی اجازت دے دیتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حکومت بھی کسی اور کے اشاروں پر ناچتی ہے۔ ایک طرف تمام شرکاء جلوس کا کھانا بند کردیتی ہے۔ دوسرے دن کھانا خود پہنچاتی ہے۔ کبھی پورا شہر بند کردیتی ہے۔ پٹرول پمپس بند کردیتی ہے۔ لوگ اپنے گھروں میں محصور ہوجاتے ہیں۔ ایسے فیصلے شاید دشمن بھی نہ کریں جو ہمارے حکمران اپنی عوام کے حق میں صادر فرماتے ہیں۔ حکومت، قیمتوں اور ٹیکسوں میں اضافہ ایسے فخر سے صادر فرماتی ہے جیسے اپنی عوام سے ہی تجارت کررہی ہو۔ آپ خود اندازہ لگا لیجئے کہ ایسی سیاسی قیادت ملک کی ترقی کیسے کرے گی۔ ہم خود اپنے لوگوں کے ہاتھوں برباد ہورہے ہیں۔ ہم پر باہر سے کوئی ظلم نہیں کررہا ہم خود پر ظلم کررہے ہیں۔ آپ تمام سیاسی لیڈروں کو دیکھ لیں۔ سب اندر سے ایک جیسے ہیں۔ ان میں ایک بھی ایسا لیڈر یا پارٹی آپ کو دکھائی نہیں دے گی جو عوام کی خدمت دل سے کرنا چاہتی ہو۔ ہمارے ملک میں ہر ادارہ دوسرے ادارے کے خلاف اور لڑائی میں مصروف ہے۔ حتیٰ کہ میڈیا میں بھی چینل ایک دوسرے کے خلاف دکھائی دیتے ہیں۔ آپ کسی ایک چینل کو سن کر صحیح صورت حال کا اندازہ نہیں کرسکتے۔ آپ ایک چینل کی خبر کو سچا نہیں جان سکتے کیونکہ ان کی باگ ڈور کوئی اور چلاتے ہیں۔ جو ہر خبر

کو اپنے حساب سے دکھانا چاہتے ہیں۔ایک چینل آپ کو جلوس کی تعداد دس ہزار بتائے گا جبکہ دوسرا مخالف چینل اس کی تعداد کو لاکھوں میں بتائے گا۔ جہاں ملک کی صورت حال یہ ہو وہاں ملک کا ہر شہری پریشان نہیں ہوگا تو اور کیا ہوگا۔

سیاسی ہلچل

گزشتہ کئی ہفتوں سے جاری سیاسی ہلچل، افراتفری اور شور شرابے کے بعد تحریک انصاف اور عوامی تحریک کے آزادی اور انقلاب مارچ حکومت سے اجازت ملنے پر الگ الگ قافلوں کی صورت میں لاہور سے اسلام آباد پہنچ گئے، جہاں دوسرے علاقوں سے آنے والے جلوس بھی ان میں شامل ہوتے رہے اور انہیں وفاقی دارالحکومت کے مخصوص مقامات پر جلسے کرنے کی اجازت بھی مل گئی۔ حکومت نے اپنے خلاف ہونے والے ان احتجاجی مارچوں کی اجازت دینے میں جہاں سیاسی بالغ نظری اور مثبت جمہوری طرز عمل کا مظاہرہ کیا وہاں اس فیصلے میں ایم کیو ایم کے قائد الطاف حسین، گورنر سندھ اور گورنر پنجاب نے بھی نہایت اہم کردار ادا کیا۔ جبکہ دونوں جماعتوں کے لیڈر عمران خان اور ڈاکٹر طاہر القادری حکومت کا تختہ اُلٹے بغیر اسلام آباد سے واپس نہ جانے کے اعلانات کرتے رہے لیکن آئین اور پارلیمنٹ کی بالادستی پر یقین رکھنے والی سیاسی جماعتوں، پارلیمانی رہنماؤں اور رائے عامہ کے مختلف حلقوں کو توقع تھی کہ حکومت کے اس اقدام، لاہور ہائیکورٹ کے فیصلے سپریم کورٹ کے عبوری حکم اور جماعت اسلامی سمیت بیچ بچاؤ کرانیوالی بعض دوسری شخصیات کی مصالحتی کوششوں سے ماحول میں گرما گرمی بے چینی اور بے یقینی کی کیفیت ختم کرنے میں مدد ملے گی۔ عقل سلیم غالب آئے گی اور سیاسی مسائل کا سیاسی حل تلاش کرلیا جائے گا۔ لاہور ہائیکورٹ نے اپنے فیصلے میں وزیراعظم اور الیکشن کمیشن کے ارکان کے استعفوں، پارلیمنٹ کی تحلیل اور ٹیکنوکریٹس کی حکومت قائم کرنے کے مطالبات کو غیر آئینی قرار دیا ہے۔قانونی ماہرین کے مطابق اب ان مطالبات پر اصرار کا کوئی جواز نہیں البتہ ایک دوسرے سے الگ رائے رکھنے والوں کے درمیان مکالمہ اور مذاکرات کے ذریعے متنازعہ مسائل کا حل جمہوریت کا بنیادی تقاضا ہے۔ ادھر سپریم کورٹ نے ایک عبوری حکم جاری کیا ہے جس کے تحت ریاستی اداروں اور اہلکاروں کو کسی قسم کے ماورائے آئین اقدامات سے روک دیا گیا ہے۔ اس سے تصادم اور محاذ آرائی کے خطرات کم ہوجائیں گے۔اختلافی امور طے کرنے کے حوالے سے جماعت اسلامی کے امیر سراج الحق کا پانچ نکاتی فارمولا بھی قابل غور ہے۔ سراج الحق خیبر پختونخوا حکومت میں تحریک انصاف کے اتحادی ہونے کی وجہ سے حکومت اور عمران خان کے درمیان پل کا کام انجام دے رہے ہیں۔تحریک انصاف ان کے ذریعے حکومت کے ساتھ رابطے میں رہی ہے اور آئندہ بھی یہ عمل جاری رہنے کی توقع ہے۔اپنے فارمولے میں وہ موجودہ صورت حال کے سیاسی حل پر زور دیتے ہیں تاکہ آئین اور جمہوریت بچ جائے۔ ان کی یہ بھی تجویز ہے کہ 2013 کے انتخابات کے حوالے سے سپریم کورٹ کا جوڈیشل کمیشن جلد تشکیل دیا جائے۔ دھاندلی والے حلقوں میں ووٹوں کی دوبارہ گنتی کرائی جائے اور الیکشن کمیشن کی تشکیل نو کی جائے۔ اگرچہ عمران خان کا کہنا تھا کہ وہ میچ جیت کر یعنی حکومت گرا کر ہی

واپس جائیں گے جس سے کسی ماورائے آئین عمل کا تاثر ابھرتا تھا لیکن ان کے نائب شاہ محمود قریشی کہتے رہے کہ معاملات کا سیاسی حل نکالنے کی کوشش کی جائے گی اور سیاسی حل یقیناً آئین کی حدود سے باہر نہیں ہوسکتا۔ حکومت کے لئے یہ ایک اچھا پیغام تھا۔ ڈاکٹر طاہر القادری نے بھی مارچ شروع ہونے سے قبل اپنی جماعت کا دس نکاتی ایجنڈا جاری کیا جس میں غیر آئینی طریقے سے حکومت یا پارلیمنٹ کی بساط لپیٹنے کی کوئی بات نہیں کہی گئی۔ اس سے ملک میں انارکی پیدا ہونے کے خدشات کی نفی ہوتی ہے جو نیک شگون ہے۔ عمران خان اور طاہر القادری اپنی تقریروں میں جس انتہا پسندی کا مظاہرہ کرتے رہے ہیں سیاسی مبصرین کے مطابق وہ اپنے کارکنوں کا حوصلہ بلند رکھنے اور حکومت پر دباؤ بڑھانے کا حربہ تھے جو عموماً سیاسی لیڈروں کا وطیرہ ہے۔ اس لئے امید رکھنی چاہیے کہ موجودہ بحران کا قابل عمل حل نکل آئے گا۔ یہ سیاسی قیادت کی آزمائش کا وقت ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ حکومت اور اس سے برسرپیکار جماعتیں تحمل و بردباری سے کام لیں اور ملک کے وسیع تر مفاد کو مقدم رکھتے ہوئے مذاکرات کے ذریعے معاملات یکسو کرنے کی کوشش کریں۔

علامہ طاہر القادری کا انقلاب

علامہ طاہر القادری کا جلوس جب لاہور سے روانہ ہوا تھا تو میڈیا والوں کا کہنا تھا کہ اس میں آٹھ سے دس ہزار لوگ شریک تھے۔ اس جلوس نے بڑے ہی منظم طریقے سے اپنا سفر کا آغاز کیا تھا۔ راستے میں گجرات سے چوہدری پرویز الٰہی اور چوہدری شجاعت تقریباً تین چار ہزار لوگوں کو لے کر اس میں شامل ہوگئے اور یہ جلوس اپنا سفر طے کرتا ہوا اسلام آباد پہنچ گیا۔ شروع میں شیخ رشید بڑے متحرک نظر آئے وہ مولانا طاہر القادری اور عمران خان میں صلح کرانے اور اُن کے مشترکہ طور پر جلوس نکالنے کے حامی تھے۔ چونکہ مولانا طاہر القادری کا ایجنڈا عمران خان کے مطالبات سے مختلف تھا اس لیے دونوں میں صلح نہ ہوسکی۔ مولانا طاہر القادری انقلاب لانے کے لیے پرعزم تھے وہ اس تمام سسٹم کو بدلنا چاہتے ہیں۔ وہ اس جمہوریت کے خلاف ہیں جو آج کل ملک میں رائج ہے۔ اُن کا کہنا تھا کہ اس سسٹم میں جو لوگ منتخب ہوکر آتے ہیں وہ سب سے کرپٹ ہیں۔ اس لیے یہاں انصاف اور صحیح جمہوریت نہیں ہے۔ وہ اس تمام سسٹم کو لپیٹ دینے کے حق میں انقلاب کی باتیں کرتے ہیں۔

بہرحال انہوں نے اسلام آباد پہنچ کر اپنے خطاب میں دس نکاتی ایجنڈا CHARTER OF DEMAND پیش کر دیا جس کی پہلی شرط یہ تھی کہ شریف برادران استعفے دیں اور اُن کو منہاج القرآن کے شہداء کے الزام میں گرفتار کیا جائے باقی شرائط میں ملک میں معیشت' خوشحالی اور انصاف کے لیے اُن کی شرائط تھیں۔ اس کے لیے انہوں نے حکومت کو 48 گھنٹوں کی مہلت دی تھی۔ یہ مہلت ختم ہونے کے بعد طاہر القادری نے اپنی اتحادی جماعتوں کے ساتھ ملک بھر میں دھرنوں اور شاہراؤں کو بند کرنے کا اعلان کیا اور کہا کہ اب وہی ہوگا جو عوام کا فیصلہ ہوگا۔ اُن کے جلوس اور دھرنے میں جو بات نمایاں تھی اور جس کی سب نے تعریف کی وہ یہ تھی کہ اُن کے ورکرز اُن کے پیروکار اپنے لیڈر سے بہت زیادہ

Committed نظر آئے اور انتظامی معاملات میں بھی وہ لوگ بڑے ڈسپلن تھے۔ ایک اور بات جو سب لوگوں نے محسوس کی وہ مولانا طاہر القادری کا فنِ خطابت ہے۔ پاکستان میں شاید ہی ایسا کوئی مقرر ہو جو مسلسل کئی کئی گھنٹے خطاب کرے اور اُن کی آواز میں شروع سے لے کر آخر تک وہی گرج چمک برقرار رہے۔ الفاظ کے چناؤ اور آواز کا تال میل اُن کی تقریر کو چار چاند لگا دیتا ہے۔ اس عمر میں ماشاء اللہ اُن کی صحت کی بھی داد دینا پڑتی ہے۔ وہ بغیر تھکاوٹ اور پریشانی کے مسلسل بولتے جاتے ہیں اور ہر کوئی سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ خداداد صلاحیت ہے اور شاید اُن کی خوراک کیسی ہوگی جو گرمیوں میں بھی کوٹ اور ٹوپی پہن کر کئی کئی گھنٹے اپنے لوگوں سے خطاب کرتے رہتے ہیں۔ اُن کے جلوس اور دھرنے میں صرف اُن کی تحریک کے لوگ ہی شامل تھے اور اُن کا تعلق پاکستان کے مختلف علاقوں سے تھا۔ باقی پاکستان کی عام عوام میں وہ ہرگز مقبول نہیں نہ ہی عام لوگ اُن کی تقریر کو سننے یا اُن سے متاثر ہوکر آئے تھے۔ ہمارے ملک کی تمام سیاسی پارٹیوں نے نہ تو اس انقلاب کی حمایت کی نہ تعاون کیا اور نہ ہی شمولیت اختیار کی۔ سوائے چوہدری برادران کے، جن کی مقبولیت آج کل پاکستان میں سیاسی طور پر بہت کم ہوگئی ہے۔

پیپلز پارٹی کے دورِ حکومت میں بھی انہوں نے ایک ایسا ہی جلوس اور دھرنا دیا تھا مگر چند روز کے بعد ایک سمجھوتہ کر کے کینیڈا روانہ ہوگئے تھے۔ ہمارے خیال میں اسی لیے لوگ اُن پر اعتبار نہیں کرتے۔ جو لوگ اُن سے مذہبی طور پر متاثر ہیں بلکہ اُن کے پیروکار ہیں جن کا تعلق منہاج القرآن سے ہے وہ لوگ مولانا طاہر القادری کو بہت پسند کرتے ہیں اور پیرو مرشد کی طرح اُن کی عزت اُن کا حکم بجالانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔

عمران کا آزادی مارچ

عمران خان کے آزادی مارچ کے اعلان سے پاکستان میں ایک سیاسی ہلچل اور طوفان برپا ہوگیا۔ عوام پریشان ہوگئے، ہر کوئی سوچنے لگا اگر عمران خان چار پانچ لاکھ لوگوں کو لے کر اسلام آباد پہنچ گیا تو کیا ہوگا۔ کاروباری حضرات نے کام بند کر دیا۔ عوام نے گھروں سے نکلنا بند کر دیا۔ 14 اگست آ گیا، سڑکیں ویران ہونے لگیں۔ عمران کے گھر زمان پارک کے باہر تحریک انصاف کے کارکن اکٹھے ہونے لگے۔ ہر ایک کی زبان پر تھا کہ ملک میں کیا ہونے والا ہے؟ ہر کوئی تعداد کے بارے میں اپنے ذہن پر زور دینے لگا۔ دن آہستہ آہستہ گزرنے لگا۔ آخر شام کے وقت عمران خان اپنے جلوس کے ساتھ نمودار ہوئے اور آہستہ آہستہ اُن کا کارواں چلنے بلکہ رینگنے لگا۔ لاہور سے نکلتے نکلتے صبح ہوگئی۔ اگلے دن 9 بجے کے قریب جلوس گوجرانوالہ پہنچ سکا۔ گوجرانوالہ میں جلوس پر نواز لیگ کے حامیوں نے پتھراؤ کیا تو سارے ملک میں سراسیمگی پھیل گئی۔ لوگ ڈرنے لگے کہ جلد ہی ملک میں کچھ ہونے والا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ حکومت نے فوری اقدام کیے اور حالات پر قابو پالیا۔ اس کے بعد جلوس اپنی منزل کی طرف تیزی سے بڑھنے لگا اور خبروں کے مطابق مشاورت کے بعد عمران خان کو جلوس سے الگ کر کے جلد اسلام آباد پہنچا دیا گیا۔ لاہور

سے نکلتے ہوئے اور گوجرانوالہ تک کافی تعداد میں لوگ عمران خان کے ساتھ مگر حکمت عملی تبدیل کرنے پر جلوس کے شرکاء کی تعداد پندرہ ہزار کے قریب باقی رہ گئی تھی۔ گوجرانوالہ سے اسلام آباد کے راستے میں لوگ زیادہ تعداد میں شامل نہیں ہوئے ایک وجہ یہ بھی تھی کہ رات بہت زیادہ ہوگئی تھی۔ لوگ ڈر بھی رہے تھے کہ جلوس کے ساتھ حکومت جانے کیا سلوک کرے۔

دوسری طرف وزیراعلیٰ خیبر پختونخوا اپنے ساتھ دو سے چند ہزار لوگوں کو لے کر اسلام آباد میں انتظار کررہے تھے۔ پہلی رات عمران خان نے بڑے جوشیلے انداز میں تقریر فرمائی۔ اُن کا مطالبہ تھا کہ نواز شریف صاحب استعفیٰ دیں اور حکومت ختم کر کے مڈٹرم الیکشن کرائے جائیں اور اس دوران ایک ٹیکنو کریٹ حکومت قائم کی جائے۔ الیکشن کمیشن کو بھی ختم کر دیا جائے کیونکہ یہ سب کچھ الیکشن میں دھاندلی کی پیداوار ہے۔ جلوس کے ساتھ نوجوان بھی بڑے جوشیلے نظر آرہے تھے۔ یہاں پر عمران خان نے ایک بہت بڑی غلطی یہ کی کہ جلسے کے بعد اپنے گھر بنی گالہ چلے گئے اور جاتے ہوئے کہہ گئے کہ اگلے دن 3 بجے دوبارہ جلسہ ہوگا۔ اُن کے جانے کے بعد سارا مجمع منتشر ہوگیا اور اُن کے دھرنے کی جگہ کوئی بھی موجود نہ رہا۔ عمران کے ساتھی ہوٹلوں یا اپنے گھروں کو چلے گئے۔ تقریر کے دوران تیز بارش بھی ہورہی تھی۔ عمران کی تقریر کے دوران لوگ بارش میں بھیگتے رہے۔ اگلے دن یہ خبر بھی نشر ہوگئی کہ عمران خان بیمار ہوگئے ہیں۔ اخباروں میں لوگوں نے یہ بھی تنقید کی کہ عمران کو اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر اکیلے اپنے گھر نہیں جانا چاہیے تھا۔

دوسرے دن بھی عمران خان رات آٹھ بجے تشریف لائے اور انہوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ میں آپ کے ساتھ یہاں اسلام آباد میں سوؤں گا یہیں رہوں گا اور اس وقت تک گھر نہیں جاؤں گا جب تک نواز شریف مستعفی نہیں ہوجاتے۔ انہوں نے دو تین گھنٹے سٹیج پر سو کر بھی گزارے مگر اچانک اٹھے اور اپنے گھر چلے گئے اور یہ کہہ گئے کہ اگلا دن فائنل ہے ہم ریڈ زون میں داخل ہوجائیں گے۔ اس اعلان کے بعد پاکستانیوں میں سراسیمگی پھیل گئی کہ اتوار کو ضرور کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا۔ چینلز پر بھی مختلف تجزیے نشر ہونے لگے۔ ہر کوئی اپنی رائے دے رہا تھا۔ اینکر حضرات اپنا اپنا راگ الاپ رہے تھے۔ عمران خان صاحب مزے سے اپنے گھر آرام فرما رہے تھے۔ عوام کو یہ بات بُری محسوس ہوئی کہ تمام پاکستان کے کاروبار کو بند کرا کے یہ سیاسی لوگ خود آرام فرما رہے ہیں۔

عمران کا سول نافرمانی کا اعلان

چیئرمین تحریک انصاف عمران خان نے اپنے خطاب میں حکومت کی کرپشن کا ذکر کرنے کے بعد سول نافرمانی کی تحریک کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ عوام تاجر ٹیکس اور یوٹیلٹی بلز ادا کرنا بند کردیں۔ ہم وزیراعظم کو دو دن کی مہلت دیتے ہیں کہ وہ استعفیٰ دیں ورنہ کارکن میرے بس میں نہیں ہوں گے۔ یہاں آزادی مارچ کے دھرنے کے تیسرے روز خطاب کرتے ہوئے عمران خان نے کہا کہ میں اپنے 18 سال سے جاری مشن کی سب سے اہم تقریر کرنے جارہا ہوں۔ میری تقریر سننے کے بعد اگر آپ نے اس پر عمل کرلیا تو نیا پاکستان

بننے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔ آج میں اپنے کارکنوں کو امتحان میں ڈالنے لگا ہوں مجھے امید ہے کہ میرے کارکن اس امتحان میں پاس ہونگے۔ میں نہیں چاہتا کہ کسی انتشار کی وجہ سے فوج کو آنا پڑے، فوج آ گئی تو ملک پیچھے چلا جائے گا، ملک اندھیرے میں ہے نواز شریف قرض لیکر ملک چلا رہے ہیں۔ یہ رہے تو ملک کا مستقل اندھیرے میں رہے گا۔ یہ ملک کو مزید مقروض کردیں گے۔ نواز شریف نے ملک کا قانون توڑا، ججوں کو خریدا انتخابات میں الیکشن کمیشن کو خریدا اور لفافہ جرنلزم شروع کی۔ انہوں نے جرنیلوں کو بھی خریدنے کی کوشش کی۔ نجم سیٹھی کو خریدا، جس نے بھی نواز شریف کا احتساب کرنے کی کوشش کی اسے خرید لیا گیا، نواز شریف کے بچوں نے بھی کرپشن شروع کردی ہے۔ شریف برادران ملک کا پیسہ باہر بھیج رہے ہیں۔ پارلیمنٹ، اسمبلی اور وزیراعظم سب جعلی ہیں۔ وزارت داخلہ مجھے کہتی ہے کہ مجھے پنجابی طالبان ماردیں گے اگر خودکش حملے میں مارا گیا تو اللہ میرے گناہ معاف کردیگا۔ انہوں نے سول نافرمانی کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ جب تک نواز شریف استعفیٰ نہیں دیتے عوام بجلی، پانی، گیس کے بل اور تمام ٹیکس ادا کرنا چھوڑ دیں۔ تاجر بھی ٹیکس اور بل دینا چھوڑ دیں اگر ٹیکس دیا تو پیسہ نواز شریف کھا جائے گا۔ نواز شریف وزیراعظم رہے تو پاکستان کا مستقبل کبھی روشن نہیں ہوسکتا۔ پاکستان میں انصاف کا نظام شریف برادران کو نہیں پکڑ سکتا اب قوم فیصلہ کرے گی کہ ان کا کیا کرنا ہے۔ انہوں نے حکومت کو دو دن کی ڈیڈ لائن دیتے ہوئے کہا کہ اگر نواز شریف دو دن میں مستعفی نہ ہوئے تو کارکن ریڈزون میں داخل ہو جائیں گے۔ جمہوریت پر یقین رکھتا ہوں، سول بیوروکریسی اور سرکاری ملازم نواز شریف کی ملازمت سے خود کو آزاد کریں، اگر عوام اب بھی نہ اٹھے تو کبھی ظلم سے نجات نہیں پاسکیں گے۔ ملکی عدالتیں، قانون، نیب شریف برادران کو نہیں پکڑ سکتے۔ میں آج سے ٹیکس اور بجلی و گیس کے بل نہیں دونگا۔ دو دن اسی کنٹینر پر رہوں گا اور یہیں سوؤں گا۔ کرپٹ وزراء کی کرپشن کی داستانیں سنائیں گے اور ان کو ننگا کریں گے۔ میں نے چوہدری نثار سے وعدہ کیا ہے کہ ریڈزون میں داخل نہیں ہوں گے لیکن اگر دو روز تک مطالبہ پورا نہ ہوا تو چوہدری نثار سے معذرت کرلیں گے۔ وزیراعظم ڈیل کرنے کے لیے بندے نہ بھیجو اب وقت ختم ہوگیا۔ چوہدری نثار بھی فیصلہ کرلیں کہ آپ بادشاہت کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں یا جمہوریت کے حامی ہیں۔ میں اگر وزیراعظم بنا اور عوام پر ظلم کیا تو میرے خلاف بھی سول نافرمانی کی جائے۔ عوام اب دو دن تک صبر کریں، شام کو ہم یہاں دھرنے کے مقام پر آئیں گے اور آزادی کا جشن منائیں گے۔ ہمارے پاس دو راستے تھے ایک سونامی یہاں سے نکلے اور وزیراعظم ہاؤس سے نواز شریف کو نکال دے لیکن اس سے پولیس کے معصوم اہلکار مارے جائیں گے میں سمجھتا ہوں کہ پولیس اہلکاروں کے بیوی بچے ہیں انہیں کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ موجودہ حکمرانوں کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک شروع کردی جائے۔ لگ رہا ہے کہ اڑتالیس گھنٹوں کے اندر ہم میچ جیت کر یہاں سے چلیں جائیں گے۔ نواز شریف کا بیٹا لندن میں آٹھ کروڑ پاؤنڈ کے گھر میں رہتا ہے جبکہ قوم بھوکوں مر رہی ہے۔ نئے پاکستان میں کرپٹ سیاستدانوں کی گنجائش نہیں ہوگی۔ عمران مقابلہ کرنے آیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے میری ٹریننگ کروائی ہے میں نے کھیلوں کے گراؤنڈ میں مقابلہ

کرنے کی ٹریننگ لی ہے اور ہر مقابلہ کرنے کی ہمت ہے۔ قبل ازیں ایک بیان میں عمران خان نے کہا عوام اپنا فیصلہ سنا چکے ہیں۔ نواز شریف اقتدار سے علیحدہ ہو جائیں۔ ٹوئیٹر پیغام میں انہوں نے کہا عوام کو انتخابات میں دھاندلی قبول نہیں، لوگوں کے ہجوم نے تحریک انصاف کے مارچ میں شرکت کرکے نواز شریف کو انتخابات میں دھاندلی کا ثبوت دے دیا۔ لوگ جانتے ہیں کہ نواز شریف ریٹرننگ افسران، نگران حکومت کو خریدنے اور میچ فکسنگ میں ملوث ہیں وہ انہیں قبول نہیں کرتے۔ آئی این پی کے مطابق عمران خان نے مارچ میں شریک خواتین کارکنوں سے بدتمیزی کا سخت نوٹس لیتے ہوئے اپنے کارکنوں کو خبردار کیا ہے کہ خواتین سے کوئی بدتمیزی نہ کی جائے، ان کا مکمل احترام کریں۔ ایک انٹرویو میں چیئرمین پی ٹی آئی نے کہا لکھ کر دینے کے لیے تیار ہوں کہ نواز حکومت ایک دو ہفتوں کی مہمان ہے۔ انشاء اللہ ملک کا اگلا وزیراعظم بنوں گا۔ کے پی کے میں ہمارے خلاف جلسہ ہو جائے تو اگلے دن الیکشن کرا دوں گا۔ فضل الرحمان کو جب چاہیں خرید لیں۔ دو دین پر سیاست کر رہے ہیں۔ ان کی قیمت 2 یا 3 وزارتیں ہیں۔ عمران خان نے رات گئے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ حکمرانوں نے تمام قانونی دروازے بند کر دیے ہیں۔ تحریک انصاف کسی صورت ڈیل نہیں کرے گی۔ دو دن بعد ہم ایک ناجائز حکومت، ناجائز پارلیمنٹ اور ناجائز وزیراعظم کو قبول نہیں کریں گے۔ دو دن بعد ہم ریڈ زون جائیں گے کنٹینرز ہمارا راستہ نہیں روک سکتے۔ اسلام آباد پولیس بھی راستہ نہ روکے ہم انہیں آزاد کرانے آ رہے ہیں ہم کوئی توڑ پھوڑ نہیں کریں گے۔ عمران خان نے حکومت کو جو ڈیڈ لائن دی تھی اُس سے ایک روز قبل پی ٹی آئی کے رہنما شاہ محمود قریشی نے تحریک انصاف کی طرف سے اسمبلیوں سے استعفے دینے کا اعلان کیا مگر کے پی کے میں جہاں اُن کی حکومت ہے وہاں استعفے نہیں دیے گئے۔ یہ سطور لکھنے تک اسلام آباد میں کشیدگی بدستور جاری ہے۔

یہ سیاسی ڈرامے اور تماشے قوم کو کیا سبق دے رہے ہیں وہ یہ دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے حکمرانوں کا حکومت کرنے کا انداز ہمارے سیاسی لیڈروں کا اقتدار چھیننے کا انداز کیسا ہے؟ جو کسی قانون اور آئین کی پاسداری نہیں کرتے عوام میں کیا احساس اُجاگر کر رہے ہیں کہ عوام بھی اپنے لیڈروں کو دیکھ کر پاکستان میں قانون کی پاسداری نہ کریں۔ اُن کو بھی قوانین کی خلاف ورزی کرنے کے لیے کھلی چھٹی ہونی چاہیے۔ پاکستان کی سب سے بڑی بدنصیبی ہے کہ پاکستان میں انصاف اور قانون کا بول بالا نہیں ہوا۔ امیر کے لیے آزادی ہے۔ سب قانون غریب عوام کے لیے ہے۔ اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔ جب تک پاکستان میں قانون سب کے لیے برابر نہیں ہوگا۔ ہر کوئی قانون کا مذاق ہی اُڑائے گا۔ وہ نہ تو اچھا انسان اور نہ ہی اچھا شہری بلکہ نہ اچھا پاکستانی ہوسکتا ہے۔ دنیا میں وہی قومیں ترقی کرتی ہیں جو اپنے ملک میں انصاف قائم کرتی ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے لیڈروں کو ہدایت دے کہ وہ اچھے رہنما بنیں تاکہ قوم بھی اُن کے نقش قدم پر چل سکے۔ (آمین)

مجید نظامی ...... وہ عہد موجودہ میں سچ کا استعارہ تھے!

سیارہ رپورٹ

(سعد اللہ شاہ)



مجید نظامی......

وہ عہد موجودہ میں سچ کا استعارہ تھے!

(سعد اللہ شاہ)

صحافت کے میر کارِرواں اور نظریۂ پاکستان کے محافظ مدیر و معمار روزنامہ نوائے وقت جناب مجید نظامی 27 رمضان المبارک (بمطابق 26 جولائی 2014) کی شب اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کی وفات سے صحافت کے میدان میں پیدا ہونے والا خلاء کبھی پُر نہ ہو سکے گا۔ مجید نظامی اُن گنے چنے لوگوں میں سے تھے جنھوں نے نظریۂ پاکستان کو ساری عمر سینے سے لگا کر رکھا اور اس کی آبیاری کی۔ اُنھوں نے پاکستان کے مفادات اور اس کے قیام کے مقاصد کو ہمیشہ مقدم جانا اور انہی کی روشنی میں نوائے وقت کو پاکستان کی نظریاتی سرحدوں کا پاسبان بنایا۔ صحافت، نظریۂ پاکستان اور مملکت خداداد پاکستان کے لیے مجید نظامی کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

ذیل کی سطور میں، جناب مجید نظامی کی زندگی اور ان کی یادوں کے حوالے ایک یادگار انٹرویو پیش کیا جا رہا ہے:

تاریخ میں دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو تاریخ لکھتے ہیں اور دوسرے وہ جو تاریخ بناتے ہیں۔ نیز افراد کو تین طبقوں میں بھی تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ بڑے لوگ' جو نظریات کو حرزِ جاں بناتے ہیں' اوسط درجے کے اشخاص، جو واقعات کو موضوع سخن کرتے ہیں اور نچلے ربک میں رہنے والے جو شخصیات پر طبع آزمائی کرتے ہیں۔ میں نے مجید نظامی صاحب پر قلم اس لیے اٹھایا کہ وہ شخصیت نہیں ایک نظریہ تھے۔ وہ تاریخ بنانے والے مجاہد پاکستان تھے جنہوں نے نظریۂ پاکستان کو اپنے رگ و پے میں اُتار لیا۔ وہ قائد اور اقبال کے افکار میں زندہ رہے۔ وہ عملی طور پر تحریک پاکستان سے وابستہ رہے اور اسی داستان کا تسلسل تھے جسے حمید نظامی نے تحریک کی صورت حقیقت بنا دیا۔ حمید نظامی مرحوم مسلم سٹوڈنٹ فیڈریشن کے بانی تھے۔ انہوں نے قائداعظم کے کہنے پر اخبار کا اجرا بھی کیا جس کی موجودہ صورت نوائے وقت ہے اور معمار مجید نظامی تھے۔ گویا وہ شمع جو حمید نظامی مرحوم نے روشن کی تھی اسے مجید نظامی نے طوفانی آندھیوں میں بھی بجھنے نہیں دیا، بلکہ بقول سعدیہ قریشی:۔

بلند اور ہوئی ہے مرے چراغ کی لو
ہوائے تند کو اتنا جواب کافی ہے

قائد کا غیر متزلزل ارادہ' پختہ یقین اور پیہم عمل جناب مجید نظامی کے پیش نظر رہا۔ اقبال کی دُور اندیشی،

فکری گہرائی اور بلند پروازی ان کے تخیل کو انگیخت لگاتی رہی۔ ان کے سامنے اس پاکستان کے خدوخال تھے جس کا خاکہ "قائد" اور "اقبال" کی سوچ کا آئینہ دار تھا۔ وہ منزلوں سے بے نیاز اسی راستے کے مسافر بنے جہاں پیہم سفر ہی کامیابی کی دلیل ٹھہرتا ہے۔ جہاں کے نقوش پا خون آلودہ ہوتے ہیں۔ کوئی کشش، لالچ یا دلکشی انہیں اپنی طرف راغب نہ کر سکی۔ کوئی دھمکی، خوف یا مصلحت انہیں اس صراط مستقیم سے نہ ہٹا سکی جس پر چل کر ان کے بڑوں نے یہ پاک دھرتی حاصل کی تھی۔

منزلیں ان کا مقدر کہ طلب ہو جن کو
بے طلب لوگ تو منزل سے گزر جاتے ہیں

یہ لوگ منزلوں سے ماورا ہوتے ہیں، منزل خود انہیں تلاش کرتی ہے۔ حمید نظامی صاحب بیمار ہوئے تو شورش کاشمیری نے مجید نظامی صاحب کو لندن فون کیا کہ فوراً پاکستان پہنچیں۔ چنانچہ کچھ ایسا ہی ہوا ان کے آنے پر حمید نظامی نے آنکھیں کھولیں اور کہا کہ "تم آ گئے اچھا کیا" اس کے بعد وہ ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا ہو گئے مگر ان کی تعلیمات کے روپ میں ہمارے درمیان موجود ہے۔ سارا بوجھ مجید نظامی کے کندھوں پر آن پڑا ان کے سوا اور کوئی یہ ذمہ داری اٹھانے کا متحمل بھی نہیں تھا۔ یہ دلیری اور جرأت کا معاملہ تھا۔ ایک تحریک 'مقصد اور نظریہ کو لے کر آگے چلنا تھا۔ رفتہ رفتہ ابن الوقتوں نے سر اٹھایا اور اس ملک کے لیے بربادی کا باعث بننے لگے۔ مادرِ ملت جیسی عظیم ہستی کو بے فیض اور احسان فراموش ایوب خان جیسے لوگوں نے "کارنر" کر دیا۔ بدترین دھاندلی کے ذریعے بانی پاکستان کی جاں نثار ہمشیرہ کو ہرا دیا گیا۔ مجید نظامی صاحب نے ہمیشہ مادرِ ملت کو پوری آب و تاب کے ساتھ زندہ رکھا۔ قیام پاکستان کے بعد استحکام پاکستان اور دفاع اساس پاکستان کا کارِ خیر نوائے وقت کے حصے ہی میں آیا۔

حقیقت یہ ہے کہ مجید نظامی اور ان کے رفقا نے اس ملک کو اپنا گھر سمجھا کیونکہ وہ اسے بنانے والوں میں شامل تھے اور گھر کی قدر تو گھر والا ہی جانتا ہے۔ وہ قائد اور اقبال کی فکری اساس کے وارث تھے اور اپنے اندر حوصلہ رکھتے تھے کہ وہ اس کی حفاظت کر سکیں۔ ایک مرتبہ نواب آف کالاباغ نے مجید نظامی سے کہا تھا "اوپر خدا ہے اور نیچے ایوب خان اگر اس نے مجھے کہا کہ تو میں نوائے وقت بند کر دوں گا اور تم میں اگر ہمت ہو تو اس پالیسی کو جاری رکھنا" مجید نظامی صاحب نے کہا "آپ مجھے باہمت ہی پائیں گے"۔ وقت نے ثابت کیا کہ وہ کسی لمحے کسی بھی آمر اور جابر کے سامنے نہیں جھکے۔ ایوب خان نے صحافیوں سے بات کرتے ہوئے ایک مرتبہ کہا تھا کہ وہ اپنے گریبانوں میں جھانکیں۔ مجید نظامی صاحب نے اٹھ کر انہیں روکا اور کہا کہ وہ تو اپنے گریبان میں جھانکتے ہیں تو اپنا سر فخر سے اونچا محسوس کرتے ہیں۔ ایوب نے کہا کہ ان کے مخاطب نظامی صاحب نہیں۔ مجید نظامی نے کہا کہ آئندہ وہ متعلقہ شخص کو مخاطب کر کے بات کیا کریں۔

مجید نظامی صاحب بہادر تھے اور انہیں کسی بھی شخص میں یہ صفت اچھی لگتی تھی۔ اسی باعث انہوں نے طویل جیل کاٹنے والے آصف زرداری کو بھی مردِ حر کا خطاب دیا۔ یار لوگوں نے مجید نظامی کے دیئے ہوئے اس خطاب کو اُٹھا لیا اور خوب خوب چرچا کیا۔ نظامی صاحب نے نواز شریف کے سوال کے جواب میں کہا تھا کہ اگر وہ بھی سرور محل میں رہنے کی بجائے پاکستان میں زرداری کی طرح جیل کاٹتے تو وہ انہیں بھی مردِ حر کہتے۔

ایٹمی دھماکے جیسے نازک موقع پر جبکہ بہت سے ایڈیٹر ایٹمی دھماکے کے خلاف باتیں کر رہے تھے، انہوں

نے نواز شریف کو پیغام دیا تھا کہ وہ جرأت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دھماکہ کردیں ورنہ لوگ ان کا دھماکہ کردیں گے۔ انہوں نے جنرل ضیاء سے کہا تھا کہ وہ کرکٹ ڈپلومیسی کے تحت بھارت جانے کے لیے تیار نہیں۔ ہاں اگر ٹینکوں پر بیٹھ کر جاتا ہے تو ٹھیک ہے۔ انہوں نے نواز شریف کو قائد ثانی کہنے والوں کو بھرے جلسے میں روک دیا تھا اور کہا تھا کہ نواز شریف تحریک استقلال میں تھے لہٰذا وہ اصغر خان ثانی تو ہو سکتے ہیں قائد ثانی نہیں۔ ایسی باتیں وہی کہہ سکتا ہے جس کا ظاہر باطن ایک ہو اور اسے کسی کا خوف نہ ہو۔

سچی بات تو یہ ہے کہ مجید نظامی کی کاوشوں سے نوائے وقت پاکستان کی پہچان بن گیا۔ نوائے وقت اور پاکستان یک جان دو قالب ہیں۔ مجید نظامی کے سینے میں پاکستان دھڑکتا تھا، سبز ہلالی پرچم ہمارے منشور کو گنبد خضریٰ سے مماثلت دیتا ہے۔

نوائے وقت کی پالیسی نظریۂ پاکستان پر استوار ہے اس کی بنیاد کلمۂ طیبہ لا الہ اللہ ہے کہ اصغر سودائی مرحوم نے تو تحریک کے دوران ہی لکھ دیا تھا:۔

پاکستان کا مطلب کیا......لا الہ الا اللہ

کچھ بدخواہوں اور مذہب بےزار لوگوں نے پاکستان کی تخلیق کو مشکوک بنانے کی کوشش بھی کی۔ یہ بدبخت اور لعنتی اب بھی موجود ہیں جن کے خیال میں قائداعظم اس ملک کو سیکولر دیکھنا چاہتے تھے۔ مجید نظامی صاحب نے نوائے وقت کے پلیٹ فارم سے ایسے گستاخوں کو ہمیشہ مدلل اور بھرپور جواب دیا کہ مسلمان لا الہ الا اللہ کے نعرے پر ہی یکجا ہوئے تھے اور پاکستان کو حاصل کرنے کا مقصد بھی یہی تھا کہ مسلمان آزادانہ طریقے سے اپنے مذہبی فرائض پورے کرسکیں۔ ہم نے بحیثیت مسلمان قوم یہ ملک حاصل کیا، اس قوم کا تشخص اور پہچان اس کے سوا کیا ہے کہ وہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ پر ایمان رکھتے ہیں اور حضور کی سیرت کو رہنما بناتے ہیں۔ اس پیغام کو پھیلانے کا بیڑہ نوائے وقت نے اٹھایا۔ نوائے وقت کا ماٹو ہی جابر حکمران کے سامنے کلمۂ حق کہتا رہا ہے اور کلمۂ حق کیا ہے وہی تو ہے لا الہ الا اللہ۔

مجھے ہے حکم اذاں لا الہ الا اللہ

کبھی غور کیا جائے تو مجید نظامی صاحب سے وابستہ نوائے وقت، پھول، ندائے ملت اور فیملی اپنے معنی کے اعتبار سے راست فکر لیے ہوئے ہیں۔ نوائے وقت ہے تو یہ وقت کی آواز ہے، وقت سچ ہے اسے جھٹلانے والا صفحۂ ہستی سے مٹ جاتا ہے۔ ''پھول'' خوشبو ہے اس رسالے کا باطن بھی مہک رہا ہے اور پڑھنے والے کے مشامِ جاں کو معطر کرتا ہے۔ ندائے ملت تو قوم کی پکار ہے کہ یکجہتی اور بھائی چارہ ملت کے لیے ازبس ضروری ہے۔ فیملی نام ہی سے اجتماعیت کا تصور دیتا ہے۔ ایک ایسا میگزین جسے فیملی میں بیٹھ کر پڑھا جاسکے۔ یہ سارے نام ظاہر اور باطن ہر دو حوالے سے مجید نظامی صاحب کی شخصیت کے عکاس ہیں۔ ان کے ارد گرد ان کے رفقاء بھی ایک کہکشاں کی طرح تھے۔ یہ لوگ پاک وطن کے لیے اب بھی غنیمت ہیں۔

ہیں ابھی شہر میں ناموس پہ مرنے والے
جینے والوں کے لیے اتنا سہارا ہی سہی

مجید نظامی صاحب کے نظریاتی عمل کا پھیلاؤ وقت ٹی وی اور نظریہ پاکستان ٹرسٹ کی شکل میں اپنا دائرہ کار وسیع کرچکا ہے۔ وقت ٹی وی الیکٹرانک میڈیا میں اساس پاکستان کی ترجمانی کررہا ہے۔ اسلامی اقدار و

روایات کو سامنے رکھ کر اپنے پروگرام تشکیل دے رہا ہے۔ اس محاذ پر ان کی جرأت مند اور ذہین بیٹی رمیضہ اس شمع کو روشن کیے ہوئے ہیں، جو پاکستان کے لیے امید کی نشانی ہے۔ وقت کے پروگرام سنجیدہ ہوتے ہیں اور ایک خاص مقصد کے تحت کردار سازی کر رہے ہیں۔ نظریہ پاکستان ٹرسٹ جسے مجید نظامی اور ان کے دیرینہ ساتھی ڈاکٹر رفیق احمد نے قائم کیا، پاکستانی اذہان کا ایک بڑا فورم ہے جہاں سے دشمن کے پراپیگنڈہ کا جواب دیا جاتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ اس ملک کے بچوں کی کردار سازی کر رہا ہے۔ یہاں بچوں کو مدعو کیا جاتا ہے۔ ان کی تربیت کے لیے ورکشاپس اور دوسرے پروگرام ہوتے ہیں۔ حقیقت میں یہ ادارہ پاکستان کا صحیح تھنک ٹینک ہے۔ ان پر تحریک پاکستان کے اغراض و مقاصد سے لے کر استحکام پاکستان کی ضرورت کے حوالے تک ذہن تیار کیے جاتے ہیں تاکہ آگے چل کر وہ محب وطن پاکستانی ثابت ہوں۔ ان کو قائدؒ اور اقبالؒ کی تعلیمات کی روشنی میں تعلیم دی جاتی ہے۔ تاکہ وہ پاکستان کا پرچم سنبھالیں اور چلتے پھرتے پاکستان نظر آئیں:

آنکھ میں روشن چاند ستارا دل میں سبز اُمنگ
آؤ چلیں ہم پرچم لے کر اک دوجے کے سنگ

مجید نظامی صاحب کا یہ انٹرویو پائلٹ آئینہ کی ٹیم نے 12 جنوری 2010ء 2 بجے ان کے گھر پر کیا۔ ساتھ آمنہ الفت، محمد زاہد میاں، احتشام جمیل شامی اور عمران شناور تھے۔

شام رات میں ڈھل رہی تھی، ہوا میں خنکی تھی۔ ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا جہاں ہیٹر کمرے کو گرم کر چکے تھے۔ یہ ڈرائنگ روم کم سٹڈی روم تھا کہ ہر طرف شیلف کتب سے بھرے ہوئے تھے، ظاہر ہے مجید نظامی صاحب کا اوڑھنا بچھونا ایسا ہی ہو سکتا تھا۔ یہی حرف شناسی تو حق شناسی کی راہ دکھاتی ہے۔ حق، سچ اور خوبصورتی ہی اصل حقیقتیں ہیں۔ مجید نظامی صاحب آئے۔ چائے، مٹھائی، کھجوریں اور باتیں، تین گھنٹے گزرنے کا احساس تک نہیں ہوا۔ اپنے عہد کا ایک عظیم صحافی جنہیں اہل دانش نشانِ جمہوریت لکھتے ہیں، وہ صحافت کے شاہسوار اور سچ کے علمبردار تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ ہماری سنہری اقدار و روایات کی آبرو قائم رکھے ہوئے تھے۔ وہ ایک بانکپن کے ساتھ ہمارے ساتھ بیٹھے دریا کی روانی سے اپنی کہانی سنا رہے تھے اور ہم ہمہ تن گوش سماعت کر رہے تھے۔ ان کے تاثر سے سمندر کی گہرائی کا احساس ہوتا تھا اور پھر بولنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس سمندر کے اندر طوفان بھی ہیں اور اس سمندر کے ساحل پر سیپیاں بھی پڑی ہیں جن کے اندر آب دار موتی بھی ہیں۔ مجید نظامی صاحب کی میزبانی سے انتہائی اپنائیت محسوس ہوئی۔ شاید اس لیے کہ وہ ہمارے دل کی باتیں کر رہے تھے وہ پاکستان کی تخلیق سے لے کر اس کے استحکام کی دعا تک ایک جذبے میں ڈھلے ہوئے لگ رہے تھے۔ میں نے کہا کہ چائے کا وقفہ ہو جائے۔ کہنے لگے کوئی بات نہیں بات بھی چلتی رہے۔ میں نے کہا "سوال ہی پیدا نہیں ہوتا یہ تو سوئے ادب ہے"۔ وہ مان گئے اور پھر آف دی ریکارڈ یعنی انٹرویو سے ہٹ کر باتیں ہونے لگیں۔ انہوں نے بتایا کہ مٹھائی کے ساتھ کھجوریں مدینہ سے آئی ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ان کی بیٹی رمیضہ نے 22 عمرے کیے ہیں اور یہ کہ انہوں نے پانچ حج اور ان گنت عمرے کر رکھے ہیں۔ یہ اللہ کا کرم ہے وہ اس وقت بھی مدینے سے بلاوے کے منتظر تھے۔ ظاہر ہے جو مکہ اور مدینہ سے اس قدر جڑا ہوا ہو وہ اقبال کی طرح کیوں نہ کہے گا:

سرمہ ہے میری آنکھ کی خاکِ مدینہ و نجف

مجید نظامی صاحب قتیل شفائی کے مندرجہ ذیل شعر کی عملی شکل تھے:۔

اب جس کے جی میں آئے وہی پائے روشنی
ہم نے دل جلا کر سرِعام رکھ دیا

مجید نظامی صاحب کھلی کتاب کے مانند تھے جس کا ہر باب واضح اور صاف تھا۔ ہر حرف ان کے معانی و مقاصد سے لبریز ہے۔ وہ لگی لپٹی کے بغیر ہر بات صاف صاف کہہ دینے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ وہ بصارت سے بصیرت تک سب کچھ کسی کو دان کیے ہوئے تھے وہ کہ جس نے انہیں اس کام کے لیے چنا تھا۔ یہ قومی فریضہ سالہا سال سے ادا ہو رہا تھا۔ ہر قسم کے نامساعد اور مشکل حالات میں بھی وہ کبھی مایوس نہیں ہوئے۔ کتنے لوگوں کو انہوں نے اس میدان میں رہنے کے رموز سکھائے اور معتبر بنایا۔ کتنے لکھنے والوں کی ذہنی آبیاری کی اور کتنے بھٹکے ہوؤں کو راہ دکھائی۔ وہ خود ایک چراغ کی طرح جل رہے تھے۔ یہ تو ہمارے سوچنے کی بات ہے کہ:

جو روشنی نہ رہے گی تو کیا کرو گے تم
تمہارا سایہ تلک ساتھ چھوڑ جائے گا

ہماری روشنی ہمارا نظریہ پاکستان ہے کہ جس کا منبع و محور نورِ علیٰ نور ہیں جس کا کعبہ بیت اللہ ہے۔ قائد نے یہی تو کہا تھا کہ وہ پاکستان کو اسلام کی تجربہ گاہ بنانا چاہتے ہیں۔ افسوس صد افسوس کہ ہمارے حکمرانوں نے اسے مغرب کی چراگاہ بنا ڈالا۔ نظام تعلیم کو برباد کر دیا۔ پرویز مشرف کے دور میں تو انتہا ہی ہو گئی کہ انہوں نے امریکہ کے ایجنڈا کے تحت ہمارے دو قومی نظریہ پر حملہ کیا۔ وہی نظریہ جسے مجید نظامی سینے سے لگائے ہوئے تھے اور جو نوائے وقت کی روح ہے۔ مجید نظامی تو جہاد کے داعی تھے اور بقول ان کے جہاد کے نام سے دشمنانِ اسلام کی جان جاتی ہے۔ اسی لیے بدبخت آمر مشرف کے دور میں زبیدہ جلال اور قاضی جاوید نے کوشش کی کہ جہاد کا حوالہ تعلیم سے گول کر دیا جائے اور تعلیم کو غیر ملکی این جی اوز کے حوالے کر دیا جائے جبکہ مجید نظامی صاحب نے اس رویے کے خلاف سخت احتجاج کیا اور کہا کہ دو قومی نظریہ ہی پاکستان کی اساس ہے۔ پاکستان کے باب میں یہ نظریہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور اسے ہر سطح پر پڑھانا ضروری ہے۔ اپنے انٹرویو کے دوران نظامی صاحب نے جہاد پر زور دیا کہ یہی ایمان کی روح ہے اور غیر مسلم اسی سے ڈرتے ہیں۔ اس کے بغیر کشمیر کبھی آزاد نہیں ہوگا۔ اس کے بغیر ہندو بنیا ہمارے پاکستان کو ریگستان میں بدل دے گا۔ انہوں نے کہا کہ امن کی آشا کے نام پر لوگوں کو دھوکہ دے رہے ہیں ورنہ پراپیگنڈہ کرنے والے سب کچھ سمجھتے ہیں کہ ہندو نے گجرات کے مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ مسلمانوں سے بھری ٹرین جلا دی، بابری مسجد شہید کر دی، کشمیر میں قتل عام کیا جو ان سے بن پڑا وہ انہوں نے ضرور کیا اور پھر امن کی آشا کیا مذاق ہے، یہ اپریل فول جیسا مذاق ہے۔ یہ ہمارے شہیدوں کی توہین ہے۔ ابھی دیکھیے آئی سی ایل کے لیے کھیلنے والے کھلاڑیوں کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے سب کی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہے۔ ہندو ذہن کو مسلمانوں کی صرف تذلیل مقصود ہے۔ ہمارے کھلاڑیوں کو آئندہ کے لیے توبہ کر لینی چاہیے۔ نظامی صاحب نے کہا کہ وہ ہمارے کشمیریوں کو شہید کر رہے ہیں اور ہمارے دریاؤں کو ریگستان بنا رہے ہیں اور ساتھ ساتھ امن کی آشا والا ڈرامہ بھی کر رہے ہیں۔ نظامی صاحب کی ہر بات دوٹوک اور برجستہ ہوتی تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

مجید نظامی صاحب کے مزاج میں سادگی بدرجہ اتم موجود تھی۔ وہ اپنی اصل سے مکمل جڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے بدلتی ہوئی اقدار سے ہرگز اثر قبول نہیں کیا۔ ان کے رشتے ناتے اور تعلق داریاں بھی دیرپا مضبوط تھیں۔ انکے ساتھ ملازم کئی برس سے ان کے پاس تھے۔ ان کے دیرینہ خدمت گزار منیر سے بات ہو تو وہ نصف صدی کے قریب کی تعلق داری کا ذکر ہوتا ہے۔ وہ کسی ملازم کو نہیں نکالتے تھے اور اگر کوئی لالچ میں آ کر چھوڑنا چاہے تو اسے روکتے بھی نہیں تھے۔ انہیں اپنے اوپر اور ادارے پر مکمل اعتماد تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ کسی کے آنے جانے سے کچھ نہیں ہوتا۔ اصل میں نوائے وقت میں نظریاتی شخص ہی چل سکتا ہے۔ یہاں بلیک میلنگ باز وصحافت کا گزر نہیں۔

مجید نظامی صاحب میں ایک نہایت پیاری معصومیت بھی نظر آتی تھی کہ وہ زود رنج تھے۔ وہ فوراً راضی بھی ہو جاتے تھے۔ بے پناہ محبت کرتے تھے تو انتہاؤں پہ چلے جاتے تھے۔ انہوں نے ڈاکٹر قدیر خان کو محسن پاکستان' کا خطاب دیا اور ان کی رہائی کا اشتہار مسلسل چھاپا اور حکومت کے کہنے پر اشتہار کی اشاعت بند نہ کرنے پر اپنے اشتہار بھی بند کروائے۔ ان کی رہائی کے لیے وقت ٹی وی باقاعدہ مہم چلاتا رہا۔ بوجوہ ڈاکٹر قدیر خاں کسی دوسرے اخبار میں لکھنے لگے تو جلدی سے ملال کے بعد مجید نظامی صاحب اس طرح ان کا ذکر کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی خبریں اسی شان کے ساتھ نوائے وقت میں چھپ رہی ہیں۔ یہ بڑے آدمی کی نشانی ہوتی ہے کہ فوراً رنجش بھلا دیتا ہے۔ میں نے گزارش کی کہ وہ میرے کالج یعنی اسلامیہ کالج سول لائنز آ کر طلباء کو لیکچر دیں۔ یہ کالج ان کا پہلا کالج بھی ہے۔ پرنسپل داؤ جٹیل خواہش کرتے ہیں کہ چھ ہزار بچے انہیں سننا اور دیکھنا چاہتے ہیں۔ نظامی صاحب نے کہا کہ وہ ضرور اور ضرور آئیں گے۔ یہی نسل تو ہے جس میں سے حمید نظامی اور مجید نظامی جیسے مخلص اور بے باک لوگ پیدا ہوں گے۔ تبھی اس ملک کی تقدیر بدلے گی یقیناً عہد موجود میں وہ سچ کا استعارہ تھے۔

انٹرویو پینل:۔

سعد اللہ شاد' آمنہ الفت' محمد زاہد میاں' احتشام جمیل شامی' عمران شاد۔

سوال: سانگلہ ہل سے لاہور تک کے سفر کے بارے میں آپ کیا بتائیں گے؟

مجید نظامی: میں 3 اپریل 1928ء کو پنجاب کے شہر سانگلہ ہل میں پیدا ہوا۔ میرا تعلق متوسط طبقہ کے ایک دیندار گھرانے سے ہے۔ میرے والد میاں محمد دین صاحب کا کاروبار کرتے تھے جبکہ والدہ گھریلو ذمہ داریاں پوری کرنے کے بعد اپنا زیادہ وقت قرآن مجید کی تلاوت میں گزارتی تھیں۔ میری عمر اڑھائی سال تھی جب میرے والدہ کا انتقال ہو گیا۔ میں نے میونسپل بورڈ سانگلہ ہل کے پرائمری سکول سے ٹاٹ پر بیٹھ کر پانچویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ 1944ء میں ہندو ہائی سکول لاہور سے میٹرک کیا۔ 1946ء میں اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور سے ایف اے کیا۔ حمید نظامی مرحوم نے اپنے ایک دوست کے کہنے پر مجھے اکاؤنٹس کی تعلیم کے لیے ہیلے کالج لاہور داخل کروا دیا۔ میں نے دو سال وہاں گزارے مگر میری فیلڈ اکاؤنٹس تھی ہی نہیں۔ چنانچہ میں حمید نظامی کو بتائے بغیر گورنمنٹ کالج لاہور چلا آیا۔ میں نے بی اے اور ایم اے سیاسیات یہیں سے کیا۔ ایم اے میں میرا تھیسس پریس آف پاکستان تھا۔ 1937ء میں حمید نظامی مرحوم نے مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی بنیاد رکھی اور بانی صدر منتخب ہوئے وہ اس وقت اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کے سٹوڈنٹ تھے۔ اس

تحریک نے اس قدر زور پکڑا کہ 23 مارچ 1940ء کو قائداعظم محمد علی جناح کے حکم پر پندرہ روزہ نوائے وقت کا اجراء ہوا۔ 15 نومبر 1942ء کو نوائے وقت ہفت روزہ ہوا اور 22 جولائی 1944ء سے نوائے وقت روزنامہ کی صورت میں شائع ہونے لگا۔

سوال: نوائے وقت کے ساتھ وابستگی کے ابتدائی عہد کو یاد کر کے کیا محسوس کرتے ہیں؟

مجید نظامی: میں نے ساری زندگی اسی دشت میں گزاری ہے۔ 8 بیڈن روڈ لاہور ہمارے گھر میں نوائے وقت کا دفتر تھا۔ میں پرچہ بھی تہہ کرتا تھا اور پوسٹ کرنے کے لیے چٹیں بھی لگاتا تھا۔ اس کے بعد نوائے وقت کے لیے سرراہے اور ادارتی شذرے بھی لکھتا تھا۔ 1954ء میں میں ایم اے سیاسیات کا امتحان دے کر لندن چلا گیا۔ میں وہاں 8 سال تک نوائے وقت کا نامہ نگار بھی رہا۔ میں نوائے وقت کے لیے شروع میں سینما ہال میں فلموں کے اشتہار بھی لاتا رہا۔ 1962ء میں حمید نظامی کی وفات پر میں لاہور آ گیا اور نوائے وقت کی باگ ڈور سنبھالی۔ حمید نظامی اپنی زندگی میں مجھے نوائے وقت کا ٹیکنیکل ڈائریکٹر جو ایک ایگزیکٹو عہدہ تھا ایک ریزولیشن کے ذریعے مجھے ایڈیٹر مقرر کر گئے تھے۔ پھر جب میں نے حالات کا جائزہ لیا تو مجھے ہر طرف اندھیرا نظر آیا۔ اخبار کے انتظامی اور مالی حالات اچھے نہیں تھے۔ یہاں ایوب خاں کا مارشل لاء بھی تھا۔ حمید نظامی کے لیے یہ گھٹن ناقابل برداشت تھی۔ حمید نظامی اس گھٹن کا شکار ہوئے اس لیے انہیں مارشل لاء کا پہلا شہید بھی کہا جاتا ہے۔

سوال: فوجی حکومت کے دوران اخبارات انتہائی اہمیت اختیار کر جاتے ہیں اور ان کا کردار منفی اور مثبت شدید اثرات مرتب کرتا ہے۔ ایوب خاں کے اوّلین مارشل لاء کے دوران نوائے وقت اور آپ کا کیا کردار رہا؟

مجید نظامی: نواب کالاباغ فاتحہ خوانی کے لیے ہمارے گھر 16 ٹمپل روڈ پر تشریف لائے۔ اس کے بعد ایک دفعہ میں انہیں ان کے گورنر ہاؤس ملنے گیا۔ نواب آف کالاباغ نفیس ترین لوگوں میں سے تھے۔ تھوڑی سی بے تکلفی ہوئی تو وہ مجھے کہنے لگے۔ میں آپ سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا فرمایئے۔ تو وہ کہنے لگے دیکھیے آپ کے بھائی نے جو پالیسی چھوڑی ہے اگر آپ اسے جاری نہیں رکھتے تو (پھر یہ مردانگی نہیں ہوگی) یہ بات انہوں نے مجھے پنجابی میں کہی۔ میں نے ان سے کہا نواب صاحب آپ فکر نہ کریں یہ پالیسی انشاء اللہ جاری رہے گی اور میں نے اس پالیسی کو جاری رکھا۔ ایوب خان نے نوائے وقت کے اشتہار بند کروا دیے۔ ایوب اس وقت دباؤ ڈالتے گئے لیکن ہم بھی عادی ہوتے گئے۔ میرا خیال ہے ایوب خاں کا دور مارشل لاؤں کا بدترین دور تھا۔ بہرحال ایوب خاں مرحوم کے ساتھ ہماری پہلی میٹنگ کراچی میں ہوئی، وہ ہمارے سامنے کرسی پر بیٹھے تھے۔ انہوں نے فرمایا آپ لوگوں کو شرم آنی چاہیے۔ اپنے گریبان میں منہ ڈالیں۔ میں اس وقت سب سے نوجوان ایڈیٹر تھا۔ میں نے کہا جان کی امان ہے! وہ مسکرائے اور کہا امان ہے۔ میں نے کہا مجھے کس بات پر شرم آنی چاہیے آپ بتا سکتے ہیں؟ وہ کہنے لگے کہ آپ بیٹھ جائیں، میرا اشارہ آپ کی طرف نہیں تھا۔ میں نے کہا فیلڈ مارشل صاحب آئندہ آپ جب بات کریں تو اس کی طرف اشارہ کر کے بات کریں کہ تمہیں شرم آنی چاہیے تم یہ کر رہے ہو۔ آپ کو ہم سب کو نہیں کہنا چاہیے تھا۔ خیر انہوں نے بڑی مشکل سے مجھ سے پیچھا چھڑایا اور کہا

آئندہ ایسا ہی ہوگا۔

سوال: بھٹو صاحب سے آپ کی ملاقاتیں ہوتی رہیں اس حوالے سے بتائیں گے؟

مجید نظامی: ذوالفقار علی بھٹو کو ایوب خاں نے وزارت خارجہ سے الگ کیا تو میں اور زیڈ اے سلہری انہیں ملنے گئے، یہی بات یہ ہے کہ بعد میں انکشاف ہوا کہ سلہری صاحب کا تو مشن ہی کچھ اور تھا۔ بھٹو صاحب سے چائے پر گپ شپ کے دوران میں نے کہا بھٹو صاحب آپ پریشان نہ ہوں' آپ نوجوان ہیں ابھی آپ کے لیے بہت وقت پڑا ہے آپ وزارت کی بجائے اپوزیشن میں آئیں۔ اپوزیشن کو تیار کریں اور ایوب خاں کا مقابلہ کریں۔ وہ تیار ہو گئے چنانچہ وہ لاہور آتے رہے۔ گپ شپ ہوتی رہی۔ ہمارے دفتر کے پیچھے ہیکو ریسٹورنٹ میں ہماری ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد ہم نے فیصلہ کیا کہ یوم حمید نظامی ان کی صدارت میں وائی ایم سی اے میں منایا جائے چنانچہ پہلا جلسہ ان کا لاہور میں میں نے کروایا۔ اتنا رش تھا کہ ٹریفک جام ہو گیا۔ جلسہ ختم ہوا تو ہم نے انہیں سیڑھی لگا کر نیلا گنبد والی سائیڈ سے نکالا۔ انہی دنوں ڈاکٹر مبشر حسن نے مجھ سے ایک خط مانگا کہ میں بھٹو صاحب کو ملنا چاہتا ہوں مجھے تعارفی خط دے دو۔ چنانچہ نے انہیں خط دے دیا۔ اللہ جانے انہوں نے کیا گیم کی، وہ بھٹو صاحب سے ملے اس کے بعد پیپلز پارٹی بنی اور ان کے گھر کنونشن ہوا اور پیپلز پارٹی کے سیکرٹری جنرل بن گئے لیکن آپ جانتے ہیں کہ انہوں نے بطور وزیر خزانہ ملک کی معیشت کا کس طرح بیڑا غرق کیا۔ بھٹو صاحب کا دور ہمارے لیے بڑا دلچسپ رہا وہ ہمارے دوست بھی رہے اور مخالف بھی۔

سوال: نوائے وقت کے مکمل طور پر آپ کی دسترس میں آنے کا پس منظر کیا تھا؟

مجید نظامی: 69ء کے آخر کی بات ہے میری بھابھی میرے بھتیجے (عارف نظامی) کو لے کر نوائے وقت کے آفس آگئیں اور کہنے لگیں" آج سے میں آفس میں بیٹھا کروں گی" میں نے کہا ٹھیک ہے" تشریف لائیں" میں اسی دن آفس چھوڑ کر چلا گیا۔ چونکہ میرا اوڑھنا بچھونا ہی صحافت تھا اس لیے میں نے اپنے دو چار دوستوں سے قرضہ لیا اور پرانی انارکلی میں ندائے ملت کے نام سے اپنا روزنامہ اخبار شروع کر دیا۔ میری بھابھی، عارف نظامی اور بڑے بھائی جب اخبار سنبھال نہ سکے تو میرے پاس آئے۔ عارف اور شعیب کہنے لگے" چچا جان آپ آئیں نوائے وقت کو آپ ہی چلا سکتے ہیں" میں نے کہا" آپ جو چاہتے ہیں مجھے لکھ دیں" چنانچہ 71ء میں 2 لاکھ 35 ہزار روپے ادا کر کے میں نے نوائے وقت ڈیکلریشن اور پیشانی ان سے خریدلی اور پھر پالیسی وہی رکھی جو آج بھی قائم ہے۔

سوال: بھارت اور پاکستان کے درمیان خوشگوار تعلقات کی کوششیں ہوتی رہتی ہیں۔ دونوں جانب سے خیر سگالی وفد آتے رہتے ہیں آپ انڈیا کے خلوص نیت کو کس زاویہ نگاہ سے دیکھتے ہیں؟

مجید نظامی: انڈیا ہمارا کبھی دوست نہیں ہوسکتا' انڈیا نے ہی پاکستان کو دو حصوں میں تقسیم کرایا۔ ان کے کمانڈر خود تسلیم کر چکے ہیں کہ ہم نے پاکستان کو توڑا۔ میں سمجھتا ہوں انہوں نے کشمیر کے ذریعے پاکستان کو ریگستان بنانے کی ٹھان رکھی ہے۔ بھارت کشمیر کے دریاؤں پر 26 ڈیم بنا چکا ہے لیکن ہم ابھی تک کچھ نہ کر سکے۔ ہمارے دریا خشک ہو رہے ہیں' لاہور میں پانی بہت ہی نیچے جا چکا ہے لیکن ہم ابھی تک کوئی حکمت عملی وضع نہیں کر سکے۔ قوت بازو کے بغیر ہم کشمیر حاصل نہیں کر سکتے۔ ہماری قوم میں قوت بازو' ہمت اور قوت ایمانی کی

ضرورت ہے۔

سوال: آپ کے بھتیجے عارف نظامی کے ساتھ آپ کے اختلافات کی نوعیت کیا ہے؟

مجید نظامی: عارف نظامی کو 2 لاکھ 35 ہزار روپے دینے کے بعد بھی میں نے بطور رپورٹر اپنے ساتھ رکھا۔ میرا خیال تھا کہ عارف نظامی اور رمیزہ مل کر نوائے وقت سنبھال لیں گے۔ رمیزہ میری (لے پالک) بیٹی ہے۔ میری بیگم کی بھانجی کی بیٹی ہے، بہت ذہین اور لائق بچی ہے۔ رمیزہ گرائمر سکول کے بعد اے لیول کے لیے لندن چلی گئی۔ وہاں بی اے اور دیگر تعلیم حاصل کی۔ میری بیگم نے وفات سے قبل اپنے شیئرز رمیزہ کے نام کر دیئے۔ میں نے بھی اپنے بہت سے شیئرز رمیزہ کو ٹرانسفر کر دیئے۔ عارف کے پاس بھی کچھ شیئرز تھے اور عارف مجھ سے تین لاکھ روپے سے زائد تنخواہ بھی لے رہے تھے مگر رمیزہ کو شیئرز ملنے کے بعد وہ کچھ اور ہی سوچنے لگے۔ ہمارے دوستوں سے ملے اور اپنے حصے کی بات کرنے لگے، مختصر یہ کہ عارف نظامی سے میرا ڈیڑھ کروڑ میں سودا ہو گیا لیکن بعد میں وہ اس سودے کو خیر باد کہہ گئے اور مجھے ایک نہایت ہی قابل اعتراض خط لکھا جو باپ کے برابر چچا کو نہیں لکھا جاتا۔ دکھ اس بات کا ہے کہ اتنی محبتوں کے بعد بھی عارف نے ہائی کورٹ میں ہمارے خلاف کیس دائر کر دیا ہے۔ اعتزاز احسن کو وکیل کیا ہے لیکن ہم جانتے ہیں فتح حق اور سچ ہی کی ہو گی۔

سوال: مسلم لیگ کو آپ نے متحد کرنے کی کوشش کی لیکن اس کوشش کے باوجود مسلم لیگی ایک نہ ہو سکے' اس کی کیا وجہ ہے؟

مجید نظامی: حمید نظامی ایم ایس ایف کے بانی اور پہلے صدر تھے۔ میرا مشن اب بھی وہی ہے جو حمید نظامی کا تھا۔ میں اب بھی مسلم لیگ کو قائداعظم ہی کی جماعت سمجھتا ہوں۔ یہ ق' ن اور ف نہیں۔ مسلم لیگ تو ایک ہی ہے۔ خواجہ رفیق کی برسی پر سعد رفیق مجھے ساتھ لے گئے، وہاں لوگ نواز شریف کے لیے قائداعظم ثانی زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے، وہاں مجھے بھی خطاب کا موقع ملا۔ میں نے کہا کہ نواز شریف قائداعظم ثانی ہو ہی نہیں سکتے کیونکہ ان کی پہلی جماعت مسلم لیگ نہیں بلکہ تحریک استقلال تھی اور لیڈر اصغر خان۔ اور میرا یہ ایمان ہے کہ مسلم لیگ ایک ہی ہونی چاہیے چار چار نہیں۔ میں نے ملک کی خراب صورتحال کو دیکھ کر مسلم لیگ کے تینوں سربراہان کو ایوان نظریہ پاکستان بلایا۔ نواز شریف اور چوہدری شجاعت حسین خود تشریف لائے اور پیر پگاڑا صاحب نے اپنا نمائندہ بھیجا۔ سب سے مثبت کردار مسلم لیگ فنکشنل پیر پگاڑا کا تھا۔ باقی دونوں کے ذاتی اختلافات کی وجہ سے مسلم لیگ ایک نہ ہو سکی۔ میں نے کہا کہ مقابلہ ق لیگ اور ن لیگ کریں گے اور کامیابی کی بوٹی پیپلز پارٹی کی چیل لے اڑے گی۔

سوال: ایٹمی دھماکے کے حوالے سے حکومت پاکستان نے آپ کو اعلیٰ ایوارڈز سے نوازا ہے۔ ہمارے قارئین کی معلومات کے لیے اختصار کے ساتھ بیان فرمائیں۔

مجید نظامی: 21 مئی 1998ء میں وزیراعظم نواز شریف نے مدیران اخبارات وجرائد سے ہندوستان کے ایٹمی دھماکہ کے جواب میں پاکستان کے ردعمل کے بارے میں تبادلہ خیال کیا تو میں نے انہیں مشورہ دیا بلکہ مطالبہ کیا کہ میاں صاحب دھماکہ کر دیں ورنہ قوم اور ہم آپ کا دھماکہ کر دیں گے۔ ایٹمی دھماکہ کے سلسلے میں مجھے قومی خدمات کے اعتراف میں حکومت پاکستان نے بڑے سول ایوارڈ نشان امتیاز سے نوازا۔ اس سے

پہلے ستارۂ پاکستان اور ستارۂ امتیاز بھی مل چکا ہے۔

سوال: معرکہ کارگل میاں نواز شریف اور جنرل پرویز مشرف کے درمیان وجہ تنازعہ بنا۔ آپ سینئر صحافی کی حیثیت سے کیا رائے رکھتے ہیں؟

مجید نظامی: میں حلفاً کہتا ہوں کہ کارگل جنگ کے پرویز مشرف ذمہ دار ہیں۔ میری پرویز مشرف سے کئی ملاقاتیں ہوئیں میں نے ملک کے اہم ایشوز پر ان کی توجہ دلانے کی بہت کوشش کی مگر پرویز مشرف ہمیشہ ملک میں بگاڑ کا باعث بنے رہے۔

سوال: ہر اخبار ایک پالیسی کے تحت چلتا ہے جو دوسرے اخبارات کے مطابق بھی ہوسکتی ہے اور مخالف بھی۔ آپ نوائے وقت کی پالیسی کے بارے میں کیا کہیں گے؟

مجید نظامی: نوائے وقت کی پالیسی ہمیشہ ہی دوسرے اخبارات سے مختلف رہی ہے۔ ہم نے آج تک کسی انڈین اداکارہ کی تصویر شائع نہیں کی۔ اگر مجھے پتہ چل جائے تو میں ایسا کرنے والے کو جرمانہ کرتا ہوں۔ جب تک میرے علم میں نہیں ہوتا، عملہ اپنا لوچ لگاتا رہتا ہے جب مجھے پتہ چل جائے، میں انہیں فارغ کردیتا ہوں' انڈین پالیسی کی حمایت کرنے والے اور صرف پیسے کے لیے لکھنے والے کالمسٹ کی نوائے وقت میں کوئی جگہ نہیں۔ ہمارا اوڑھنا بچھونا ہی نظریہ پاکستان کی اساس ہے۔ ایسی ہی پالیسی ہم نے وقت ٹی وی کے لیے رکھی ہے۔ انڈین چینلز پاکستان میں بین ہونے چاہئیں۔ انڈین اخبارات یہاں نہیں آتے انڈین چینلز بھی نہیں چلنے چاہئیں۔

سوال: صحافت کی دنیا میں ایک اصطلاح 'زرد صحافت' رائج ہے۔ آپ اس کا پس منظر اور پیش منظر کیسے بیان کریں گے؟

مجید نظامی: لفافہ جرنلزم اصل میں زرد صحافت ہے۔ یہ چیز پارٹیشن سے پہلے بھی تھی اور اب بھی ہے' بھٹو دور میں بھی اخبارات کو ایک لفافہ جاری کیا جاتا تھا لیکن الحمدللہ نوائے وقت ہمیشہ محفوظ رہا۔ ایک وزیراعظم کے گھر مشہور کالمسٹ کو بھنہ بھی ملتا تھا اور بوتل بھی۔ بعض کالمسٹ کا کہنا ہے کہ بوتل کے بغیر ہم کالم لکھ ہی نہیں سکتے لیکن نوائے وقت میں ایسے صحافیوں اور کالم نگاروں کے لیے کوئی جگہ نہیں۔

سوال: آپ کی زندگی کے کوئی یادگار واقعات جو آپ ہم سے شیئر کرنا چاہیں؟

مجید نظامی: یحییٰ خان نے ایک بار ایڈیٹرز کو دعوت دی' پنڈی میں۔ مجھ پر اور دوسرے ایڈیٹرز پر ان دنوں مقدمے چل رہے تھے۔ کوثر نیازی مرحوم اس زمانے میں ابھی ایڈیٹر تھے۔ وہ کھڑے ہوئے اور انہوں نے یحییٰ خان سے کہا کچھ ایڈیٹرز پر جو مقدمے چل رہے ہیں انہیں واپس لے لیں۔ یحییٰ خان نے کہا یہ معافی مانگ لیں میں انہیں چھوڑ دیتا ہوں۔ کوثر نیازی نے کہا چونکہ ہال میں خاموشی ہے۔ آپ سمجھیں کہ انہوں نے معافی مانگ لی ہے۔ میں کھڑا ہوگیا، میں نے کہا جنرل صاحب معافی کس بات کی، وہ کہنے لگے یہ جو آپ نے جرم کیا ہے مارشل لاء کورٹ میں آپ کے خلاف مقدمہ چل رہا ہے۔ اگر تم معافی نہیں مانگتے تو جاؤ مقدمہ لڑو۔ میں نے کہا کہاں؟ انہوں نے کہا مارشل لاء کورٹ میں۔ میں نے کہا کہ مارشل لاء نہ مارشل لاء ہے، نہ کورٹ، کورٹ ہے۔ پھر ہم نے مقدمہ فیس کیا اور لڑا مگر معافی نہیں مانگی۔ یحییٰ خاں سے اسی وجہ سے ناراض تھا اور اسی ناراضگی میں ان سے ایوارڈ لینے بھی نہیں گیا۔ ایک دفعہ ہم ان کے گھر جانے پر مدعو تھے ہم

چائے پی رہے تھے انہوں نے دراز کھولا اور ستارۂ امتیاز میرے گلے میں ڈال کر کہا "بچو! ہن تے قابو آیاں ایں ناں"۔

دوسرا واقعہ ہندوستان کے حوالے سے ہے' جب سے پاکستان بنا' بھارت نے پاکستان کو تسلیم نہیں کیا۔ ہر موقع پر پاکستان کی دشمنی اور مخالفت کی ہے۔ جنرل ضیاء الحق جب اپنے دورِ اقتدار میں "کرکٹ ڈپلومیسی" کے تحت بھارت جا رہے تھے تو انہوں نے مجھے بھی ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ اس پر میں نے انہیں جواب دیا "اگر آپ مجنکوں پر بیٹھ کر جانے کے لیے تیار ہیں تو میں ساتھ چل سکتا ہوں' ورنہ آپ معذرت سمجھیں"۔

سوال: محسن پاکستان ڈاکٹر قدیر خاں کے بارے میں ملکی اخبارات و جرائد میں بہت کچھ لکھا گیا نوائے وقت کا کردار بھی نمایاں رہا۔ آپ نوائے وقت اور ڈاکٹر خان کے تعلق پر کیا روشنی ڈالیں گے۔

مجید نظامی: ڈاکٹر قدیر کی رہائی کا اشتہار ہم کئی سالوں دیتے رہے۔ ان کے لیے نوائے وقت کے صفحات حاضر تھے مگر شاید پیسے میں زیادہ کشش ہے وہ رہائی کے بعد ہماری محبتوں کو بھول کر کسی اور اخبار کے لیے کالم لکھ رہے ہیں۔ مجھے اور ڈاکٹر قدیر کو اکٹھے نشانِ امتیاز ملا تھا۔

سوال: آپ صحافتی ذمہ داریوں کو ایک تسلسل کے ساتھ نبھا رہے ہیں آپ علیل بھی ہوئے حتیٰ کہ بائی پاس آپریشن سے بھی گزرے کچھ اس کے بارے میں بتایئے۔

مجید نظامی: جی ہاں میں تین بار بائی پاس کروا چکا ہوں' ایک کے بعد ہی ڈاکٹر ریسٹ کا مشورہ دیتے ہیں۔ لیکن اللہ کا کرم ہے کہ میرا عزم اب بھی جواں ہے۔ ایک حساب سے یہ میری چوتھی زندگی ہے شاید اللہ پاک نے مجھ سے کوئی اور بڑا کام لینا ہے جو ابھی تک اس کی خاص عنایات ہیں مجھ پر۔

سوال: عوامی سطح پر ملکی حالات مختلف اوقات میں مختلف رویوں کو جنم دیتے ہیں آپ اس حوالے سے کیا کہیں گے؟

مجید نظامی: جسے پیٹ ہی نہیں رویہ کیا ہوتا ہے' جس کا مسئلہ آٹا' دال اور روٹی ہے۔ جو قطاروں میں لگ کر چینی خریدتا ہے۔ جس کے لیے دو وقت کی روٹی بچوں کو کھلانا مشکل ہے' اسے رویے کا کیا علم ہے۔ رویہ تو اوپر کی سطح پر لوگ نوٹ کرتے ہیں' غریب غرباء کا اس سے کیا واسطہ۔

سوال: اپنے صحافتی تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں قوم کو کیا پیغام دینا چاہیں گے؟

مجید نظامی: قوم کے نام پیغام میں یہی کہوں گا کہ قائداعظم نے آپ کو ہجوم سے قوم بنایا تھا آپ قوم سے ہجوم نہ بنیں۔

ہم نے یہ ملک اسلام کے نام پر بنایا تھا۔ دو قومی نظریہ ہمیں یہی درس دیتا ہے کہ ہم دو قومیں ہیں۔ ایک ہندو اور ایک مسلمان۔ ہم نے قائد کے عہد کو بھلا دیا۔ اس عہد کو نبھائیں ہم ضرور کامیاب ہوں گے۔ اقبال کی فکر کو لے کر آگے چلیں۔ اللہ ہمیں توفیق دے۔ یہ ہمارے اعمال کی سزا ہے۔ ہمیں اللہ کی طرف سے سزا مل رہی ہے' اس نازک صورتِ حال میں ہمیں اجتماعی توبہ کرنی چاہیے۔ بے شک وہ معاف کرنے والا ہے۔

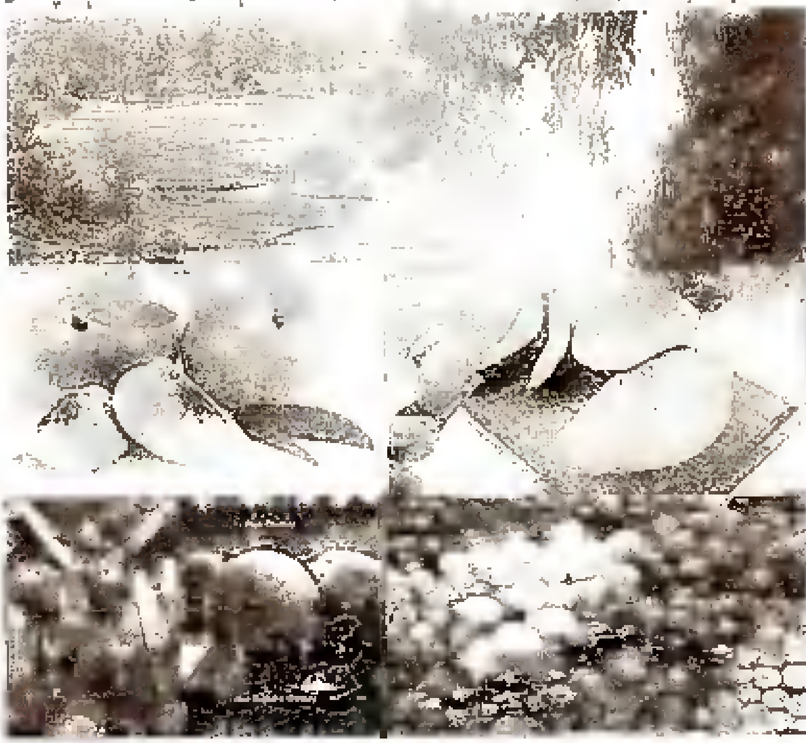
(بشکریہ: پاکٹ آئینہ میگزین)

برسات میں پھلوں سے غذائیت اور شفا حاصل کیجیے!

صغیرہ بانو شیریں

برسات میں پھلوں کا اپنا ہی مزہ ہے، آموں کی بہار، جامن کی سوغات، انگوروں کے سرخ سبز پیلے خوشے، سرخ و سفید انار، ہرے اور پیلے امرود، آلو بخارے، آڑو، سردا، گرما وغیرہ وغیرہ قدرت کے انمول تحفے ہیں۔ نہ صرف جسم کو غذائیت فراہم کرتے ہیں بلکہ امراض میں بھی مفید ہیں۔

پھلوں کا بادشاہ آم ہے، دیکھا جائے تو اس کی ایک ہزار سے زیادہ اقسام پوری دنیا میں چھائی ہوئی ہیں۔ سرخ، ہرے، اورنج اور پیلے رسیلے آم کے جہاں اپنے اپنے رنگ ہیں وہاں ذائقہ بھی مختلف ہے۔ برسات میں آموں کی بہار ہوتی ہے۔ اسے طریقے سے کھایا جائے تو انسانی صحت کو قائم رکھتا ہے۔ صالح خون بناتا ہے۔ سوکھے مڑے جسم کو سڈول توانا کرتا ہے۔ قبض کو دور کرتا ہے۔ پاکستان



میں انور رٹول، دسہری، چونسہ، لنگڑا، سندھڑی، طوطا پری وغیرہ لوگوں میں بہت پسند کیے جاتے ہیں۔ یہ غذا کے ساتھ ساتھ دوا کا بھی کام انجام دیتا ہے۔ عام طور پر خواتین اور نوجوان لڑکوں کو شکایت ہوتی ہے چہرے پر رونق نہیں۔ مرجھایا ہوا چہرہ لگتا ہے، کام کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ قلمی آم ایک مکمل غذا ہے اس میں وٹامنز جیسا کیروٹین انٹی آکسیڈنٹ موجود ہیں۔ گلوکوز بھی ہے پانی بھی۔ اس میں موجود پوٹاشیم ہمارے دل کی دھڑکن کو اعتدال میں رکھتا ہے۔ فاسفورس، فولاد، کیلشیم وغیرہ جسم کو توانائی دیتے ہیں۔ بچوں کی نشوونما کے لیے بہترین غذا ہے۔ چہرے کی رونق اور وزن بڑھانے کے لیے زمانہ قدیم سے طبیب آم اور دودھ تجویز کرتے ہیں۔ اس کا بنا ہوا ملک شیک بھرپور توانائی دے کر حسن میں اضافہ کرتا ہے۔ چہرے پر چمک آتی ہے۔ خواتین اپنی بڑھتی ہوئی عمر میں آم کھا کر عمر رسیدگی کے اثرات دور کر سکتی ہیں۔ آم کا سکواش، چٹنی، مربہ، جیم بھی بنتا ہے۔

آم کھانے سے دل مضبوط ہوتا ہے۔ فالج اور گردوں کے امراض میں بھی مفید ہے۔ اسی طرح ضعف دماغ کو دور کرتا ہے۔ یادداشت کمزور ہو رہی ہو تو آم کھانے سے فائدہ ہوتا ہے۔ آم بلغم کو بھی پتلا کر کے خارج کرنے میں مدد دیتا ہے۔ بار بار پیشاب آئے۔ بلا اختیار پیشاب نکل جائے جب بھی فائدہ دیتا ہے۔ جدید تحقیق بھی آم کی معترف ہے۔ اسکن اور پروسٹیٹ گلینڈ کے کینسر کو روکتا ہے۔ ہڈیوں اور پھیپھڑوں کے امراض میں بھی مفید ہے۔ نیند نہ آتی ہو بے خوابی ہو۔ قوت کی کمی ہو تو آم کھانے سے آرام آتا ہے۔ ہارمونی نظام اور تولیدی نظام کو بھی درست کرتا ہے۔ اس کے کھانے سے پیشاب بھی کھل کر آتا ہے۔ جسم سے ساری کثافت نکلتا ہے۔ اسی لیے یرقان میں بھی مفید ہے۔ میٹھے آم کا تھوڑا سا رس پتلے دہی میں ملا کر پینے سے پیٹ کے امراض میں اور سانس کے مریضوں کو فائدہ ہوتا ہے۔ مردانہ کمزوری میں بھی آم مفید ہے۔ حکیم حضرات مختلف ادویہ کیساتھ آم کے رس میں معجون اور آم پاک بناتے ہیں جو کمزوری کو دور کر دیتا ہے۔ آم کھانے کے بعد دودھ پانی میں ملا کر کچی لسی پی جائے تو آم کی گرمی زائل ہو جاتی ہے۔ اسی طرح آم کھا کر چند جامنیں کھالی جائیں تو آم کا ضرر نہیں ہوتا۔ آم کو کھانے سے پہلے اچھی طرح دھونا چاہیے۔ آم پکانے کے لیے اس میں دوا کی پڑیا رکھی جاتی ہے جو زہریلی ہوتی ہے آم دھو کر پانی میں بھگو دیجیے پھر انہیں فریج میں رکھ کر ٹھنڈا کریں۔ آم کا حلوہ بھی خاص طریقہ سے بنتا ہے۔ عورتوں اور مردوں کے لیے بہت اچھا ہے۔ بانجھ مرد و عورت بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ آم کے اوپر سیاہ نشان ہوتا ہے۔ اسے ہٹا کر صاف کر کے آم چوسنا یا کاٹنا چاہیے تاکہ نقصان نہ ہو۔ اس سے گلے میں خراش ہوتی ہے۔ آم کے پتے، گٹھلی، کچے آم سب فائدہ مند ہیں۔ وٹامن اے کی وافر مقدار اس میں موجود ہے۔ جس سے یہ آنکھوں کے لیے بھی فائدہ مند ہے۔ اندھراتا بھی اس کے کھانے سے دور ہوتا ہے۔ آنکھوں کے اور امراض بھی آم کھانے سے شفایاب ہوتے ہیں۔

آم کا اچار ڈالا جاتا ہے۔ کھٹا اور میٹھا اچار مختلف طریقوں سے بنتا ہے۔ حیدرآبادی آم کا اچار بے حد کھٹا ہوتا ہے۔ آم کی میٹھی چٹنی سرکہ میں بنتی ہے۔ آم کا گڑانبہ بنتا ہے۔ سوجی میں کھٹے آم ڈالا کر گڑ کے ساتھ پکاتے ہیں۔ نرم پتلا سوجی کا کھٹ میٹھا گڑانبہ کھا کر مزہ آجاتا ہے۔ بنگلہ دیش میں آم کا شیرہ بوری پر ڈال کر سکھایا جاتا ہے یہ آم رس سوکھ کر

پاپڑ کی طرح ہوتی ہے اور اس کے ٹکڑے کاٹ کر بازار میں بھی فروخت کیے جاتے ہیں۔ ان کا اپنا ہی منفرد ذائقہ ہوتا ہے۔ بڑے شوق سے لوگ کھاتے ہیں۔

اب تو کیک پر بھی آم سجاوٹ کے لیے لگائے جاتے ہیں۔ آم کی آئس کریم پسند آتی ہے۔ کسٹرڈ میں رسیلے آموں کا اور ہی مزہ ہے۔ پہلے وقتوں میں آم ٹھنڈے کر کے قتلے کاٹے جاتے تھے۔ دودھ کی موٹی بالائی لے کر قتلوں پر لگا کر اس پر اور آم کے قتلے رکھ کر برف میں ٹھنڈے کیے جاتے ہیں۔ بالائی اور آم کی یہ میٹھی ڈش امراء کے ہاں بہت مقبول تھی۔ جسے کھانے سے لطف آتا تھا۔ آج بھی فریزر میں رکھ کر بالائی کے ساتھ آم ٹھنڈے کر کے کھائے جاتے ہیں۔

آلو بخارا

برسات میں سرخ آلو بخارے نظر آتے ہیں پک کر سیاہی مائل ہو جاتے ہیں، برسات میں اس پھل کو جسم و جاں قلب و دماغ کی تسکین سمجھا جاتا ہے۔ اس کا مزاج سرد تر ہے۔ برسات میں حبس اور گرمی سے برا حال ہو جاتا ہے۔ ایسے میں چند دانے آلو بخارے کے کھا لیے جائیں تو طبیعت سنبھل جاتی ہے۔ ٹھنڈے آلو بخارے جسم کی گرمی زائل کرتے ہیں دل جگر کو قوت دیتے ہیں مزاج کا چڑچڑاپن دور کرتے ہیں گرمی کی وجہ سے سر میں درد ہو رہا ہو۔ بے چینی بڑھ جائے، جی متلی، قے، بدہضمی ہو کچھ کھانے پینے کو دل نہ چاہے۔ قبض ہو، تو آلو بخارے کھانے سے طبیعت سنبھل جاتی ہے۔ اکثر لوگ جگر کی گرمی کی شکایت کرتے رہتے ہیں وہ آلو بخارے کھائیں بلڈ پریشر نہ ہو تو کالا نمک پیس کر ہلکا سا چھڑک کر کھانے سے جگر معدے کو تقویت ملے گی، ہائی بلڈ پریشر میں بھی آلو بخارا بہت مفید ہے۔

کچھ لوگوں کو سر چکرانے کی شکایت ہوتی ہے۔ دیرینہ قبض رہتا ہے۔ کان بجتے رہتے ہیں۔ وہ ناشتہ میں روزانہ آلو بخارے کھائیں تو صحت ہو گی۔ حاملہ خواتین کی طبیعت کھانے کی طرف مائل نہیں ہوتی۔ وہ آلو بخارے کھائیں۔ بھوک لگے گی۔ ایک پاؤ آلو بخارے میں دو روٹیوں کے برابر طاقت ہوتی ہے۔ کمزوری ہو، بیماری سے صحت یاب ہوئے ہوں۔ تو آلو بخارے غذا میں شامل کرنے سے کمزوری دور ہو جاتی ہے۔ پرانے طبیب کہتے تھے آلو بخارے کا موسم جیسے ہی شروع ہو تو چند دانے روزانہ کھانے سے بیماریاں نزدیک نہیں آتیں۔ جب تک آلو بخارے دستیاب ہوں ان کو ضرور کھائیں تا کہ صحت برقرار رہے۔

مثانہ میں گرمی ہو، خون کی تیزابیت بڑھ جائے۔ پیٹ میں ہر وقت گیس کی شکایت رہے۔ قبض دور نہ ہوتا ہو۔ صبح اٹھ کر بدمزہ ڈکار آتے ہوں تو صبح کے وقت آلو بخارے کھانے سے پندرہ بیس دن میں یہ شکایت دور ہو جاتی ہے۔ برسات میں گرمی کی شدت سے بدن میں خارش، کھجلی ہو جاتی ہے۔ ایسے میں دو بار دن میں آلو بخارے کھانے اور شربت عناب پینے سے فرق پڑ جاتا ہے۔ آلو بخارے کا مربہ اور جیم بھی بنتا ہے۔ سوکھے آلو بخارے کی میٹھی چٹنی خوش ذائقہ بھوک لگانے والی ہوتی ہے۔ اب تو شادی بیاہ کے کھانے کے ساتھ بھی رکھی جاتی ہے۔ آلو بخارے اور املی کا شربت گرمی کو دور کرتا ہے۔ اس کا شربت بھی بنتا ہے۔ موسم میں ضرور کھائیں۔

انگور

بازار میں ہرے انگور زردی مائل انگور سیاہ انگور کے گچھے نظر آتے ہیں۔ ان کی کئی قسمیں ہیں۔ سندر خانی انگور لوگ مٹھاس اور ذائقہ کے لیے پسند

کرتے ہیں اس میں کیلشیم اور پوٹاشیم فاسفورس، وٹامن اے بی ڈی وغیرہ شامل ہیں۔ کچے انگور کھٹے ہوتے ہیں مگر پک کر ان میں ذائقہ اور مٹھاس آجاتی ہے۔ پیاس کی شدت ہو تو انگور کھانے سے ختم ہوتی ہے۔ انگور ہمارے جسم کو نہ صرف طاقت دیتا ہے بلکہ عمدہ اور صالح خون بھی پیدا کرتا ہے۔ جسم کی تھکاوٹ اور ناتوانی کو دور کرتا ہے۔ سوکھے ہوئے انگور کو کشمش کہتے ہیں اس طرح بڑے انگور سے منقہ پورے سال دستیاب ہوتی ہے۔ کمزور لوگ انگور کھا کر جسم کو فربہ کر سکتے ہیں۔ انگور کا سرکہ بنتا ہے۔ جو طبی فوائد سے بھرپور ہوتا ہے۔ خواتین کی اندرونی بیماریوں میں انگور کام دیتا ہے۔ اس کے کھانے سے لیکوریا جیسے امراض بھی صحیح ہو جاتے ہیں۔ اس میں انگور کا رس نکال کر پلاتے ہیں۔ اس میں اگر تھوڑا سا شہد ملا لیا جائے تو اور بھی فائدہ ہوتا ہے۔

کچھ لوگوں کے جسم میں عجیب سی بدبو رچ جاتی ہے۔ لوگ پاس بیٹھتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ یہ بدبو برسات میں زیادہ ہو جاتی ہے۔ انگور کے موسم میں چار چمچے انگور کا رس اور چھ چمچے گلاب کے عرق ملا کر پورے جسم پر نہانے سے پہلے لگایا جائے اور دو تین ہفتہ پابندی کی جائے تو بدبو ختم ہو جاتی ہے۔

پہلے زمانے میں بیگمات کا دل گھبراتا تھا خفقان کی شکایت ہوتی تھی۔ طبیب ایسے میں مٹھی بھر کشمش کے دانے گلاب کے عرق میں ڈال کر رات کو چاندی کے پیالے میں جالی سے ڈھک کر آسمان کے نیچے رکھتے تھے صبح نہار منہ ایک ایک دانہ کشمش کا کھا کر گلاب کا عرق پلاتے تھے۔ گھبراہٹ بے چینی دور ہو جاتی تھی۔ انگور کا شربت دل و دماغ کے لیے مفید ہے۔ چھوٹے بچوں کے منہ میں چھالے ہوں تو انہیں انگور کا رس ایک چمچہ صبح شام پلائیں۔ گردے اور مثانے کی پتھری کے لیے انگور کا رس دن میں تین بار پلانے سے فائدہ ہوتا ہے۔ انگور کا مربہ بنتا ہے۔ جن بچوں کو سبق یاد نہ ہوتا ہو حافظہ کمزور ہو ان کو چمچہ بھر کشمش اور تین سے پانچ بادام رات کو پانی میں بھگو کر صبح کھلانے سے حافظہ تیز ہوتا ہے۔ اس کا پانی بھی پی لینا چاہیے۔ ٹھنڈا پانی، بلیک پرنس انگور میٹھے خوش ذائقہ ہوتے ہیں۔ آپ موسم میں انگور ضرور کھائیں۔ چاٹ میں کسٹرڈ میں ڈالیے۔

امرود

برسات میں امرود نظر آتے ہیں گدرائے ہوئے میٹھے پیلے امرود سب کو پسند ہیں۔ گلابی رنگ کے امرود، ہرے امرود دکانوں میں سجے ہوتے ہیں۔ اسے آپ غریبوں کا پھل کہہ سکتے ہیں۔ اس میں بیٹا کیروٹین، کیلشیم، فاسفورس، فولاد، پوٹاشیم، چکنائی، نشاستہ، وٹامن سی موجود ہے۔ امرود خود تو ہاضم نہیں مگر ہاضمہ کو درست رکھنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے۔ دل کو تقویت دیتا ہے۔ موج ہونے کی وجہ سے دل کی تکالیف میں ڈاکٹر بھی امرود کھانے کی ہدایت کرتے ہیں۔ اکثر برسات میں امرود میں کیڑے پڑ جاتے ہیں۔ امرود کاٹ کر دیکھ لیں اندر سے خراب تو نہیں۔ پھر کھائیے ورنہ نقصان ہوگا۔ سردیوں میں امرود میں خرابی نہیں ہوتی مگر برسات کے موسم میں اکثر پودوں میں کیڑے لگ جاتے ہیں۔ دانتوں مسوڑھوں کی بیماریوں، دانتوں سے بدبو اور خون کا نکلنا ناک سے نکسیر بہنے میں امرود وٹامن سی کی وجہ سے غذا اور دوا سمجھا جاتا ہے۔ یادداشت کی کمی ہونے لگے۔ الزائمر جیسا مرض لاحق ہو تو دوا کے ساتھ ساتھ آپ امرود کا استعمال کریں۔ قدرت کے اس بھرپور تحفے سے فائدہ اٹھائیے۔

ہمارے ہاں عام طور پر امرود کی چاٹ بنتی ہے۔ اس میں نمک کالا نمک مرچ لیموں چھڑک دیتے ہیں۔ چاٹ مسالہ تھوڑی سی چینی بھی ملائی جاتی ہے۔ مگر

بڑھنے کے ساتھ خواتین بھی جلد کی خوب صورتی کے لیے جھریوں سے نجات کے لیے وزن کم کرنے کے لیے پریشان رہتی ہیں۔ امرود غذا میں شامل کریں۔ اس کے ساتھ امرود کے چند پتے پانی میں اُبال کر چہرے کو دھویئے۔ امرود کے پتوں کا رس آپ ملتانی مٹی، شہد اور زیتون میں ملا کر بطور ماسک بھی لگا سکتی ہیں۔ امرود کی خوبیوں سے بھرپور فائدہ اُٹھایئے۔

جامن

برسات کے موسم میں پھوڑے پھنسی دانے جلدی بیماریاں ہو جاتی ہیں۔ قدرت نے خون صاف کرنے کے لیے اس موسم میں خاص طور پر جامن اور نیم کو متعارف کرایا ہے۔ سیاہی مائل اودے ننھے گٹھلی والے پھل کی غذائی اہمیت جامن کی شکل میں سامنے آتی ہے۔ اس کا گودا اور پھل دونوں ہی کارآمد ہیں۔ شوگر کے مریضوں کے لیے ایک نایاب تحفہ اس کی گٹھلیاں بھی سکھا کر تمام سال کام آتی ہیں۔ انسانی جسم کے اندر گرمی غیر ضروری حرارت کو جامن کنٹرول کر لیتا ہے یہ خون بھی صاف کرتا ہے۔ گرم مزاج کے لیے بے حد مفید ہے۔ اس کے اندر سائیٹرک ایسڈ موجود ہے جو نہ صرف بھوک بڑھاتا ہے معدے اور آنتوں کو تقویت دیتا ہے۔ جلن اور خارش کو بھی دور کرتا ہے۔ گرمی کی وجہ سے پیشاب جل کر سرخ رنگ کا آئے تو جامن کھانے سے آرام آتا ہے۔ قے، متلی، ہیضہ جیسی بیماری میں کام کرتا ہے۔ جامن دھو کر کسی برتن میں ڈال کر معمولی سا نمک چھڑک کر خوب ہلا کر نرم کر کے کھانے چاہئیں اس طرح جامن کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ کچھ لوگ تھوڑی سی سونٹھ پیس کر رکھ لیتے ہیں۔ وہ بھی نمک کالی مرچ کے ساتھ جامنوں پر لگا کر کھاتے ہیں۔ جامن نہ صرف جسم کی کمزوری دبلے پن کو دور کرتا ہے بلکہ پیٹ درد میں بھی کام آتا ہے۔ جامن کی گٹھلی سکھا کر نمک کالی مرچ ملا کر منجن بنایا جائے، دانتوں کی جملہ بیماریوں میں مفید ہے۔

انار

انار کو جنگ کا پھل کہا جاتا ہے۔ بیدانہ اور قندھاری انار کے دانے چاٹ میں ملائے جاتے ہیں۔ جسم میں خون پیدا کرتا ہے۔ پیاس اور بے چینی کو دور کرتا ہے۔ دل جگر کو تقویت دیتا ہے اگر کمزوری اور بیماری کی وجہ سے ہونٹوں کا رنگ سفید ہو گیا ہو تو روزانہ ایک انار کھانے سے ٹھیک ہو جاتا ہے۔ رگوں میں کھچاؤ ہو وہ بھی انار سے ٹھیک ہوتا ہے۔ انار کے دانے نکال کر نمک کالی مرچ کے ساتھ کھانے سے بھوک لگتی ہے۔ پیشاب کھل کر آتا ہے۔ سرخ اور سفید کا رس کینسر میں مفید ہے۔ دل کو طاقت دیتا ہے۔ انار کا شربت اور جوس اب بازار میں دستیاب ہے۔ تازے انار کی افادیت زیادہ ہے۔

آڑو

آڑو ایک صحت بخش پھل ہے۔ ہماری جلد کو شاداب رکھتا ہے۔ سانس کی تکالیف، دمہ، ہائی بلڈ پریشر، گردے کے ورم، خون کی کمی، اعصابی کمزوری، تیزابیت وغیرہ میں شفا بخش ثابت ہوا ہے۔ آڑو کا جوس اور جیم بھی ملتا ہے آڑو خواتین کے حسن کی بھرپور حفاظت کرتا ہے۔ اسے کھایئے بھی اور اسے لگایئے بھی۔ آڑو کا اسکرب اور ماسک جلد کو تازگی دیتا ہے۔ برسات میں بعض دفعہ آڑو میں بھی کیڑے پڑ جاتے ہیں۔ سفید باریک کیڑے ہوتے ہیں ان کو کاٹ کر دیکھ کر کھایئے۔ پیٹ میں کیڑے ہوں تو شام کے وقت تین چار آڑو آٹھ دس دن کھانے سے نکل جاتے ہیں۔ بھوک لگتی ہے۔ ہاضمہ اور معدہ ٹھیک رہتا ہے۔ آڑو کا فیک آپ سپرائٹ یا سیون اپ کے ساتھ بنائیں تو نیا ذائقہ آتا ہے۔ آپ آڑو چاٹ میں بھی ڈال سکتے ہیں۔



حقیقت کہانی

بچھووا

جاوید راہی



اب مجھے بچھو کی تلاش تھی جس کیلئے میں نے بہت سے پرندے پکڑنے والوں سے رابطہ کیا۔ پہلی بار معلوم ہوا کہ جانوروں، پرندوں کے علاوہ حشرات بھی برائے فروخت تھے مگر بچھوؤں کے شکاری سامنے نہ آئے۔ اس دوران میں ایران کے دو چکر لگا چکا تھا اور میں نے پرندے امپورٹ ایکسپورٹ کرنے کا لائسنس بھی حاصل کر لیا تھا۔

جانوروں کے سوداگر کی کہانی، جو ایک روز اپنے جال میں پھنس گیا تھا

میرے سامنے مچھ جیل سے آیا عمر قید پانے والے قیدی کا خط پڑا تھا، جس میں اس نے استدعا کرتے ہوئے لکھا تھا کہ میری پیروی کرنے والا پیچھے کوئی نہیں، میں سراسر بے گناہ ہوں مگر پولیس کا بنایا خود ساختہ کیس اور پولیس کے ہی زیر اثر گواہان کی جھوٹی گواہی کے طفیل مجھے عمر قید کی سزا ہو گئی۔ قیدی نے اپنا نام اعجاز علی بلوچ لکھا تھا اور بے شمار منت سماجت کرتے ہوئے یہ التجا کی تھی کہ میں مچھ جیل میں آکر اس سے ہونے والی ناانصافی اس کی زبانی سن کر جیل کہانی میں عوام الناس تک پہنچاؤں۔

بلوچستان خاص کر مچھ جیل کے گردونواح میں جون کی گرمی کو جھیلنا مقامی لوگوں کا ہی حوصلہ ہے۔ بہرحال میں کسی نہ کسی طرح کوئٹہ پہنچا اور ایک اچھے ہوٹل میں کمرہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ آئی جی جیل خانہ جات بشیر احمد بول زئی سے رابطہ ہوا اور انہوں نے اپنے پی اے حاجی سعید اللہ کے ذریعے مچھ جیل کے سپرنٹنڈنٹ سکندر خان کاکڑ تک رسائی میں راقم الحروف کی مدد فرمائی، جنہوں نے مچھ جیل آنے کی اجازت دیتے میرے لئے آسانیاں مہیا کر دیں۔ کوئٹہ سے بذریعہ گاڑی میں امتیاز بلوچ سے ملنے چل پڑا جو اپنی بے گناہی کی کتھا مجھ سے شیئر کرنا چاہتا تھا۔

مچھ جیل کی جانب جاتے ہوئے مجھے ملک کے معروف دانشور، کالم نگار، ڈاکٹر، شاعر اور اللہ کے نیک ولی جناب جبار مرزا یاد آ گئے۔ جب وہ 1999ء میں روزنامہ مرکز اسلام آباد کے ایڈیٹر ہوا کرتے تھے۔ ان کا ایک کالم بچھو نشہ ''آن دی ریکارڈ'' میں پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ جناب نے اپنے کالم میں بچھو نشہ کے بارے میں بتایا تھا جو ہیروئن کے نشہ کے بعد معرض وجود میں آیا تھا اور جس کو کسی ہیروئنچی کیمیاگر نے متعارف کروایا ہو گا، جب یہ نشہ متعارف ہوا مری اور گردونواح میں بچھو کی نسل ختم کرنے پر ہیروئنچی حضرات کمربستہ ہو گئے اور باقاعدہ بچھو کی تجارت شروع ہو گئی، براؤن بچھو 75 روپے اور کالا بچھو 100 روپے میں فروخت ہونے لگا۔ ہیروئنچی حضرات بچھو کو قابو کر کے کسی بند کمرے یا اپنی چادر میں خود کو چھپا کر دہکتے کوئلے پر بچھو کو رکھتے اور اس کے جلتے وجود سے اٹھنے والے زہریلے دھوئیں کو کسی نلکی یا پائپ سے اپنے اندر گھسانے لگتے، دو چار سوٹے لیتے ہی نیم بیہوشی کے عالم میں کھو جاتے۔ بچھو نشہ کے بعد چھپکلی پاؤڈر اور نجانے کیا کیا ان ہیروئنچی کیمیاگروں نے خود کو غرق کرنے کیلئے ایجاد کر ڈالا۔ بولان تک پہنچ کر میں نے ڈرائیور سے دریافت کیا کہ اب کتنا سفر رہ گیا ہے؟ اس نے جواباً بتایا کہ ہم نے آدھا راستہ طے کر لیا ہے یعنی کوئٹہ سے مچھ جیل کا دورانیہ تقریباً پونے دو گھنٹے کا تھا۔ قیامت خیز گرمی کی بدولت گاڑی کا اے سی بھی برائے نام ٹھنڈک کر رہا تھا۔ چند منٹ بولان میں ٹھہرنے کے بعد سفر دوبارہ شروع کر دیا۔

جیل آبادی سے باہر تھا، بڑے گیٹ پر پہنچ کر میں نے سکندر خان کاکڑ کو اپنے آنے کی اطلاع بھجوائی زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا، میں ڈرائیور کو انتظار کرنے کا کہتے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے ہمراہ جیل کا بڑا گیٹ عبور کر کے خان صاحب کے آفس میں آن بیٹھا۔ وہ شاید راؤنڈ پر تھے، ان کے آفس سے جیل کا اندرونی منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ مچھ جیل میں ہمارے پنجاب کی جیلوں سے بہت کم رونق تھی۔ ہماری جیلوں کی کیا بات، چاروں جانب قیدیوں کی آمد و رفت، چھوٹی سے چھوٹی جیل میں بھی تین سے چار ہزار قیدی تو موجود ہی ہوتے ہیں، لیکن مچھ جیل جو کافی بڑی تھی اس میں تھوڑے بہت ہی قیدی ادھر ادھر نظر آ رہے تھے۔ یکدم بوٹوں کی بھاری آواز اور ہوشیار باش کی صدا گونجی، سکندر خان کاکڑ اپنے آفس میں داخل ہوئے۔ میں نے اٹھ کر ان کا بڑھا ہاتھ تھامتے اپنا تعارف کروایا اور مچھ جیل آنے کی وجوہات بیان کی۔ انہوں نے فون پر چائے وغیرہ کا آرڈر دیا اور مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ''پنجاب میں تو اتنی گرمی کبھی نہیں پڑی ہو گی؟'' ''جی آپ نے بالکل درست فرمایا ہے۔'' میں نے جواب دیتے وہ لیٹر نکال کر انکے سامنے رکھ دیا۔ انہوں نے کھول کر اسے بغور پڑھا اور بولے ''آئی جی صاحب سے بات ہوئی ہے آپکی اس سلسلہ میں؟'' میں نے نفی میں جواب دیا۔ پھر وہ فون پر بات کرنے لگے۔

دوسری طرف سے شاید امتیاز بلوچ تک میری بیلو ہائے کو یقینی بنا دیا گیا تھا کیونکہ انہوں نے ڈپٹی صاحب کو عمر قید پانے والے قیدی امتیاز بلوچ کو سیل سے اپنے آفس بلا کر بٹھانے کو کہا تھا۔ چائے میں بڑا اہتمام کیا گیا تھا۔ "سر ہمارے پنجاب کی جیلوں میں تو خاصی گہما گہمی ہوتی ہے مگر یہاں ماحول خاصا پرسکون دکھائی دے رہا ہے۔"

"راؤ صاحب، دراصل یہاں کی جیلوں میں قیدیوں کی تعداد پنجاب کی جیلوں سے قدرے کم ہوتی ہے۔ جیسا کہ میری اس جیل میں تقریباً نو سو سے ہزار گیارہ سو تک مختلف قیدی ہیں۔ ہماری جیلوں میں قیدیوں کے ساتھ خاصا بہتر سلوک کیا جاتا ہے۔ یہاں بہت سی سہولتیں فراہم ہوتی ہیں قیدیوں کو، بلوچستان حکومت قیدیوں کو بہتر آگاہی فراہم کرنے میں کوئی کسر نہیں رکھتی، مثلاً جیل کے اندر تعلیم کے ساتھ ساتھ کمپیوٹر اور دینی تعلیم کی طرف بھرپور توجہ دی جاتی ہے۔ قیدیوں کی تعداد کم ہونے کی بنا پر کھانا بھی معیاری اور قیدیوں کی اصلاح کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے۔ خاص کر مچھ جیل کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہاں غفار خان، اچکزئی و دیگر نامی گرامی سیاستدان جن میں اکبر بگٹی بھی شامل ہیں اپنی اپنی قید کاٹ چکے ہیں۔" اور بھی کئی معاملات پر گفتگو جاری رہی کہ اتنے میں ڈپٹی صاحب نے آکر بتایا کہ امتیاز بلوچ ان کے آفس میں آچکا ہے۔

"ٹھیک ہے آپ ان کو لے جائیں اور ان کی ملاقات اپنی موجودگی میں کروا دیں۔" اس کے ساتھ سکندر صاحب نے انہیں مجھے ساتھ لے جانے کا اشارہ کیا، میں ان کا شکریہ ادا کرتے ڈپٹی صاحب کے ہمراہ آفس سے باہر نکل آیا۔ ڈپٹی کا آفس کا کر صاحب کے آفس سے ذرا ہٹ کر تھا۔

جون کا مہینہ اور پھر چاروں جانب سنگلاخ پہاڑ، پچاس سے اوپر درجۂ حرارت جس نے مجھے دہلا کر رکھ دیا تھا، ٹھنڈا دل سے بار بار میں چہرہ پر آیا پسینہ صاف کرتے ڈپٹی کے قدم سے قدم ملاتا ان کے آفس کی جانب بڑھ رہا تھا۔

ڈپٹی کے آفس میں داخل ہوتے میری نظر اس قیدی پر پڑی جو دو پولیس وارڈنز کے درمیان نظریں جھکائے کھڑا اپنے پیروں کی جانب دیکھ رہا تھا۔ ڈپٹی نے اپنی کرسی پر بیٹھتے مقامی بولی میں دونوں سے کچھ کہا، وہ سیلوٹ کرتے باہر چلے گئے۔ اب میں اور امتیاز بلوچ آمنے سامنے کھڑے ایک دوسرے کا جائزہ لے رہے تھے۔ دبلا پتلا چالیس سے اوپر کا امتیاز بلوچ جس کے چہرے پر جیل کی زندگی کے آثار نمایاں دکھائی دے رہے تھے، بڑی دھیمی آواز میں بولا، جناب آپ کی غریب پروری کا تاحیات احسان مند رہوں گا۔ آپ میری گزارش پر لاہور سے بلوچستان اس قیامت کے موسم میں تشریف لائے ہیں، میرے پاس کوئی الفاظ نہیں جو میں آپ کی نذر کروں۔ میں نے ڈپٹی صاحب سے اسے بیٹھ جانے کی اجازت دینے کی استدعا کی، انہوں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ شکریہ کہتے کارپٹ پر آلتی پالتی مارتے میرے سامنے بیٹھ گیا۔

"کب سے میری کہانیاں یعنی حقیقت کہانیاں پڑھ رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

جی باقاعدگی سے تو نہیں دو چار بار ہی پڑھی ہیں۔ ملاقاتی حضرات اپنے عزیزوں کی ملاقات کے دوران اخبارات، رسائل بھی جاتے ہوئے چھوڑ جاتے ہیں جو پڑھنے کو مل جاتے ہیں۔ آپ کی تحریر کردہ حقیقت کہانیاں پڑھنے کے بعد میں نے اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافی بارے اپنی آواز اعلیٰ حکام تک پہنچانے کا فیصلہ کیا اور آپ کو خط لکھا تھا۔ اس نے پُرامید نظروں سے میری جانب دیکھتے بتایا۔

"ہاں تو شروع کریں......؟" میں نے اپنے آگے رکھے پانی کے گلاس کو ایک طرف کرتے اسے متوجہ کیا۔

"میری بدقسمتی کا آغاز اس وقت ہوا جب نیوکس ہائی سکول کے ٹیچر بشارت علی چوہان صاحب سے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ یہاں میں عرض کرتا چلوں کہ ہم بلوچوں کی آبادی شہر کے وسط میں ایک ہی جگہ آباد تھی، ہمارے قبیلہ کے مرد و خواتین مل کر کام دھندا کرتے آرہے ہیں۔ یہ سلسلہ ہماری کئی پشتوں سے چلا آرہا ہے۔ میرے رشتہ دار مرد و عورتیں زیارتوں کی آڑ میں ایران سے واپسی پر بہت سارا مال اپنے ساتھ لے آتے اور خوب منافع کماتے۔ میرا ارادہ بھی یہی تھا، جو مجھے چوہان صاحب کے گھر لے گیا۔ بشارت علی چوہان کا مکمل خاندان اہل تشیع تھا اور وہ ضلع بھر کی تنظیم کے عہدیدار بھی تھے۔ ان کے جاری کردہ سفارشی لیٹر پر ایران کا ویزہ آسانی سے لگ جاتا تھا سو ایک دو بار چکر لگانے پر چوہان صاحب نے سفارشی خط دے دیا جو تفتان کی امام بارگاہ کی تنظیم کے نام تھا۔ میں تفتان اسٹیشن کے کوارٹروں میں جعفری صاحب سے ملا۔ انہوں نے خط پڑھ کر میرا پاسپورٹ اور شناختی کارڈ آٹھ تصویریں اور پانچ سو روپے لے کر رکھ لئے اور میرا رابطہ نمبر لکھ کر ویزہ لگ جانے کی اطلاع دینے کا وعدہ کر کے مجھے اجازت دے دی۔ تقریباً دس روز بعد مجھے فون آیا کہ تمہیں ٹھوکر نیاز بیگ ونگ جسے سید اعجاز حسین شاہ نقوی کمان کریں گے، کے ساتھ شامل کر دیا گیا ہے۔ میں نے دھڑکتے دل سے اس نمبر پر فون کیا۔ دوسری طرف سے بولنے والے خود اعجاز نقوی تھے، بڑی محبت سے پیش آئے اور مجھے ایک ہفتہ بعد آنے کا وقت بتایا۔ آنے جانے کا خرچہ مع کھانا پینا رہائش ساڑھے آٹھ ہزار روپے فی کس بتا کر انہوں نے فون بند کر دیا۔ میں نے ایران جانے کی تیاری شروع کر دی۔ پاکستان سے الیکٹرانکس کا سامان جس میں ٹیپ ریکارڈر اور ایسا ہی چھوٹا موٹا سامان جو ہمارے لوگ لے کر جاتے تھے وہ میں نے بھی تھوڑا سا ساتھ رکھ لیا اور وقت مقررہ پر ریلوے اسٹیشن آ گیا۔ زیادہ تلاش نہ کرنا پڑا ہمارا زیارتی قافلہ ایک فرسٹ کلاس کے ڈبہ ۲۵ افراد پر مشتمل تھا جس میں سات خواتین اور میرے سمیت اٹھارہ مرد تھے۔

تمام زائرین کیلئے جوس، بسکٹ، منرل واٹر اور ایسی ہی خشک اشیائے خورونوش کا بندوبست تھا، گیس کے سلنڈر اور برتن، مصالحہ جات، دالیں، چاول، آلو پیاز وغیرہ طالب اور حنیف نامی لڑکوں کے کنٹرول میں تھا جو ٹرین کے ڈبہ میں ہی کھانا بنانے کے ماہر تھے۔ میرے سوا تمام زائرین ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ ایک دو ملاقاتوں کے بعد میں بھی ان میں سے دو چار کا واقف بن چکا تھا۔ اعجاز نقوی واقعہ کربلا کی تفصیلات بہت ایمان افروز انداز میں پیش کرتے تھے۔ میرا مسلک سنی تھا مگر میں نے ان پر یہ بات سرے سے ثابت ہی نہیں ہونے دی تھی۔

کوئٹہ پہنچ کر رات پلیٹ فارم پر بسر کی اور دوسرے روز تفتان کیلئے ٹرین میں سوار ہو گئے۔ رات کو بازار جا کر نقوی صاحب نے کھانے پینے کے سامان کے علاوہ فروٹ بھی وافر مقدار میں خرید لیا تھا۔ اگلا سفر خاصا خوشگوار ثابت ہوا۔ ٹرین میں صرف زائرین تھے یا ایسے مسافر جو راستے میں آنے والے چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں پر اتر چڑھ رہے تھے۔

دوپہر کا کھانا ٹرین میں ہی کھایا۔ تقریباً چار بجے گاڑی تفتان بارڈر پر پہنچ کر رک گئی، نقوی صاحب نے مجھے سب کے پاسپورٹ دیتے لسٹ بنانے کا کہا۔ میں نے ترتیب وار لسٹ بنا کر پاسپورٹ امیگریشن کے سپرد کر دیئے۔ رش اتنا بھی زیادہ نہیں تھا کہ دھکم پیل کا سلسلہ چل نکلا۔ اس دوران میں

تھوڑے فاصلے پر بنے چھپروں کے بازار کی طرف چل پڑا چاروں جانب دوکانوں پر طرح طرح کا ایرانی سامان اور کھانے پینے کی اشیاء موجود تھیں۔ ایک ہوٹل پر تازہ کباب اور قہوہ پیا اور گھوم پھر کر واپس اسٹیشن پر پہنچ گیا۔ ابھی تک بارڈر کراس کرنے کی اجازت نہیں ملی تھی۔ ہمارے گروپ کے لوگ اسٹیشن پر بنے لوہے کے شیڈ کی چھاؤں میں بیٹھے اِدھر اُدھر کی باتوں میں مصروف تھے۔ میں بھی ان کے پاس آبیٹھا۔ تھوڑی دیر بعد سب کے پاسپورٹ مکمل ہوکر مل گئے ہم بھی دوسرے لوگوں کی طرح ٹرین میں آبیٹھے۔ آخر کار ٹرین رینگتی ہوئی ایران کی حدود میں داخل ہوگئی۔ یہاں بھی امیگریشن کا معاملہ درپیش تھا۔ میرا ایک جس میں برائے نام الیکٹرانکس کا سامان تھا، وہ میں نے لاپرواہی سے سب کے سامان میں گھسیڑ رکھا تھا اور بے فکر ہوکر ایران کی سرحد میں اِدھر اُدھر سٹالوں پر چکر کاٹنے میں مصروف تھا۔ ہمارے گروپ میں جتنے بھی لوگ تھے وہ کئی کئی بار ایران آچکے تھے اس لئے انہیں ساری اونچ نیچ کا پتہ تھا۔ اعجاز نقوی صاحب امیگریشن سے نپٹ کر ہمارے درمیان آگئے اور سب کو اگلے سفر کے بارے میں سمجھانے لگے۔ طالب، نوشابہ کے ٹن پیک سب کو بانٹ رہا تھا۔ پینے والے مشروب کو ایران میں نوشابہ کہا جاتا تھا۔ چیکنگ مکمل ہونے پر ٹرین زاہدان کی جانب روانہ ہوگئی۔ راستے میں ایک دو بار تھوڑی دیر کیلئے گاڑی رُکی اور آخر کار زاہدان کے پررونق اسٹیشن پر انجن خاموش ہوگیا۔ زائرین کی آمد پر ایران کی فلاحی و اسلامی تنظیمیں ہاتھوں ہاتھ زیارتوں پر آئے لوگوں کو سنبھال رہی تھیں۔ آرام دہ بسوں کی لائنوں میں اپنی تنظیموں کے نشان آویزاں تھے اور وہ لوگ اپنے اپنے گروپ آپس میں تقسیم کر رہے تھے ہمیں جو بس تہران کیلئے ملی۔ وہ وطیانہ بسکٹ فیکٹری کی جانب سے تھی۔ ہمارا گروپ وطیانہ بسکٹ بنانے والی کمپنی کا مہمان تھا۔ بس میں ہمارے سوا میرجاوا سے بھی زائرین تھے۔ تقریباً پچاس لوگوں کو لے کر بس اپنے اگلے سفر پر روانہ ہو چکی تھی۔ بس میں پانی اور قہوہ کا بہترین اہتمام تھا اور پونے دو گھنٹے کی مسافت کے بعد بس ایک خوبصورت مسجد کے دالان میں آرکی۔ مختلف اقسام کے پکے پکائے تیار کھانے ڈبوں میں بند تھے۔ وہ ایرانی روٹیوں کے ہمراہ تمام لوگوں میں تقسیم کردیے گئے۔ بند ڈبوں میں مٹن، چکن سبزیاں اور سفائی سالن تھا۔ بھوک برائے نام تھی مگر کھانے کا لطف آیا۔ جہاں بھی ہماری بس رکتی مقامی لوگ بس کو گھیر لیتے اور کھانے پینے کی چیزوں کے ڈھیر لگا دیتے۔ تمام رات طیار (بس) محو سفر تھی، صبح فجر سے قبل تہران سٹی میں داخل ہوئی سامنے امام خمینی کا روضہ جعہ نور کی مثال نظر آیا۔ بس روضے کے اطراف آدھا چکر کاٹتے ایک بڑی شاہراہ کی جانب مڑ گئی۔ کافی سڑکیں بدلتے ایک وسیع میدان نظر آیا جو زائرین سے اَٹا پڑا تھا۔ ہماری بس کا منتظم ہمیں ایک جگہ اکٹھا رہنے کی تلقین کر رہا تھا۔ وہ ایک پاکستانی تھا اور ایران میں تعلیم کے حصول کیلئے رہ رہا تھا۔ اس کا نام احمد تھا۔ دوران سفر اس نے تمام زائرین کی لسٹ مرتب کر لی تھی اور باقاعدہ نام بول کر تعداد پوری کر رہا تھا۔ سب لوگ جو بس میں سے نکل کر ایک طرف کھڑے ہو چکے تھے، ان کو مخاطب کرتے اس نے بتایا کہ یہ بس پندرہ روز تک ان کے استعمال میں رہے گی اور رہائش وطیانہ بسکٹ فیکٹری میں ہو گی اور سب کے پاس یہ کارڈ رہے گا۔ اگر کوئی بھول ہوجائے تو کارڈ کو دکھانے پر آپ اپنی رہائش پر پہنچ جائیں گے۔ ایسی ہی کئی ضروری باتوں کے بعد ہم سب میں کارڈ تقسیم کیے گئے اور ساتھ ہی کمبل بھی اور

چھوٹے چھوٹے قالین بھی، جو شاید ہمارے بستر تھے پھر دوبارہ ہمارا قافلہ بس میں سوار ہو کر وہاں چل پڑا۔ یہ بہت بڑی فیکٹری تھی جس کے کئی ایک پورشن تھے، ہمیں ایک بہت بڑے ہال میں شفٹ کر دیا گیا۔ مقامی میزبان جن میں خواتین اور اسکاؤٹ لڑکے شامل تھے ہمیں ہر طرح کی سہولت فراہم کر رہے تھے۔ جوس اور آئسکریم سے ہماری خاطر تواضع کی گئی پھر ناشتہ جو خالص ایرانی انداز کا تھا..... چاول، ٹماٹر اور سیخ کباب فروٹ دہی وغیرہ پر مشتمل ناشتہ خوب سیر ہو کر کیا۔ بعدازاں ہمارے میزبان مالکان آگئے۔ بڑی محبت سے پیش آئے اور ہمارا ہر طرح کا خیال رکھنے کی یقین دہانی کرواتے ہمیں آرام کرنے کا کہہ کر چلے گئے۔ تمام رات کے تھکے ہوئے تھے سب لوگ سو گئے۔ ایرانی خواتین جو تعداد میں سات تھیں کرسیوں پر بیٹھی ہمارے کسی بھی حکم کی منتظر تھیں۔ دو بجے کے بعد بڑا پُر تکلف کھانا پیش کیا گیا۔ اس دوران نوشابہ، آئسکریم، کلفیاں، قہوہ، جوس کے پیکٹ، خشک میوہ جات بھی رکھے جا رہے تھے۔ کھانے سے فارغ ہو کر سب کو پہلی زیارت کا کہتے نقوی صاحب نے نیچے بس میں چلنے کا اعلان کیا۔ یوں ہم سب تیار ہو کر بس میں سوار ہونے کیلئے نیچے آگئے پھر مقدس زیارات کا آغاز ہو گیا۔ سورج غروب ہونے سے پیشتر واپسی ہوئی، فیکٹری پہنچ کر تھوڑی دیر آرام کیا اور دوسرے لوگوں کی طرح طالب، زرگر، حنیف ڈرائیور اور میں بدنصیب ایران کی جگمگاتی شاہراہوں، دوکانوں اور دوسرے مقامات کی طرف مٹرگشت کرنے چل پڑے۔ وہ دونوں خرید و فروخت میں مصروف تھے جبکہ میں اپنے ساتھ لایا تھوڑا سا الیکٹرانکس سامان ٹھکانے لگانے کی فکر میں تھا۔ ایک سٹور دکھائی دیا جس میں الیکٹرانکس سامان بھی سجا ہوا تھا۔ میں چپکے سے کاؤنٹر پر موجود ایرانی دوکان مالک کے پاس پہنچ گیا۔ یہاں اردو مکمل اعتماد سے بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ میں نے اپنا مدعا بیان کیا تو وہ جھٹ خریداری پر آمادہ ہو گیا۔ واپس پہنچ کر میں نے اپنے سامان سے وہ دو چار چیزیں نکالیں جو اس اُمید پر ساتھ لایا تھا کہ کام آئیں گی، پھر انھیں بیگ میں ڈالتے اس سٹور پر آ گیا۔ سٹور مالک نے ان کی اچھی طرح جانچ پڑتال کی اور اپنا ریٹ لگایا جو خاصا بہتر تھا۔ میں نے فروخت کرنے کی رضامندی ظاہر کر دی اور اس نے سامان سنبھالتے رقم گن کر میرے ہاتھ میں دے دی، چائے وغیرہ کے دوران میں نے اس سے سوال کیا کہ ادھر سے کیا لے کر جاؤں جو خرچہ نکل آئے، کچھ دیر وہ سوچتا رہا پھر مجھ سے مخاطب ہوا، ہماری سامان میں تو قالین برتن اور چمڑے کا سامان ہی لوگ لے کر جاتے ہیں مگر میرے خیال میں اگر تم پرندے لے کر جاؤ تو خاصی آمدنی ہوگی۔ کونسے پرندے؟ مجھے تو کچھ سمجھ نہیں۔ کنیری برڈ چھوٹی سی خوشنما رنگوں والی چڑیا ہے جو یہاں سے پاکستانی چار پانچ روپے میں مل جاتی ہے۔ پاکستان میں شوقین لوگ یعنی پرندوں سے محبت کرنے والے پانچ ہزار تک میں خرید لیتے ہیں۔ میں نے پرندوں کی کئی ایک دوکانوں سے اس بارے میں تحقیق کی تو پتہ چلا کہ وہ سٹور مالک صحیح کہہ رہا تھا۔ ایک معقول دوکان دار سے میں نے اظہار کیا کہ میں واپسی پر یہ سونگ برڈ لے کر جانا چاہتا ہوں کتنی تعداد تک لے جانے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ اس نے میری نیت بھانپتے میرے دل کی بات بول دی۔ بہت سارے طریقے ہیں جیسے پاکستان سے گرین پیرٹ یہاں لائے جاتے ہیں، شارک جسے پاکستان میں لالی کہتے ہیں یہاں مینا کے طور پر بھاری قیمت میں فروخت کی جاتی ہے۔ پاکستان سے طوطا اور لالی دو

شائع ہو گیا ہے

سیارہ ڈائجسٹ کے لازوال اسلامی نمبروں میں ایک اور اضافہ

قصص القرآن نمبر

قیمت: 175 روپے

- ان تمام واقعات کا جدید علم و تحقیق کی روشنی میں تفصیلی ذکر جو اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی اور اس کی امت کو بتانا ضروری سمجھے
- انبیائے کرام کی مقدس اور پاکیزہ زندگیوں سے وابستہ واقعات
- قصے ان قوموں کے جن پر انبیائے کرام کی نافرمانی، اللہ تعالیٰ کے احکامات سے روگردانی اور سرکشی کے باعث عذابِ الٰہی نازل ہوا

عمدہ ترتیب، دلچسپ اندازِ بیاں اور پرکشش رنگین ٹائٹل

500 صفحات پر مشتمل یہ عظیم الشان نمبر جلد پیش کیا جائے گا

سیارہ ڈائجسٹ: 240 مین مارکیٹ ریواز گارڈن لاہور۔ فون: 37245412

سو روپے جوڑا کے حساب سے یہاں لایا جاتا ہے مگر یہاں ہزاروں میں فروخت ہوتا ہے۔ اسی طرح یہاں سے سونگ برڈ، لاکن، چکور اور ایسے ہی کئی ایک پرندے اور ایرانی بلیاں سمگل ہو کر جاتی ہیں۔ جب تمہاری واپسی ہو تو میرے پاس آنا، میں تمہیں ایک چیز بتا دوں گا اور آسانی سے لے جانے کی ترکیب بھی بتا دوں گا۔ میں زیارتوں سے فارغ ہو کر مارکیٹ نکل جاتا اور گھوم پھر کر معلومات حاصل کرتا رہتا کہ کونسی چیز جو میں ادھر سے لے کر جاؤں گا تو آمدنی ہو گی۔ واپسی سے ایک روز قبل میں اس دوکان والے کے پاس جس کا نام احمد حسن تھا، پرندوں کی مارکیٹ میں پہنچ گیا۔ جس نے ایک چھوٹے سے پنجرے میں 30 کے قریب چھوٹی چھوٹی چڑیاں اور 10 عدد لاکن ڈال دیئے۔ ایک چھوٹے سے ڈبے میں پچاس کے قریب کاکروچ سے ذرا بڑے رنگین کچھوے ڈال کر اس نے ڈبے میں پانی اور خوراک بھر دی جو پانچ روز تک کیلئے کافی تھی۔ اسی طرح پنجرے میں چڑیوں کیلئے خوراک اور پانی ڈال دیا ان سب پرندوں اور کچھوؤں کا تقریباً بیس ہزار بنا، جو میں نے ادا کر دیا۔ اس کے علاوہ میں نے ایرانی یاقوت فی عدد ایک سو روپے کے حساب سے خریدے جو تعداد میں دو سو تھے، باقی ایک قالین کچھ ایسی ہی چھوٹی چھوٹی چیزیں تھیں۔ واپسی ٹرین پر ہی تھی کچھوؤں کا ڈبہ میں نے بیگ میں اس طرح رکھا کہ زپ سے ہوا جاتی رہے۔ چڑیوں کا پنجرہ میں نے سیٹ کے نیچے رکھ دیا اور آگے اپنا بیگ۔ پانی کے کولر عام تھے، ہر زائر کے پاس دو سے تین کولر بھرے پانی کے تھے۔ گاڑی میں واپسی کے سفر میں کسی بھی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑا اور میں خیریت سے واپس گھر آیا۔ کوئی پرندہ اور کچھوا راستے میں کم نہ ہوا، کچھوے تو رنگین فش فروخت کرنے والوں میں اچھی قیمت سے بک گئے اور چڑیاں ٹولنٹن مارکیٹ میں ہاتھوں ہاتھ اچھے خاصے داموں سے بک گئیں۔ اس کے بعد ایرانی یاقوت سوہا بازار میں سات سو روپے فی نگ کے حساب سے نکل گئے۔ مجموعی طور پر اس پھیرے کا مجھے پونے دو لاکھ بچ گیا۔

اتنی آسانی سے اور ایک ہی پھیرے سے اتنے پیسے بچ جائیں گے اس کا مجھے اندازہ ہی نہیں تھا۔

گھر والوں کو راضی کر کے میں کوئٹہ کیلئے دوبارہ روانہ ہو گیا۔ میں نے ایک بار میں ایران آنے جانے کا آسان راستہ تلاش کر لیا تھا۔ تفتان کے مقامی لوگ کھلے عام ادھر اُدھر آتے جاتے اور میں نے بھی یہی طریقہ استعمال کرنے کا سوچا تھا۔ جس ہوٹل پر میں نے واقفیت بنائی تھی اس پر آ کر میں نے کھانے کا آرڈر دیا اور باتوں باتوں میں ایران جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اس نے ایک مقامی ڈرائیور فرمان علی سے میرا تعارف کروایا اور دو ہزار روپے کے عوض اس نے تہران لے جانے کی حامی بھر لی، وہ ایران سے لوہا بھر کر پاکستان لاتا تھا۔ رات کے پچھلے پہر اس نے مجھے اپنے ٹرک پر بٹھا لیا، دو آدمی اور بھی تھے۔ بارڈر پر ٹرک کروہ چوکی کے اندر گیا پھر باہر آ کر انجن سٹارٹ کرتے کراسنگ عبور کر لی۔ صبح فجر کے بعد اس نے مجھے اور ایک دوسرے آدمی کو، جس کا نام روشن تھا، ایک سڑک کے کنارے اُتارا اور جاتے ہوئے اپنا نمبر لکھوایا۔ جب واپس جانا ہو مجھے فون کر لینا اور ہاں کرایہ مال دیکھ کر ہو گا۔

روشن کو تمام راستوں کا علم تھا اس نے خالی گزرتی ٹیکسی کو اشارہ کیا اور بھاؤ تاؤ کر کے روضہ مبارک امام رضا عالی مقام چلنے کا کہا۔ میں روضہ مبارک پر حاضری دے کر دربار شریف سے باہر آ کر پیدل ہی ادھر اُدھر گھومتا مارکیٹ پہنچ گیا۔ جس برڈ سینٹر سے میں نے چڑیاں اور کچھوے خریدے تھے اس کا مالک

مجھے دیکھ کر خندہ پیشانی سے پیش آیا اور مجھے اندر بنے اپنے آفس میں لے آیا۔ قہوہ چھوہ سے میری خاطر مدارت کی اور کاروباری امور پر تبادلہ خیال کرنے لگا۔ اس نے کراچی کے ایک دو دکانداروں کے بارے میں مجھے بتایا جو جانوروں اور پرندوں کے بہت بڑے تاجر تھے۔ اور اپنا کارڈ بھی دیا کہ اس بار تم مال ان کے پاس لے کر جانا، اچھے دام ملیں گے۔ دو چار روز تک میں ایران میں رُکا رہا پھر احمد حسن کے پاس آیا اور واپسی کے ارادے کا اظہار کیا کیونکہ میں نے ڈرائیور فرمان علی سے رابطہ کر کے واپسی کا بندوبست کر لیا تھا۔ جس نے رات مجھے ٹرک ٹرمنل پہنچ جانے کا کہا تھا۔ حسب سابق احمد حسن نے مجھے اس بار بہت عمدہ کنیری چڑیاں، اگن اور کچھوے دوگنی تعداد میں دیے اور دو ایرانی بلیوں کے بچے بھی ٹوکری میں ڈال دیے۔ اس بار میرا بل اسّی ہزار پاکستانی کرنسی میں بنا۔ مختصر سامان بنا جو میں اُٹھا کر ہوٹل آ گیا۔ رات مقررہ وقت سے قبل میں نے ہوٹل چھوڑ دیا اور ٹرک ٹرمنل پہنچ گیا۔ فرمان علی سے رابطہ ہو گیا۔ جس نے مجھے فردوسی گُڈز پر پہنچنے کا کہا فردوسی گُڈز قریب ہی تھا۔ ایک دو بار گزرتے راہگیروں سے پوچھتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ فرمان علی میرے ہاتھ میں چھوٹی سی ٹوکری اور پنجرہ، ڈبہ دیکھ کر بولا بس یہی سامان ہے؟ ہاں فرمان بھائی، اس نے پنجرے کا کپڑا ہٹا کر چڑیوں کو دیکھا پھر کچھوے، اگن اور بلیوں کا جائزہ لیا۔ پانچ ہزار، پھر خود ہی چار ہزار روپے پر بات پکی کر لی۔ اس بار مجھے اوپر ٹول بکس میں میرے سامان سمیت ''ایڈجسٹ'' کر دیا۔ نیچے فرمان علی کے ہمراہ ایک اور مقامی آدمی تھا، رات کو سفر شروع ہو گیا۔ راستے میں ایک ہوٹل پر رُکتے کھانا کھانے کے درمیان ڈرائیور فرمان علی سے میں نے کراچی تک کسی ٹرک والے کے ساتھ جانے کی بات کی تو اس نے حامی بھر لی کہ بھیج دے گا۔ خیریت سے واپس تفتان پہنچ کر میں بے فکر تھا کیونکہ اپنے ملک میں تھا اور میرے پاس جو کچھ تھا وہ سمگل شدہ ہونے کے باوجود دیکھنے والے کو میرا شوق ہی نظر آتا۔ ٹرک ڈرائیور اور دوسرے دو لوگ بہت اچھے انسان تھے۔ نمازی پرہیز گار، جہاں دو وقت رُکتے مجھے اپنے ساتھ کھانے پینے میں بطور مہمان شامل کرتے۔ بغیر کسی پریشانی کے میں اپنے مال کے ہمراہ کراچی پہنچ گیا۔ ان لوگوں کا شکریہ ادا کرتے میں اپنا سامان سنبھالا ٹرک سے نیچے اُتر آیا، خالی گزرتی ٹیکسی رکوا کر صدر کا بتایا اور پنجرہ، ڈبہ، ٹوکری پچھلی سیٹ پر رکھنے ڈرائیور کے ہمراہ اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ مختلف سڑکوں کے چکر کاٹتے ٹیکسی والا بندر روڈ کے آخر پر واقع پرندوں کی بڑی مارکیٹ کے آگے آ رُکا۔ احمد حسن کی بتائی دوکان تلاش کرنے میں دقت پیش نہ آئی۔ ملازم نے بتایا کہ سیٹھ صاحب گھنٹہ بھر بعد آئیں گے، آپ انتظار کر لیں۔ میرے پاس پنجرہ وغیرہ دیکھتے اس نے پوچھا، ''ایرانی مال ہے؟'' میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا، ایک دراز قد سندھی دوکان میں داخل ہوا۔ ملازم نے سلام کرتے میرا بتایا۔ وہ مجھے لے کر پیچھے کی طرف آ گیا۔ میں نے احمد حسن کے بارے میں بتایا تو وہ ہنس کر بولا ''اس کے نام کنٹینر میرے پاس ہی آتے ہیں، انشاء اللہ مارکیٹ سے اچھا دام ملے گا۔'' پھر اس نے کنیری اگن، بلیاں ننھے منے کچھوے دیکھے اور بولا، ''بالکل برابر ہے۔'' پھر کیلکولیٹر پر اس کا حساب بنانے میں مصروف ہو گیا۔ اتنے میں ملازم ناشتہ رکھ کر واپس چلا گیا۔ خرید سے بھی ڈبل منافع اس نے لگایا تھا اور ساتھ میں یہ بھی شرط بیان کر دی: کہ پوری مارکیٹ میں مال چیک کروا لو ایک روپیہ

زیادہ ملے میں ڈبل دوں گا اور ہاں مال کی پانچ ہزار روپے محکمہ شکاریات اہلکاروں کی کٹوتی جائے گی۔

میں نے سر ہلاتے ہاں کر دی۔ اس نے ملازم کو آواز دے کر میرا لایا مال اس کے سپرد کر دیا جس نے فوراً وہ سارا مال الگ الگ بڑے پنجروں میں منتقل کر دیا اور بچھوؤں کا ڈبہ جس کی میں بڑی حفاظت کرتا آیا تھا اُسے بھی ایک بڑے جار میں منتقل کر لیا۔ پانچ ہزار کاٹ کر اس نے رقم میرے سپرد کرنے ایک چھوٹے سے قریبی ہوٹل میں میری رہائش کا بندوبست کر دیا۔ کمرے میں جاتے ہی میں بے سدھ ہو کر بستر پر دراز ہو گیا۔ پتہ نہیں کب تک سوتا رہا خود ہی میری آنکھ کھلی تھی۔ نہا کر کپڑے بدلے اور لاک لگا کر ہوٹل سے باہر نکل آیا۔ یونہی گھومتا ہوا ایمپریس مارکیٹ نکل آیا۔ یہاں بھی پرندوں کی بہت بڑی مارکیٹ تھی۔ ایک دوکان کے باہر فلیکس آویزاں تھی جس پر کالے بچھو کی تصویر تھی اور اس کا وزن ایک سو دس گرام درج تھا اور قیمت چالیس لاکھ۔ میں نے بار بار پڑھا اور دوکان کے اندر داخل ہو گیا۔ دوکان کے اندر پنجروں میں ہر نسل کے بڑے چھوٹے طوطے موجود تھے۔ کسی کی قیمت لاکھوں میں تھی۔ میں نے سفید میکاؤ کا ریٹ پوچھا گھریلو جوڑے کا ساٹھ ہزار اور جنگلی کا پچیس ہزار تھا۔ میں نے دوکاندار کو اپنے بارے میں بتایا تو اس نے بڑی محبت سے مجھے بٹھاتے ملازم کو چائے لانے کا اشارہ کیا۔ اس نے ایک میکاؤ جس کی ٹانگ میں سٹیل کی ہلکی سی زنجیر پڑی ہوئی تھی کو اپنے کندھے پر بٹھاتے کرسی چھوڑ دی۔ میں نے اُسے اپنے پاس موجود مال کی بابت بتایا۔ اس نے دینے کا ریٹ پوچھا اور وہ ہی میں نے بتایا اور بات آگے چل پڑی۔ اس نے مشورہ دیا کہ دو جوڑی جنگلی میکاؤ کی جاتے پنجاب سے لیتے جانا خرچہ نکل آئے گا۔ میں تمہیں لینے والے کا ایڈریس بتا دوں گا۔ دو جوڑی تیس ہزار میں دے دوں گا تمہیں۔ میں نے اس کی بات پر سر ہلاتے کالے بچھو جس کی قیمت اس نے چالیس لاکھ لکھی ہوئی تھی کی بابت پوچھا، تو اس نے بتایا کہ بچھو کینسر کے علاج میں کام آتا ہے اور بڑا نایاب ہے اس وزن تک جانے اس کی عمر پچاس سال سے بھی اوپر ہو جاتی ہے۔" "آپ کے پاس ہے؟" میں نے سوال کیا۔ "جی ابھی تو باہر بورڈ لگا دکھا ہے۔" "ہمارے پنجاب میں تو ایسے بچھو عام ہوتے ہیں۔"

"بچھو تو عام ہوتے ہونگے مگر اس وزن کا اتنا نہیں ہو سکتا، بڑی محنت اور تلاش کے بعد شکاری اس کو پکڑ پاتے ہیں۔"

"کیا میں دیکھ سکتا ہوں آپ کا بچھو، ہو سکتا ہے مجھے اپنے گاؤں سے ایسا کوئی بچھو مل جائے۔"

"میں دوکان بند کر کے گھر جاؤں گا تو میرے ساتھ چلنا۔"

میری بے چینی بڑھ رہی تھی اور وہ مجھے میکاؤ خریدنے پر آمادہ کرنے لگا ہوا تھا۔ جب اس نے دوکان بند کر دی تو مجھے اپنی گاڑی میں بٹھا کر لالو کھیت کی طرف چل پڑا۔

گھر پہنچ کر اس نے گاڑی روکی اور مجھے لے کر ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ چاروں جانب پرندوں کی تصویریں آویزاں تھیں جس میں وہ ان کے ساتھ موجود تھا۔ ملازم چائے اور دیگر لوازمات رکھ کر ایک جانب جا بیٹھا۔ میں بے چینی سے انتظار کر رہا تھا کہ پردہ ہلا اور وہ ایک خوبصورت جالی کا بکس تھامے اندر داخل ہوا۔ شیشے کی میز پر رکھتے میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے گھروں میں رہنے والی چڑیا کے برابر گہرا سیاہ بچھو اس جالی کے بکس میں رکھے چھوٹے چھوٹے پتھروں کے اوپر ادھر اُدھر رینگ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر میرے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی۔ "اس سے پہلے بھی دیکھا ہے ایسا بچھو؟" میں

نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "37 لاکھ اس کے لگ چکے ہیں، بس آج کل میں جانے والا ہے۔ حیدر آباد کی پارٹی ہے جو ایسے بچھو ملک سے باہر سمگل کرتی ہے، یہ کروڑوں کا دھندہ ہے۔" اس نے بتاتے وہ بکس اپنے ملازم کے سپرد کر دیا اور خود چائے بنانے لگا۔ پھر میکاؤ طوطے کے بارے میں مجھے بتانے لگا۔ کچھ دیر بعد مجھے وہ اپنی گاڑی میں بٹھا کر اپنی رہائش سے باہر لایا اور خالی گزرتے رکشہ میں مجھے بٹھا کر تے واپس پلٹ گیا۔ میرے ذہن میں کالا بچھو رینگ رہا تھا۔ میں نے دوسرے روز اللہ وسایا کے پاس جا کر اس بات کا تذکرہ کیا جو میری لالی کتیری چڑیاں الگ الگ پنجروں میں جوڑا جوڑا کر کے دوکان کے باہر لگے ڈسپلے میں لگا رہا تھا۔ جب اس کام سے فارغ ہوا تو اس نے وہ سب کچھ سچ پر مبنی بتایا اور کالے بچھو کی بابت کھوج لگانے کی بھی بات کی اور جنگلی میکاؤ دس ہزار میں جوڑا دینے کا کہا۔ میں نے جھٹ دو جوڑے کی بات پکی کر لی۔

میکاؤ لیکر جانے کی کوئی پابندی نہیں تھی البتہ اکٹھے چار عدد پر نگر والے کو اعتراض تھا مگر میری یہ مشکل ایک قلی نے حل کروا دی۔ ڈاخننگ کاؤ کے ایک بیرے نے دو ہزار میں صحیح سلامت آخری منزل تک پہنچانے کا سودا کر لیا۔ اللہ وسایا نے چاروں میکاؤ جوڑا جوڑا کر کے مضبوط ٹوکریوں میں مکئی اور چنے کے دانوں سمیت پیک کر دیے اور گتے کے خالی ڈبوں کے اندر ٹوکریاں رکھ دیں۔ ٹوکریوں کے اندر پانی کیلئے لوہے کے ڈبے باندھے ہوئے تھے۔ مقررہ وقت پر قلی نے وہ دونوں گتے کے ڈبے بمعہ دو ہزار بیرے کے سپرد کرتے اسے پانی کا خیال رکھنے کی تاکید کی۔ اس نے جواباً کہا کہ "یہ کوئی نئی بات ہے آپ بے فکر ہو جاؤ۔" میرا ٹکٹ فرسٹ کلاس کا تھا جہاں بھی ٹرین رکی اس بیرے جس کا

نام لطیف تھا کو اشارہ کر کے پوچھتا وہ انگوٹھا اور ہتھیلی ہلا کر اوکے کی رپورٹ دے دیتا۔

بڑی ذمہ داری سے اس نے وہ دونوں ڈبے اسٹیشن کی عمارت سے باہر لا کر میرے سپرد کئے اور میں نے مزید دو سو روپے اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ وہ شکریہ کہتے پھر خدمت کرنے کا کہہ کر پلیٹ فارم کی طرف بڑھ گیا۔ میں ڈبے سنبھالتا ٹیکسی کے انتظار میں آ کھڑا ہوا، جلد ٹیکسی مل گئی۔ میں گھر کا بتا کر بے فکر ہو گیا۔

دوسرے روز مارکیٹ میں گیا اور ایک "پیٹ شاپ" والے کو دو جوڑے میکاؤ فروخت کرنے کی بات کی، وہ فوراً میرے ساتھ چلنے کیلئے تیار ہو گیا۔ میں اسے موٹر سائیکل پر بٹھا کر گھر لے آیا۔ اس نے تیس ہزار سے بات شروع کی اور پینتیس ہزار روپے میں سودا طے ہو گیا۔ قیمت ادا کر کے اس نے دونوں ٹوکریاں اٹھائیں اور میرے گھر سے باہر نکل گیا۔ میرے لئے بشارت چوہان کی مہربانی رنگ لائی اور میں تھوڑے عرصہ میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔

اب مجھے بچھو کی تلاش تھی جس کیلئے میں نے بہت سے پرندے پکڑنے والوں سے واسطہ کیا۔ پہلی بار معلوم ہوا کہ جانوروں، پرندوں کے علاوہ جنات بھی برائے فروخت تھے مگر بچھوؤں کے شکاری سامنے نہ آئے۔ اس دوران میں ایران کے دو چکر اور لگا بیٹھا تھا اور میں نے پرندے امپورٹ ایکسپورٹ کرنے کا لائسنس بھی حاصل کر لیا تھا اور پاکستان سے باہر جانے والے پرندوں اور جانوروں جس میں چمگادڑ، کچھے، سانپ وغیرہ ٹیکس ادا کر کے ایران لے جا سکتا تھا مگر میرا ذہن کالے سو گرام وزن کے بچھو میں اٹکا ہوا تھا۔

ایک روز میں داتا صاحب حاضری دیکر پیدل ہی یادگار پاکستان کی طرف جا رہا تھا کہ لیڈی ولنگٹن ہسپتال کی نکڑ پر ایک نیم حکیم کو مختلف قسم کے کیڑے مکوڑوں، سانپ، بچھو، سانڈے کا تیل فروخت

کرتے دیکھا۔ جس نے سانڈے، سانپ، بچھو زندہ ہی عوام کے یقین کیلئے سب کے سامنے رکھ چھوڑے تھے۔ میری نظر مٹی کے برتن میں رینگتے سیاہ بچھوؤں پر پڑی جو جسامت میں عام بچھوؤں سے ذرا بڑے تھے۔ میں اس انتظار میں تھا کہ وہ اپنا کام پورا کرے اور میں اس سے سوال جواب کروں۔ اس نیم حکیم کا نام بابا وارث تھا۔ جب وہ فارغ ہو گیا تو میں نے اپنا تعارف کروایا اور اس کے پاس جو بچھو تھے ان کے بارے میں دریافت کیا کہ یہ وہ کہاں سے لایا تھا۔ اس نے بتایا کہ یہ پہاڑی بچھو ہیں جو سوات میں ان شکاریوں سے مل جاتے ہیں جو جانور وغیرہ پکڑ کر انہیں فروخت کرتے ہیں۔ میں نے دوسرا سوال کیا کہ اس سے بڑے سائز کے بھی ہوتے ہیں ان کے پاس؟ جس پر وہ فٹ پاتھیا فقدے مسکرایا اور بولا جناب جس بچھو کے بارے میں آپ پوچھ رہے ہو وہ ہمارے ہی علاقے میں پایا جاتا ہے جس کے زہر سے بڑی بڑی کمپنیاں ادویات وغیرہ بناتی ہیں خاص کر کینسر کی ادویات۔ یہ بچھو اگر کسی کو ڈنک مار بھی دے تو پہلے بھونڈ جتنا اثر ہے۔ وارث سے مجھے بچھوؤں کے بارے میں خاص معلومات ملیں۔ اسی طرح کام کرتے کرتے میں پرندوں جانوروں کا ماہر ہو گیا۔ اب میں روزی کیلئے باز، شاہین، شکرے، بحری، تلور کی خرید و فروخت کا کام بھی کرنے لگا تھا۔ یہ کام بھی لاکھوں کا تھا جو چوری چھپے ہی کیا جاتا تھا کیونکہ محکمہ وائلڈ لائف اس پر کڑی نظر رکھتا تھا۔

ایک روز گجرات سے مجھے سرور کا فون آیا، یہ بھی میری طرح جانور پرندے وغیرہ لیتا دیتا تھا۔ اس نے بتایا کہ ادھر کسی کے پاس ایک ستر اسی گرام کا سیاہ بچھو برائے فروخت ہے۔ کیونکہ میں نے سرور سے ایک دو باز شکرے لئے تھے اور اسے اپنے علاقے کے بڑے بچھوؤں کی بابت کہا تھا۔ فون پر اس نے بتایا کہ یہ بچھو کسی زمیندار کے پاس تھا جو اس کی خاندانی پرانی حویلی کی دیوار مسمار ہونے پر اسے ملا تھا، جسے اس نے قابو کر کے مٹی کی ہنڈیا میں ریت ڈال کر ہنڈیا میں چھوٹے چھوٹے سوراخ کر کے ہنڈیا کا ڈھکن لگا دیا تھا۔ ایک دو شکاری آئے تھے اسے دیکھنے اور تیس ہزار تک لگا گئے تھے مگر زمیندار فروخت کرنے کو تیار نہیں تھا۔ سرور کے فون کے بعد میں نے کراچی فون کر کے اللہ وسایا کو بتایا کہ مجھے ستر گرام کے ایک مقامی سیاہ بچھو کا پتہ چلا ہے جس کے مالک کو تیس ہزار لگے ہیں اس کے مگر وہ لاکھ سے اوپر مانگتا ہے۔ ادھر سے جواباً اس نے کہا کہ اگر واقعی ستر گرام کا مقامی بچھو یعنی دیسی ہے تو پچاس ساٹھ ہزار کا خرید لو، یہاں یہ لاکھ سے اوپر جائیگا۔ میں فون رکھ کر گجرات جانے کی تیاری کرنے لگا۔

صبح گجرات کی بس میں سوار ہو کر تقریباً ۱۰ بجے سرور کے پاس پہنچ گیا۔ ہم دونوں موٹر سائیکل پر اس گاؤں کی طرف چل پڑے، جہاں کے زمیندار کے پاس بچھو تھا۔ وہ اپنی حویلی پر ہی مل گیا ہم نے اپنے آنے کا مقصد بتایا تو اس نے اپنے ملازم سے بچھو والی ہنڈیا منگوائی۔ میں چونکہ کراچی والا بچھو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا اس لئے مجھے اس کا سائز اس سے ذرا چھوٹا لگا اور جسامت بھی کمزور تھی مگر تھا پھر بلا۔ میں نے کراچی فون کر کے پھر رابطہ کیا اور اس کا سائز رنگ اور جسامت بتائی دوسری طرف سے وہی جواب ملا جو گھر سے چلتے وقت فون پر ملا تھا۔ میرے استفسار پر زمیندار نے وہی سوا لاکھ مانگا، کافی مغز کھپائی کے بعد 55ہزار روپے میں بات پکی ہوگئی، ہم نے رقم دے کر بچھو خرید لیا۔ سرور موٹر سائیکل کے پیچھے ہنڈیا لے کر بیٹھ گیا اور شہر جانے کیلئے چل پڑا۔ رات سرور کے پاس گزاری،

دوسرے روز واپس جانے کیلئے چل پڑا۔ ہنڈیا چند باسکٹ میں ڈھکی اور ویگن میں سوار ہو گیا۔ گھر آ کر میں نے اللہ وسایا کو بتایا کہ میں نے بچھو 75 ہزار میں خریدلیا ہے اور ایک آدھ دن میں لے کر آ رہا ہوں، اس کو فروخت کرنے کا بندوبست کرو۔ جواباً اس نے کہا کہ "کراچی میں ریسرچ سنٹر اور کئی ایک ادویات کی فیکٹریاں ہیں ان سے رابطہ کرتا ہوں، میرا کمیشن 10 فیصد ہوگا۔" اللہ وسایا نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔ میں رات کی ٹرین سے کراچی کی طرف چل پڑا۔ دوسرے دن تقریباً دوپہر تک کراچی پہنچ گیا۔

اسٹیشن سے سیدھا اللہ وسایا کے پاس پہنچا۔ اس نے بچھو کا بغور جائزہ لیا اور سر ہلا نے اس کی کوالٹی کی تائید کر دی پھر اس نے فون پر کسی سے بات کی اور آنے کا کہا۔ دن ڈھلنے سے قبل وہ لوگ آئے اور میرے بچھو کو بغور دیکھنے کے بعد ایک لاکھ دس ہزار قیمت لگائی مگر اللہ وسایا نے انکار کر دیا۔ جاتے جاتے ایک لاکھ پندرہ ہزار کہتے وہ اپنی گاڑی میں سوار ہو گئے۔ میں نے اللہ وسایا سے مشورہ مانگا کہ کیوں نہ ایمپریس مارکیٹ والے کو بھی دکھایا جائے، اس نے کہا چلو چلتے ہیں۔ ہم دونوں پھول نی بچھو والی ٹوکری اٹھا کر ایمپریس مارکیٹ کی طرف چل پڑے۔ یہاں افضل بھائی کے علاوہ اور بھی لوگ کام کرتے ہیں مگر افضل بھائی چھوٹا موٹا کام نہیں کرتے ان کا رابطہ چاروں صوبوں میں شکاریوں سے ہے اس لئے ان کے پاس بچھو آتے رہتے ہیں۔ ہم باتیں کرتے افضل بھائی کی دوکان پر پہنچ گئے۔ وہ فلیکس ابھی تک ان کی دوکان پر آویزاں تھی۔ وہ بڑی محبت سے ملے، اللہ وسایا سے مارکیٹ کے بارے میں گفتگو کرنے مجھ سے مخاطب ہوئے "سناؤ کوئی دانہ ہاتھ لگا، میں نے ٹوکری سے ہنڈیا نکال کر اس کے آگے رکھ دی۔ اس نے ڈھکن ہٹا کر میرا لایا بچھو دیکھا اور بولا "مہران لیبارٹری والوں کو ضرورت ہے تم نے دکھایا ہے انکو؟"

"نہیں ایک باہر کی پارٹی نے ایک چندرہ لگایا ہے۔" اللہ وسایا نے افضل بھائی کی بات کا جواب دیا۔ "میں فون کروں؟" افضل بھائی نے اللہ وسایا سے پوچھا۔ "ہاں کرلو اگر دام صحیح لگائیں تو"۔

"کوشش ہے آگے اللہ مالک۔" افضل بھائی نے نمبر ڈائل کرتے جواب دیا۔ پھر وہ دوسری جانب کسی خالد صاحب سے میرے بچھو کے بارے میں بات کرنے لگا۔ پھر فون بند کرنے ان کے آنے کا بتایا ان کا آفس بندر روڈ پر تھا اور وہ دیکھنے آ رہے تھے۔

چائے کے دوران خالد صاحب اور ان کے ہمراہ دو اور ساتھی تھے آ گئے اور افضل بھائی نے میرے بچھو کو ہنڈیا سے نکال کر شیشے کے جار میں چھوڑ دیا جسے وہ چاروں جانب سے پرکھ رہے تھے پھر وہ افضل بھائی سے مخاطب ہوئے "کیا ڈیمانڈ ہے؟"

"پانچ لاکھ۔"

"اوئے نہیں چھوٹے نمبر کا ہے۔"

"نہیں سیٹھ تیسرے نمبر پر آ رہا ہے۔" افضل بھائی نے کاروباری پلٹا مارا۔ "اور ابھی تک پورا ہے۔" اس نے دراز سے شیشہ نکال کر خالد صاحب کے ہاتھ میں دیتے گارنٹی دی۔ خالد صاحب نے جاؤ گھما کر بچھو کی ڈم کو قریب کر کے دیکھا اور شیشہ واپس دیتے جھٹ دو لاکھ کی آواز لگائی تو اللہ وسایا کود پڑا۔ "سیٹھ وہ جو آپ نے تین لاکھ میں لیا تھا اس سے کہیں نیچے تھا اور ہر بار اس کو خالی بھی کیا ہوا تھا مگر اس کی تھیلی سیل بند ہے۔"

سوا دو لاکھ کہہ کر وہ اٹھ گئے۔ میں پریشانی میں الجھا ہوا تھا کہ دیکھیں اب کیا ہوتا ہے مگر دونوں نے انہیں نہیں روکا۔ میں دل ہی دل میں خوش تھا کہ میرے لائے بچھو کی قیمت بڑھ رہی تھی۔ ایک دو جگہ

پر انہوں نے فون کیے ایک طرف سے جو بات ہوئی وہ قلات میں قائم ایسے ہی ادارے کے مالک کی تھی جو اس زون اور سائز کے پونے تین لاکھ دینے کو تیار تھا۔ دونوں نے مجھے قلات جا کر بچھو فروخت کرنے کا مشورہ دیا تو میں نے ان کی کمیشن کی بابت پوچھا۔ انہوں نے کہا جو آدمی تمہیں اسٹیشن پر لینے آئے گا وہی سب کچھ کرے گا تم فرسٹ کلاس ویٹنگ روم میں چلے جانا۔ امین خان تمہیں وہیں بیٹھا ملے گا وہ باقی سب کام سنبھال لے گا۔ میں رات کو کوئٹہ ایکسپریس میں فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لے کر بیٹھ گیا تمام رات سفر جاری رہا دوسرے دن میں کوئٹہ پہنچ گیا۔ بیگ اور ٹوکری سنبھالے میں فرسٹ کلاس ویٹنگ روم میں آ گیا ادھر ادھر نظریں دوڑائیں تو ایک درمیانے قد کا مقامی آدمی میرے قریب آیا اور بولا ”امتیاز بلوچ؟“ میں نے بتایا ”ہاں۔ مجھے افضل بھائی نے آپ کیلئے بھیجا ہے“ اس نے میرا بیگ پکڑتے کہا ”ٹھیک ہے“ اور ہم دونوں باہر آ گئے۔

بچھو والی ٹوکری میرے ہاتھ میں تھی اس نے رکشہ رکوا کر طوغی روڈ چلنے کا کہا۔ گوشت مارکیٹ کے قریب رکشہ رکواتے اس نے کرایہ دیا اور مجھے ساتھ لیکر مارکیٹ کے عقب بستی کی طرف چل پڑا۔ زیادہ چلنا نہ پڑا وہ ایک درمیانے درجہ کا چھوٹا سا مکان تھا جو لوہے کی چادروں کو جوڑ کر بنایا گیا تھا اس نے باہر لگا تالا کھولا اور اندر آنے کا کہا۔ ایک طرف دو کمرے اور دوسری طرف دالان نما برآمدہ تھا جس میں خالی پنجرے اوپر نیچے رکھے تھے۔ بستر زمین پر ہی لگا ہوا تھا اس نے میرا بیگ ایک طرف رکھتے بتایا کہ بچے گاؤں گئے ہوئے ہیں۔

وہ رات میں نے امین خان کے گھر گزاری وہ بھی پرندوں اور جانوروں کا کاروبار کرتا تھا۔ پاکستانی پرندے جانور ایران بھجواتا اور وہاں کے جانور پرندے ادھر سمگل کرتا تھا۔ صبح اٹھ کر میں نے اپنے بچھو کا خوراک پانی چیک کیا جو مجھے لاکھوں کا فائدہ پہنچانے والا تھا۔ مطمئن ہو کر میں امین خان کا باہر سے لایا ناشتہ کرنے میں مصروف ہو گیا پھر ہم دونوں تیار ہو کر بس اسٹینڈ پر آئے اور قلات جانے کیلئے سوار ہو گئے۔

بچھو والی ٹوکری جس میں بچی ہنڈیا میں میرا دو لاکھ کا فائدہ دبک رہا تھا اسے احتیاط سے سیٹ کے نیچے رکھا اور باہر کے مناظر میں گم ہو گیا۔ قلات پہنچ کر رکشہ لیا اور فیکٹری کا بتاتے ہم بیٹھ گئے۔ فیکٹری آبادی سے کافی باہر تھی خاصا وقت تھا فیکٹری کا۔ زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا اور ہمیں فیکٹری منیجر نے اندر بلوا لیا۔ چشتی و بر خاطر مدارات میں مصروف رہے اسی دوران فیکٹری کے ڈائریکٹر اور لیبارٹری انچارج آ گئے۔

مجھے بچھو دکھانے کا کہا۔ میں نے امین خان کی طرف دیکھا جس نے فوراً ٹوکری میں سے ہنڈیا نکالی اور میز پر رکھتے اس کا ڈھکن اٹھایا۔ بچھو ڈھکن کی اندرونی سطح پر چمٹا ہوا تھا ڈھکن اٹھتے ہی وہ امین خان کی گود میں آن گرا اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا بچھو اپنا کام کر گیا۔ شاید وہ اس کا پہلا ڈنک تھا جو لگتے ہی امین خان کا کام تمام کر گیا۔ فیکٹری میں موجود ڈاکٹر اور لیبارٹری انچارج نے بڑی کوشش کی امین خان کو بچانے کی مگر وہ تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو چکا تھا۔

بچھو کو دوبارہ ہنڈیا میں ڈال کر فیکٹری مالکان نے مقامی پولیس کو خبر کر دی اور مجھے میرے بچھو سمیت گرفتار کر لیا گیا۔ مجھ پر مقدمہ چلا اور مجھے خطرناک بچھو رکھنے کے جرم میں عمر قید کی سزا ہو گئی حالانکہ میرے پاس پرندوں جانوروں کی خرید و فروخت کا لائسنس تھا مگر کوئی حربہ بھی کام نہ آ سکا۔ میں نے امین خان پر بچھو جان بوجھ کر تو نہیں پھینکا تھا، وہ تو اس کی بے احتیاطی اور اس کی تقدیر تھی۔ ورنہ میں بھی تو کئی دنوں سے خوفناک موت کو دن رات ساتھ لئے پھرتا آ رہا تھا۔ آپ تک یہ رسائی شاید میرے کچھ کام آ سکے۔“

یہ سب بتا کر امتیاز بلوچ خاموش ہو گیا۔



''چھت کا سایہ...... موت لایا''



تحریر: عارف محمود اپل

لاہور سمیت بڑے شہروں کے ہزاروں شہری ''موت کے گھروں'' میں رہتے ہیں اور انتظامیہ کو ان کی یاد صرف برسات کے موسم میں آتی ہے!

اندرون لاہور سینکڑوں خستہ حال مکانوں کے ہزاروں مکین کسی بھی وقت بڑے المیے سے دوچار ہو سکتے ہیں۔ مقامی انتظامیہ نے کبھی ایسے مکانوں کا سروے کیا ہے نہ ہی اس بارے ان مکینوں سے کوئی رائے لی۔ خستہ حال مکانوں کے رہائشیوں کا کہنا ہے کہ وہ

جوان بچیوں اور معصوم بچوں کو لے کر حکومت کے عارضی کیمپوں میں مہاجروں کی طرح زندگی نہیں گزار سکتے۔

برسات کے موسم میں جہاں سیلابی ریلوں اور شدید بارشوں سے دیہات بہہ جاتے ہیں طوفانی موجیں مکینوں سمیت مکان نگل جاتی ہیں۔ وہاں

ایسے میں لاہور سمیت متعدد بڑے شہروں کے اندرونی علاقوں میں قدیم بوسیدہ عمارتیں جو عام حالات میں بھی خطرناک ثابت ہوتی ہیں برسات میں وہ ایک طرح سے موت کا پیغام بن جاتی ہیں۔ ہر سال اس موقع پر بوسیدہ مکانوں کی دیواریں اور چھتیں گرنے سے کئی گھرانوں کے پورے افراد خانہ لقمہ اجل بن جاتے ہیں جس کا بعد میں کوئی پرسان حال ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی ذمہ داری قبول کرتا ہے۔ بلدیہ کے ارباب اختیار بھی یہ کہہ کر اپنی گلوخلاصی کروانے کی کوشش کرتے ہیں کہ متعلقہ مکان کے مکینوں کو پہلے ہی خبردار کر دیا گیا تھا۔ مگر انہوں نے اس پر کوئی کان نہیں دھرا۔

اگر گزشتہ دو عشروں کے اخبارات اٹھا کر دیکھیں اور بوسیدہ مکانات گرنے کے واقعات اٹھا کر دیکھیں اور بوسیدہ مکانات گرنے کے واقعات جمع کئے جائیں تو ان کی تعداد ہزاروں سے تجاوز کر جاتی ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ ان افسوسناک واقعات کو وقوع پذیر ہونے کے بعد مقامی حکومت اور بلدیہ نے کیا حفاظتی تدابیر کیں۔

اس برس بھی شدید بارشوں کی پیش گوئیوں کے پیش نظر ڈی سی او لاہور نے حکم دیا ہے کہ اندرون شہر کی ایسی تمام خستہ حال عمارتیں جو کسی بھی وقت زمین بوس ہو جاتی ہیں انہیں خالی کروا کر ان کے مکینوں کو متبادل اور محفوظ رہائش فراہم کی جائے۔ اخباری ذرائع کے مطابق انہوں نے یہ ہدایات تمام ٹی ایم اوز کو جاری کی ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ شدید بارشوں یا متوقع سیلاب کے پیش نظر سکولوں اور سرکاری عمارتوں میں عارضی رہائش رکھنے والے مکینوں کے رہنے اور کھانے پینے کا بندوبست کیا جائے۔ انہوں نے محکمہ صحت کے افسران سے بھی کہا ہے کہ ابتدائی طبی امداد اور وبائی امراض سے بچاؤ کے لئے ہر قسم کی ہنگامی ادویات کا وافر ذخیرہ کیا جائے۔ ڈی سی او لاہور نے بوسیدہ اور شکستہ عمارات خالی نہ کرنے والے لوگوں کو خبردار کیا ہے کہ وہ اس سلسلے میں ہٹ دھرمی یا بے جا ضد سے اجتناب کریں اور عقلمندی کا تقاضا یہی ہے کہ وہ اپنی اولاد کی قیمتی زندگیوں کو خطرے میں ہرگز نہ ڈالیں۔

3سال تک خراب نہ ہونے والا پیزا

پیزا کھانے کے شوقین افراد کے لئے خوشخبری ہے کہ امریکی ماہرین نے ایسا انوکھا پیزا تیار کر لیا ہے جو 3 سال تک خراب نہیں ہو گا۔ جی ہاں شکل و صورت اور ذائقے کے اعتبار سے تو یہ عام پیزے جیسا ہی ہو گا لیکن اس کی خراب ہونے کی میعاد 3 سال ہو گی۔ یہ پیزا فوجیوں کی ضرورتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے خاص طور پر تیار کیا گیا ہے کیوں کہ اکثر اوقات فوجی ایسی جگہوں پر تعینات ہوتے ہیں جہاں کھانا تیار کرنا یا کھانے کو ذخیرہ کرنا مشکل ہوتا ہے۔

(مرسلہ: زیبا وانی۔ میانوالی)

اکیلا پن موٹاپے سے زیادہ خطرناک

اکیلا پن موٹاپے سے زیادہ تباہ کن ہے، اس کے باعث مرنے کے خدشات دوگنا بڑھ جاتے ہیں۔ برطانوی سائنسدانوں نے 50 سال اور اس سے زیادہ عمر کے 2 ہزار افراد پر تحقیق سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اکیلا پن، موٹاپے سے کہیں زیادہ تباہ کن ہے اور تنہائی کی وجہ سے مرنے کے خدشات دوگنا بڑھ جاتے ہیں۔ برطانیہ میں کی گئی تحقیق کے مطابق ہر پانچواں شخص خود کو مسلسل تنہا محسوس کرتا ہے۔ سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ ان تباہ کن اثرات سے بچنے کے لئے خاندان کے ساتھ رہنے کو ترجیح دینی چاہئے۔

(مرسلہ: شازیہ عمران۔ لاہور)

مقامی انتظامیہ کی طرف سے اس طرح کی ہدایات برسات کے دنوں میں عین اس وقت جاری کی جاتی ہیں جب طوفانی بارشیں شروع ہو چکی ہوتی ہیں۔ دریا بھر چکے ہوتے ہیں اور تباہی کی صورتحال سر پر ہوتی ہے جس کا صاف مقصد یہ ہے کہ مقامی انتظامیہ ڈنگ ٹپاؤ پالیسی پر یقین رکھتی ہے اور ایسے حفاظتی انتظامات کا اعلان صرف عذر سے بچنے کے لیے کیا جاتا ہے۔

ایک سروے کے مطابق اس وقت اندرون شہر خصوصاً لوہاری، شاہ عالمی، بھاٹی ٹیکسالی، موری اور خصوصاً موچی گیٹ کے اندر ایسی خستہ حال خطرناک عمارات کی تعداد ہزاروں سے تجاوز کر چکی ہے۔ ان دو تین مرلہ پر بنی تین چار منزلہ عمارات میں بھی بیک وقت کئی کئی خاندان اپنے معصوم بچوں کی بڑی تعداد کے ساتھ رہائش پذیر ہیں۔ ایسے مکان بھی ہیں جن کی چھتیں یوں لگتا ہے کہ بس گریں کہ گریں اور اکثر ایسے مکانوں کی چھتوں اور چوباروں کے نیچے بڑے بڑے بانسوں اور شہتیروں کی سپورٹ دی گئی ہے۔ جس طرح لینٹر ڈالنے کیلئے سپورٹ دی جاتی ہے۔ ان بوسیدہ مکانات کی چھتوں کو بھی اسی طرح ہی لکڑی کے عارضی ستونوں کا سہارا دیا گیا ہے۔ اس حالت میں اگر خدانخواستہ تیز طوفان باد و باراں آ جائے تیز آندھی اور بارش ہو تو یہ مکان پتنگ کی طرح ڈولنے لگتے ہیں۔ ایسے ڈیڑھ ہزار مکانوں کا سروے کیا گیا ہے نہ ہی ایسے مکانوں کے مکینوں کو بھی بلوا کر ان کے مسائل پوچھے گئے ہیں کہ وہ کیونکر موت کے گھروں میں رہتے ہیں۔ اس قسم کے کام ان حالات میں ہونے چاہئیں جب برسات کا موسم نہ ہو مگر ہمارے ہاں اس وقت بھاگم بھاگ ہوتی ہے اور دوڑیں لگتی ہیں جب طوفان اور سیلاب دروازے پر دستک دینے لگتا ہے۔

اہل لاہور کو مقامی انتظامیہ کے ذمہ دار افسران سے بھی شکایت ہے کہ انہوں نے امن کے زمانے میں بھی ان خطرناک مکانوں کا سروے کیا ہے اور نہ ہی اس بارے میں کوئی پالیسی بنائی ہے۔ جس کا نتیجہ ہر برسات میں موت کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔

محکمہ موسمیات کی پیش گوئیوں کے مطابق چونکہ اس سال زیادہ بارشوں اور طوفان باد و باراں کا اندیشہ ہے۔ اس لئے انہوں نے پہلے ہی متعلقہ اداروں کو خبردار کر دیا ہے کہ وہ اپنا اپنا بندوبست کر لیں مگر اس کے باوجود ابھی تک مقامی انتظامیہ نے سنجیدگی سے کسی عملی اقدام کا اعلان نہیں کیا جس کی وجہ سے ان ہزاروں مکانوں میں مقیم لاکھوں افراد اور معصوم بچے کسی بھی لمحے موت کے منہ میں جا سکتے ہیں۔

فلاحی اور سماجی تنظیموں کا کہنا ہے کہ ان کی کمیٹیوں نے متعدد بار اس سلسلے میں مقامی انتظامیہ کو خطوط لکھے، یادداشتیں پیش کیں ان مکانوں کا سروے کرنے کے لئے اعلیٰ افسران کو دعوت دی مگر اس کے باوجود ان اداروں کی طرف سے کوئی مثبت قدم نہیں اٹھایا گیا۔ مکینوں کا کہنا ہے کہ ان کے گھر میں چھوٹے بچوں کے علاوہ بزرگ، بیمار اور جوان بچیاں بھی ہیں ان کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ حکومت کی طرف سے فراہم کردہ عارضی سرکاری عمارتوں اور کیمپوں میں مہاجروں کی طرح زندگی بسر کر سکیں۔

ان مکانوں کے باسیوں کا کہنا ہے کہ وہ خود موت کے ان کنوؤں سے ہمیشہ کے لئے باہر نکلنا چاہتے ہیں مگر اس کے لئے انہیں حکومت کی طرف سے مستقل طور پر موجودہ خستہ مکانوں کی جگہ متبادل جگہیں فراہم کی جائیں جہاں وہ عزت کے ساتھ محفوظ طریقے سے زندگی گزار سکیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ حکومت خصوصاً مقامی انتظامیہ کب اور کس انداز سے ان کے مسائل حل کرتی ہے۔

کاش یہ ممکن ہوتا

آسنا محمد کنول

ایک لڑکی کی کہانی، وہ لاچاری ختم کر کے اپنے پیروں پر کھڑی ہونا چاہتی تھی

اوائل عمری کے دن بھی کیا دن ہوتے ہیں، بے فکری ایسی کے کسی چیز کی کوئی فکر نہیں ہوتی اور سوچنے لگیں تو سوچتے چلے جائیں۔ یہ سوچ بھی ہوتی ہے کہ یہ دن اتنی جلدی کیوں گزر جاتے ہیں۔ اس عمر میں لڑکے لڑکیاں کھیلتے کودتے، پڑھتے لکھتے دوست بناتے اور انہیں ہمیشہ تک یاد رکھنے کے وعدے کرتے ہیں مگر وقت کا پہیہ اس تیزی سے گھومتا اور انسانوں کو چکر دیتا ہے کہ حال، ماضی کو پیچھے چھوڑنے اور مستقبل کو پکڑنے میں بھاگا چلا جاتا ہے اور جب حالات کی سمجھ آنے لگتی ہے کچھ بن کر باہر نکلتے ہیں اپنا اور اپنے



اطراف کا جائزہ لیتے ہیں تو پلوں کے نیچے سے ڈھیروں پانی گزر چکا ہوتا ہے اور ہم انسان زندگی کے بکھیڑوں میں اُلجھے اپنے تانے بانے بُنتے اور درست کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ زندگی کب کسی کو پیچھے مڑ کر دیکھتے رہنے کی مہلت دیتی ہے یہ تو بس بھگائے جاتی ہے۔ اس منزل کی اور جو کبھی ہاتھ نہیں آتی بس ایک نشان کی مانند جو ذرا جھلملے پانیوں پر کسی ڈولتی کشتی کا دھبہ سا تو لگتا ہے حقیقت کبھی نہیں بنتا۔

میں اور مجھ جیسے کروڑوں لوگ یہی کچھ تو کرنے میں لگے ہیں بلکہ یہی کچھ ہی کر رہے ہیں۔ کبھی کبھی ماضی کی طرف مڑ کر دیکھتے ہیں تو یادوں کی راکھ کریدتے کریدتے کئی سلگتی ہوئی دبی یادیں آنکھوں میں آنسو بن کر تیرنے لگتی ہیں۔ ایک دن دوبئی کے حسین ساحل پر چہل قدمی کر رہی تھی۔ پتہ نہیں کیسے بیس سال پیچھے چھلانگ ماری تو ایک سسکتا ہوا چہرہ آنکھوں میں گھومنے لگا۔ یہ ہمارے گاؤں کی اماں فاطمہ تھی سارا بچپن اسے یونہی دیکھا تھا۔ گوری چٹی خوبصورت نقش و نگار والی مگر دراز قامتی کے باعث بڑھاپے نے اسے کبڑا کر دیا تھا۔ ہمارے گھر کے سامنے زمین کا کافی بڑا ٹکڑا خالی پڑا تھا۔ یہ زمین اماں فاطمہ کی تھی جس پر وہ اپنی بھینسیں باندھتی تھی۔ اس کے بیٹے اور شوہر زمینداری کرتے تھے۔ خود وہ سارا دن بھینسوں کی دیکھ بھال کرتی۔ انہیں چارہ ڈالتی، دودھ دھوتی، حویلی کی صفائی ستھرائی، گوبر اکٹھا کرنا، اپلے تھاپنا بس سارا دن وہ انہی کاموں میں مصروف رہتی۔ خدا نے اسے ایک بیٹی بھی عطا کر رکھی تھی جس کو وہ بڑے چاؤ سے گاؤں کے سکول میں پڑھا رہی تھی۔ اُس کی بیٹی بھی خوبصورت تھی مگر ایک بدقسمتی بھی ہوگئی۔ اماں فاطمہ کی بیٹی ساجدہ اچانک بیمار ہوگئی۔ اس کے گلے پر زخم سے بن گئے تھے۔ بہت عرصہ لگا اُسے ٹھیک ہونے میں۔ ساجدہ ٹھیک تو ہوگئی تھی مگر بیماری کے نشان باقی تھے۔ وہ جانتی تھی کہ شاید ان داغوں کی وجہ سے کوئی اس سے شادی نہیں کرے گا۔ اپنی جگہ پر اس کا سوچنا بھی درست ہی تھا۔ جس سماج میں ذرا ذرا سی بات پر دیکھتے ہوتے ہوں کیڑے نکالے جاتے ہوں وہاں ایک داغ دار چہرے والی کا کیا مستقبل ہے۔ اماں فاطمہ کی حویلی ہمارے گھر کے گیٹ کے سامنے تھی۔ ہم اسے آتے جاتے دیکھتے، چھت پر چڑھ جاتے تو وہ گوبر میں کھڑی ہوتی، اُپلے تھاپتی دیواریں بھرتی رہتی۔ ایک بار میں نے اُس سے پوچھا، "اماں فاطمہ اتنی محنت کس کے لیے کرتی ہو۔" وہ بولی، "بچوں کے لیے۔" "بچوں کے لیے یا صرف ساجدہ کے لیے؟" اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اُس نے اپنی کبڑی کمر کو بمشکل اُٹھایا۔ مجھے غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بے تحاشا دکھ تھا، ناقابلِ بیان اذیت تھی۔ پسینے سے بھرے سفید بالوں کو اس نے اپنی بوڑھی انگلیوں سے پیچھے کیا اور پھر کہنے لگی۔ "بیٹا تم جانتی تو ہو ساجدہ نے میٹرک کر لیا ہے۔ باپ بھائی تو سارا دن کھیتوں میں ہی گزار دیتے ہیں۔ لڑکی تو صرف میری ذمہ داری ہے۔"

"ساجدہ آگے پڑھنے کی ضد کر رہی ہے اماں فاطمہ، تو میرے پاس بھیجنا۔" "اچھا بیٹا! آپ لوگ تو پڑھے لکھے ہو اچھا مشورہ ہی دو گے۔" میں گھر کے اندر آگئی تو وہ پھر اپنے نہ ختم ہونے والے کاموں میں لگ گئی۔ اسی شام ساجدہ آگئی۔ گوری چٹی بھوری آنکھوں اور سیاہ بالوں والی لڑکی، خوبصورت ناک نقشہ مناسب قد و قامت۔ اگر گردن پر بیماری کے نشان نہ ہوتے تو وہ ایک خوبصورت سی مغرور لڑکی ہوتی۔ مگر اب چاند کو گرہن لگا ہوا تھا۔ "باجی صاعقہ آپ نے بلایا تھا"۔

"ہاں آؤ بیٹھو" میں نے گھر میں کام کرنے والے لڑکے رحیم کو بلایا۔ "پانی لاؤ اور بی بی کے لیے چائے بھی بناؤ"۔

"چنگا باجی جی!" وہ ادب سے کہہ کر چلا گیا۔

ساجدہ سے کافی ساری اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد میں نے پوچھا۔ "تم اب کیا کرنا چاہتی ہو؟"

"باجی کچھ بننا چاہتی ہوں تاکہ کسی کی محتاج نہ رہوں میرے داغوں نے زندگی بے بار کر دی ہے، سارے گن ہونے کے باوجود بدصورت ہوں۔ لوگ دیکھنے آتے ہیں تو رد کر کے چلے جاتے ہیں، کب تک یہ سب سہوں اک عورت کی اس سے زیادہ توہین نہیں ہو سکتی کہ اسے رد کر دیا جائے، بغیر کسی وجہ کے۔" "یہ تو ہے" میں افسردہ ہو گئی۔

"پھر کیا کرنا چاہتی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"کبھی سوچتی ہوں کہ کالج میں داخلہ لے لوں کبھی سوچتی ہوں کہ نرسنگ کورس شروع کر دوں، آپ بتائیں کیا کروں"۔

"ویسے میرا خیال ہے کہ نرسنگ کر لو، تم مصروف ہو جاؤ گی تو اپنے دکھ بھول جاؤ گی۔ اس طرح ہو سکتا ہے تمہارے گلے کے اس لٹکے ہوئے گوشت کا بھی کوئی علاج مل سکے اور اگر فرض کرو زندگی میں ساتھ دینے کے لیے کوئی نہ بھی مل سکے تو کم از کم تم اپنی زندگی سے مطمئن تو ہو جاؤ گی نا"۔

"جی باجی میں ایسا ہی کروں گی" پھر وہ چلی گئی۔ چند دنوں کے بعد پتہ چلا کہ ساجدہ گنگارام ہسپتال میں نرسنگ کرنے چلی گئی ہے اسے داخلہ بھی مل گیا اور ہوسٹل میں جگہ بھی مل گئی۔ میں بھی شادی کروا کے پیا دیس سدھار گئی۔ وقت گزرنے لگا۔ گاؤں والدین سے ملنے تو جانا ہی ہوتا تھا۔ سامنے کی حویلی میں اماں فاطمہ بھی دیکھنے کو مل جاتی۔ چند ہی سالوں میں وہ بالکل کبڑی ہو گئی تھی آتے جاتے اس سے سلام دعا ہو جاتی تھی۔ ساجدہ کا حال بھی پوچھ لیتی۔ اس نے بتایا کہ اب اس نے ٹریننگ مکمل کر لی تھی۔ اسی ہسپتال میں ملازمت بھی کرنے لگی اور وہ خوش اور مطمئن تھی۔ مجھے سن کے بے حد خوشی ہوئی۔ میں نے دعا کی کہ اللہ اسے خوش رکھے۔ کچھ ہی عرصے کے بعد میرے شوہر کو دوبئی کی ایک کمپنی میں بڑی اچھی ملازمت مل گئی۔ فلیٹ بھی مل گیا تو انہوں نے مجھے اور بچوں کو دوبئی بلا لیا۔ انہی مصروفیات میں دو سال گزر گئے۔ پھر میرے شوہر نے دو ماہ کی چھٹیاں لیں کہ گھر والوں سے مل آئیں۔ میں نے لاہور میں کچھ وقت گزارا تو فوراً گاؤں جانے کی خواہش ہوئی۔ امی کو بتا دیا کہ آ رہی ہوں۔ گاؤں والے بے حد خوش تھے اتنی مدت کے بعد گھر گئی تھی۔ گاؤں پہنچ کر محلے والوں کے حالات پوچھے ہمسایوں سے ملاقات ہوئی۔ اچانک ہی مجھے اماں فاطمہ یاد آ گئی۔ گھر والوں سے پوچھا کہ وہ کیسی ہیں تو جواباً امی نے ایک بھیانک خبر مجھے سنائی کہ فاطمہ اور ساجدہ دونوں وفات پا چکی ہیں۔ میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ حیرت نے گنگ کر دیا۔ کتنے ہی سوال زبان پر مچلنے لگے۔ کب، کیوں، کیسے، کہاں...... امی نے بتایا کہ جب میں دوبئی گئی تھی تب تک وہ بالکل ٹھیک تھیں۔ ساجدہ اپنی نرسنگ میں مصروف تھی۔ پھر اچانک ایک دن علم ہوا کہ ساجدہ اپنے گھر آئی ہے اور باپ بھائیوں کے ساتھ شدید قسم کی لڑائی ہوئی تھی۔ مدعا یہ تھا کہ ساجدہ کو کسی ڈاکٹر نے پسند کر لیا تھا اور وہ اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ ساجدہ کو اور کیا چاہئے تھا اس نے یہ معاملہ باپ بھائیوں کے سامنے رکھا تو وہ صاف مکر گئے کہ لڑکا ذات برادری کا نہیں ہم اس سے رشتہ نہیں جوڑ سکتے۔ کبڑی ماں نے بہت منت سماجت کی کہ پہلے تو کوئی رشتہ نہیں ملتا اب مل گیا ہے تو رد نہ کریں مگر اچانک دیہاتی پن کی جاہلانہ غیرت جاگ اٹھی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ صرف نرسنگ کرنے گئی ہے کام کرنے یا وہاں دل لگانے کی اسے کوئی اجازت نہ تھی۔ "تم اب سے لاہور نہیں جاؤ گی" باپ نے سختی سے پابندی لگا دی۔ ساجدہ بہت روئی تڑپی، منتیں ترلے

کیے۔ اسے جانے کی اجازت مل گئی مگر کسی اور ہسپتال میں۔ یوں زندگی پھر سے چلنے لگی مگر اب زندگی "لنگڑا" کر چل رہی تھی۔ دکھ کے راستوں پر گھسٹتے ہوئے چل رہی تھی۔ ساجدہ ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ مصروف رہنے کی کوشش کرنے لگی۔ ڈاکٹر سے رابطہ بے شک ختم ہو گیا تھا مگر دل سے تو وہ نہیں نکل سکا تھا۔ ساجدہ کو اپنی زندگی کا فیصلہ خود ہی کرنا تھا۔ وہ بالغ تھی برسرِ روزگار تھی۔ زندگی اسے گزارنی تھی۔ اس نے ڈاکٹر خاور سے بات کی یوں دونوں نے کورٹ میرج کر لی۔ کچھ عرصہ تو یہ بات چھپی رہی مگر کب تک چھپی رہتی۔ بھائیوں کو پتہ چلا تو وہ کچھ عرصہ چپ رہے مگر اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتے ہوئے سوچ رہے تھے کہ کیا کریں، گاؤں میں بات پھیل گئی تو بے عزت ہو جائیں گے۔ پھر انہوں نے چال چلی، وہی ایک مکروہ سی دھوکے بازی۔ اپنی بہن کو بلایا کہ تم شادی شدہ ہو گئی ہو اپنا حق لے جاؤ۔ بہن سب کچھ بھول کر پھر سے دھوکے میں آ گئی۔ وہ گھر آئی، باپ بھائیوں کے تیور بدلے دیکھے تو ڈر گئی مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا کیا ہو سکتا تھا۔ اس نے ہر ممکن نکل بھاگنے کی کوشش کی مگر کوشش بے سود تھی۔ بھائیوں نے شدید تشدد کا نشانہ بنایا اور پھر رات کو بجلی کے جھٹکے دے کر اسے مار ڈالا۔ اتنی اذیت تو ساری زندگی نہ سہی تھی جتنی ایک رات میں سہہ لی۔ یہ کیسا انجام تھا۔ یہ کیسی غیرت تھی یہ کیسی محبت اور انسانیت تھی۔ زندگی دینا کتنا مشکل تھا اور جان لینا کتنا آسان۔ یہ کیسا قانون تھا کہ باپ بھائی خود انصاف دینے بیٹھ گئے کیا عورت اتنی بے وقعت چیز ہے۔ جو مرضی چاہے جیسے مرضی سلوک کرے۔ ساجدہ کا اتنا بھیانک انجام دیکھ کر بوڑھی بیمار اور کبڑی ماں بھی وہیں گر کر اللہ کو پیاری ہو گئی۔ دوہری مصیبت تھی محلے والوں کو بتایا گیا کہ ساجدہ نے خودکشی کر لی ہے تو ماں اس کے غم میں مر گئی۔ اگلے دن دونوں کو جلدی جلدی دفنا دیا گیا۔

نہلانے والی عورتوں نے دیکھا تھا کہ ساجدہ کے جسم پر تشدد کے نشانات تھے۔ بات گاؤں میں پھیلی تو ضرور مگر باہر نہیں نکلی۔ ڈاکٹر صاحب کو ڈرا دھمکا کر خاموش کر دیا گیا۔ پولیس تک بات جانے ہی نہیں دی گئی کہ کوئی کارروائی ہوتی۔

یہ دیدہ دلیری تو انہوں نے کر لی۔ غیرت کا بدلہ بھی لے لیا مگر اب اس گھر میں الو بولتے ہیں وحشت رقص کرتی ہے موت دبے پاؤں پھرتی ہے۔ دیواروں میں نوحے بھرے ہیں آہیں اور کراہیں ہیں۔ لوگ حتیٰ کہ ہمسائے بھی ان کے گھر نہیں جاتے۔ اک عجیب سا سوناپن ہے۔ ساجدہ کا باپ بوڑھا اور بیمار ہے اسے کوئی پوچھنے والا نہیں دونوں بھائی سارا دن چھاتی چوڑی کر کے گھومتے اور لوگوں پر دہشت بٹھاتے ہیں۔

امی نے ان کی ساری داستان مجھے سنائی تو مجھے بہت دکھ ہوا۔ میں اپنے غم کو سوائے ماں کے کسی سے بانٹ بھی نہیں سکتی۔ گھنٹوں سوچتی رہتی ہوں کہ اتنے امتیازی رویے کیوں ہیں سینکڑوں داستانیں ایسی ہی ہمارے اردگرد بکھری ہوئی ہیں۔ ہم انسان صرف ان کے بارے میں سوچتے ہیں بات کرتے ہیں پھر بھول جاتے ہیں۔ ہر بندہ منصف بنا پھرتا ہے۔ ہر شخص کے پاس جج ہونے کے اختیارات ہیں وہ خود وکیل، خود گواہ ہے اور بعض دفعہ تو جلاد بھی خود ہی بن جاتا ہے کہ کبھی تیزاب سے، کبھی آگ سے، کبھی گولی سے، کبھی پانی سے، کبھی رسی سے کسی بھی طریقے سے چھری، چاقو ٹوکہ، کلہاڑی، جو ہتھیار میسر ہو، اسی سے کمزور مخلوق کو نشانہ بناتا ہے۔ بے بس عورت کو جواباً دفاع بھی نہیں کر سکتی۔ ساجدہ اللہ تمہاری مغفرت کرے۔ شاید اس ملک میں کبھی امتیازی قوانین ختم ہو سکیں کوئی ایسا قانون بنے جو عورتوں کو تحفظ دے سکے! کاش ایسا ممکن ہو سکے۔



میرا کشمیر ...... میرا عشق

(رُوداد نیلم)

فرخ صابری

دنیا کی تمام بڑی اور زندہ زبانوں کی طرح...... اردو زبان میں بھی تمام اصناف نظم و نثر کے علاوہ سفرنامے بھی لکھے گئے۔ ابن انشا، بیگم اختر ریاض الدین اور مستنصر حسین تارڑ جیسے سفرنگاروں کی اس صف میں اب فرخ صابری بھی آ شامل ہوئی ہیں۔

فرخ صابری اپنے اچھوتے موضوعات اور منفرد طرز اسلوب کی وجہ سے بین الاقوامی سطح پر پذیرائی پا چکی ہیں۔ افسانہ نویسی، ناول نگاری، کالم نگاری، تذکرہ نویسی اور تحقیق و تنقید میں اپنا ایک مقام اور پہچان رکھنے والی یہ لکھاری مذکورہ بالا تمام اصناف کا دلکش مرقع "میرا کشمیر...... میرا عشق" لے کر آئی ہیں۔ جس میں افسانوی ماحول، ناولوں والی منظر کشی، کالم کا سا ایجاز و اختصار، تہذیب و تاریخ کا تحقیقی مطالعہ اور سب سے بڑھ کر یادوں کے دلخراش تذکرے "ہفت رنگ" دکھاتے ہیں۔

اس سفرنامے میں فرخ کا اسلوب، جذب و مستی میں ڈوبا "اللہ اکبر" کا کوئی نعرۂ مستانہ سا ہے۔ آس پر بھرپور تاثراتی ٹکڑوں کی پیوندکاری، وسیع ذخیرۂ الفاظ کا برمحل و برجستہ استعمال، کمال کا مشاہداتی انداز اور پھر متعلقہ علاقوں پر اٹھائے گئے دو نشتر سوال، اس سفرنامے کو منفرد مقام پر لے جاتے ہیں۔ اس تحریر کی نمایاں خوبی شعری و نثری ٹکڑوں کا جا بجا استعمال ہے۔ ساتھیوں کی چھیڑ چھاڑ اور منظر کشی میں انوکھی جزئیات طرازی ایسی خوبیاں ہیں جو محض فرخ کے قلم کی فسوں کاری ہی ہو سکتی ہے۔

ادب، تاریخ اور تہذیب میں رچے اس سرشار سفرنامے کو پڑھ کر، کشمیر جنت نظیر جانے کا لطف ہی کچھ "اور" ہے۔ دراصل کشمیر مصنفہ کا ایسا موضوع ہے جس پر وہ انہی صفحات پر ناول "آوارگی" (قسط وار) افسانے "بڑھنا" اور "شاہکار" کے علاوہ ایک ادبی و تحقیقی مقالہ "کشمیری افسانہ نگاروں کے ہاں کشمیری زندگی" پیش کر چکی ہیں (اس مقالے کو عالمی سطح پر پذیرائی ملی تھی)۔

اور اب...... فرخ صابری کا "سیارہ ڈائجسٹ" کے قارئین کے لیے "جنت" سے لایا ہوا اک نوشتۂ خاص "میرا کشمیر...... میرا عشق!" پیش خدمت ہے! (ادارہ)

باب ایک:

غالبؔ کی مکس...... اور "بلنو دیے کار" سے خالہ جی کے گھر تک

"کہیں کہیں جاناں جلو رہے کر؟" یہ سوالیہ فرمائش نامہ سب کے سامنے تھا۔ یہ غالباً مارچ 2014ء کی "بہار کا شاخسانہ" تھا کہ سٹاف ٹرپ کا نعرہ بلند ہوا اور ہوتے ہوتے ہماری پرنسپل کے گوش گزار ہوا۔ اور وہ کہ سدا سے ٹرپ، منظروں اور نئے نئے اچھوتے خیالوں کی خوگر۔

سو فوراً تمام سٹاف ممبران کی فہرست منگوائی اور ہمیں اس نادر شاہی حکم نامے کے ساتھ بھجوا دی گئی کہ "جنت وادی" کو جانے کے خواہش مند اپنے دست مبارک سے اپنے خواہش نامے پر دستخط کر دیں تاکہ جون کے وسط

میں جب کوچ کا نقارہ بجے تو کوئی بھگوڑہ بھاگ نہ سکے۔

دراصل گئے برسوں کے کئی گزشتہ مہینوں میں کتنے ہی پُر جوش پروگرام بنے اور بس بن کر رہ گئے۔

مگر "ہنزہ ویلی" تو "بلو دا کار" تھی۔ ہر کوئی جانے کو تیار۔ سبھی پُر جوش، بڑھ چڑھ کر نام ونشاں وسخط زدہ ہوئے۔ پورے ممبران کو موضوع بحث و مباحثہ ہاتھ لگ گیا لیکن مختلف تین دن کی پر جوش بحث و تمحیص اور کئی گھریلو وغیر گھریلو وجوہات کی بنا پر وہ Wish List جب Shoty List ہوکر سامنے آئی تو مختصر گیارہ خوش نصیبوں نے ہنزہ ویلی کو شرف نظارہ کا اعزاز بخشا تھا۔

اور سراسر "مردانہ نظام حیات" کے اس سماج میں، یہاں اک انہونی سی بھی ہوگئی تھی کہ زنانہ کی بجائے مردانہ فہرست کچھ زیادہ ہی "شارٹ لسٹ" تھی۔

ارمانوں، خوابوں، خیالوں کی وہ وادی اور مردانہ امیدوار بس دو۔

ہمارے پُر جوش پروگرام پہ پہلی کاری ضرب یہ لگی تھی۔ پرنسپل اساتذہ کی اس "اسنادی" پر حسب سابق بددل ہوئیں اور برافروختہ بھی۔ اب روانگی کچھ مشکوک بھی ہوگئی تھی اور بہت حد تک مشروط بھی۔

یعنی اس میں کافی سارے...... اگر مگر شامل کردیئے گئے۔

اور "عملی منصوبہ بندی" کا مرحلہ آیا تو اور شب خون ہمارے ارمانوں پر مارا گیا۔ پتہ نہیں کس کی جانب سے؟ البتہ وہ وش لسٹ عرف "شارٹ لسٹ" سرے سے ہی غائب تھی گو با عشاق ہنزہ ویلی کا دستخط ریکارڈ ندارد کئی چہروں پر رونق پھر گئی۔

کہ کچھ تو مارچ کی بہار اور جذبات کی رو میں آکر دستخط کر بیٹھے تھے اور اب مئی جون کی مسموم ہوائیں ان جذباتی خواہشوں کو پھسلا تھیں۔

اور کئی "حکم حاکم مرگ مفاجات" پر سختی سے کار بند رہتے ہوئے مصاحبوں میں نام لکھوا بیٹھے تھے (کہ پرنسپل کو یہ ٹرپ خود لے کر جانا تھا) سو اب نقارۂ کوچ بے حد مشکوک و مشروط ہوگیا تو ان کی جان میں جان آئی۔ اور چہرے پُر نور ہو کر دمک اٹھے۔ اب اس تمام مذکورہ بالا صورت حال میں، ہمارے ارمانوں کو تاخت وتاراج ہوکر سکنے سے کون روکتا؟

واقعی غالب وہ مگس والا گور کہ دھندہ خوب اور بڑے "اور" انداز میں کہہ گئے تھے۔

مگس کو باغ میں جانے نہ دینا
ناحق پروانوں کا خون ہوگا

غالب کے تخلیقی امکانات کی بروئے کاری اور پھر اس شعر میں ان کا نکتہ عروج اس فلسفیانہ سوچ اور منفرد حکیمانہ نکتہ طرازی کی اصل تفہیم وتشریح تو کوئی ماہر غالبیات ہی کرسکتا ہے مگر ہمارے ابا کی یہ خالص دیسی چندو تفسیر بھی کچھ کم اہم نہیں ہے جو ہمارے بچپن میں ہمیں سکھائی گئی کہ غالب نے مگس یعنی شہد کی مکھی کو باغ میں جانے سے اس لیے روک دینے کا صائب مشورہ دیا تھا کہ یہ باغ میں فساد کی جڑ بنے گی۔ یعنی چھتہ لگائے گی۔ مکھیوں کا سلسلہ حسب ونسب فروغ پائے گا۔ موم بنے گی اور پھر موم بتی بھی بنے گی۔ موم بتی روشن بھی ہوگی۔ تب پروانے بھی آئیں گے۔ آئیں گے تو پروانہ وار جان بھی دیں گے۔ اور یوں کئی "ناحق خون" ہو گئے۔

تو جناب! اصل جڑ فساد...... یعنی مگس کو روک سکتے ہو تو روک دو۔ کہ نہ ہوگا بانس نہ بجے گی بانسری۔

مگر ہمارے سٹاف روم میں بانسری تو ایک طرف ۔ ہمارا تو جینڈ بج چکا تھا۔ "ہنزہ ویلی ٹرپ کینسل" ہر طرف یہی نقارہ بج رہا تھا۔ کیونکہ فہرست غائب ہو جانے پر جھگڑا فہرست طویل ہوتی گئی اور شائقین صرف چار رہ گئے۔ جو آخری دم تک مردانہ وار ڈٹے رہے حالانکہ وہ سب کے سب زنانہ تھے۔

طاہرہ کلثوم شہزادی جمیلہ سعدیہ سرور اور راقم الحروف فرخ صابری۔

اصل کہانی اب شروع ہوئی۔

کیونکہ ہم چاروں نے "چار کا ٹولہ" بنایا اور محاذ پر ڈٹ گئے۔ ہمارا اصل قصور یہی تھا کہ ہم ڈھے جانے کی بجائے ڈٹے رہے۔

اور اپنے خون چکیدہ ارمانوں کو نیا ولولہ اور جوش دلاتے ہوئے بانگ دہل اعلان کر دیا کہ ٹرپ جائے نہ جائے اور دم خم ٹھونک کر خود میدان میں اُترے۔ چاروں نے پکا تہیہ کر لیا کہ جائیں گے ہم ضرور۔ چاہے اب وہ پیا دیس جہاں ہم جانے کا پُر شوق ارادہ باندھتے رہے تھے خود اٹھ کر ہماری راہ میں آ حائل ہوں۔

ہم جائیں گے ضرور۔

تو جناب! اصل کہانی اب شروع ہوئی۔

اب ہم تھے اور کمپیوٹر ورک تھا۔ ایک طرف پرچوں کی جانچ پڑتال اور امتحانی کارگزاریاں نکتہ عروج پر تھیں اور دوسری طرف ہم انٹرنیٹ کے ذریعے "نگری نگری پھرا مسافر، گھر کا رستہ بھول گیا" کے مصداق سرگرداں تھے۔

اور اکثر سرگراں بھی ہو جاتے۔

ہمارے ذوق وشوق کو تختہ مشق بنانے اور تمسخر اڑانے کی دوستانہ کوششیں ہوتیں مگر ہمارے ارادے متزلزل نہ ہوئے کبھی کبھار ذرا سا ولولوں پر اوس پڑی تو ہوش ربا اخراجات اس کا سبب تھے۔ بالآخر کئی دنوں کی دیوانہ وار تحقیق اور ذہنی بھاگ دوڑ کے بعد ایک دن ہم اس اعلان پر مسرت کے قائل ہو گئے۔

"جون کے وسط میں ہم کشمیر وادی نیلم جا رہے ہیں" یہ اعلان ہمارے لیے نئی جگ ہنسائی کا سبب بن جائے گا۔ ہمیں یہ خبر نہ تھی۔ سینکڑوں خدشات، ذاتی تجربے، ڈراوے اور لطیفوں نے ہمیں تختہ مشق بنا لیا۔

مرے کو مارے شاہ مدار۔

ہمیں اچھی طرح ذہن نشین کرانے کی کوشش ہوئی کہ یہ نام نہاد سیاحتی پروگرام "ہلو دا کا دیکھیں" اور نہ ہی اس جوئے شیر کو کھود لانے کا منصوبہ خالہ جی کا گھر ہے۔

پہلا اعتراض "یارانِ نکتہ داں" کے نزدیک یہ تھا کہ وادی نیلم کیوں وادی ہنزہ کیوں نہیں؟

اگلا خدشہ...... وادی نیلم جانا دنیا سے چلے جانے کے مترادف ہے۔ سڑکیں انتہائی تنگ۔ ناموافق اور ٹوٹی پھوٹی ہیں۔

ایک اور خدشہ...... سنا ہے دریائے نیلم کا بہت سا حصہ پاکستان اور بھارت کا سرحدی فریضہ انجام دیتا ہے۔ ان حصوں میں بھارتی فائرنگ ہو جانا آئے دن کا معمول ہے۔

ہمارے جغرافیہ کے سینئر استاد نے تو میری مذکورہ تینوں ساتھیوں کو ایک دن روک کر تمسخرانہ دھمکی دی "یہ تم لوگ مس فرخ کو اس عمر رفتہ میں کہاں خوار کراتی پھرو گی؟"

(انہیں خبر ہی نہ تھی کہ فساد کی اصل جڑ تو خود مس فرخ ہے، یعنی غالب کے باغ کی گلِ...... جو باقی تینوں کا خون ناحق بھی گردن پر لینے کو تیار ہے)

ہماری ایک ساتھی ہر صبح مسخرانہ انداز میں ہماری خوب خبر لیتیں۔
"ہو آئے کشمیر سے؟"
ہم ساری جلن...... تمام تر پیچوں بچاں کو گرفت کر کے بڑی مہذبانہ سعادت میں رچ کر جواب دیتے۔
"کوشش تو ہو رہی ہے۔ دیکھیے! نصیب میں ہوگا تو چلے جائیں گے۔ آپ بس دعا کریں"۔
"انشاءاللہ! انشاءاللہ!" دعائیہ کلمات کا فریضہ بمشکل ادا کر کے وہ ہنسنے لگتیں۔

اور ہمارے سینے پر سانپ لوٹ لوٹ جاتے۔ ویسے یہ کا ذخیر ہماری نسبت کئی "اور" بڑی عمر کی سے بچارے تھے کہ اُن کے سینوں پر سانپ لوٹ لوٹ جاتے اور ہماری اس "زنانہ مہم جوئی" کو احمقانہ جذباتی اور پیسے کا زیاں کہہ کر دل کی بھڑاس نکال لیتے۔

ایسے ناسازگار حالات میں...... چند تھے جو دلی درد کے ساتھ ہمارے دل کا درد سمجھتے تھے۔ جنہوں نے ہمارے پرجوش جذبوں کو جلا بخشی۔ ہمارے حوصلے بڑھائے ہمارے مرتب شدہ پروگرام میں اپنی ترتیب و تدوین کو بڑھ چڑھ کر استعمال کیا۔ ہماری کسی بھی ترمیم میں حق ترمیم اپنے ذمے لیا۔
الغرض ہماری منصوبہ بندی...... کپڑوں کا انتخاب سامان کی فہرست...... ضروری شاپنگ میں مفت مشورے دہاں رہائش میں گھریلو ٹوٹکوں کی بھیں...... سب اُن کی زیرِ ہدایت پایہ تکمیل کو پہنچا۔
کبھی کبھار تو عقل دنگ رہ جاتی تھی کہ جا کون رہا ہے؟ ہم یا وہ؟
بہرحال...... آخرکار گئے تو ہم ہی...... مگر اُن کے صائب مشورے اور بے پناہ یادیں پورے سفر میں ہمارے ہمرکاب رہیں۔

باب دوم:

...... کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے

اور بالآخر ٹرین چل پڑی...... مگر اس چل چلاؤ میں بڑی ہی من موجی تھی۔ کبھی ترنگ میں آجاتی اور کبھی بی چھوٹی کو دستہ دینے بیٹھ جاتی کہ
"نہیں بی چھوٹی! پہلے آپ...... میں تو "ایکسپریس" ہوں تیز چلنا میرے ماتھے پہ لکھا ہے ساڑھے دس...... راولپنڈی پہنچ کے دکھاؤں گی...... روز پہنچ جاتی ہوں...... یہ میرا اشتہاری دعویٰ ہے اور اخباری پر کشش مہم بھی"۔
ہم اسی اشتہاری مہم سے متاثر ہو کر ہی تو بکنگ کروا بیٹھے تھے کہ "ایک پنتھ دو کاج" کے مصداق ٹرپ کے مزے تو ہیں ہی۔ لگے ہاتھوں ٹرین کا سفر کر کے بچوں کو خود اپنے بچپن کے لطف و سرور کا حقیقی تجربہ کروایا جائے۔ تاکہ آئندہ وہ اپنے بچوں کو فخریہ انداز میں بتا سکیں کہ پاکستان میں فلاں فلاں سن ٹریک ہوا کرتے تھے۔ جہاں بچے کرکٹ کھیلنے کی بجائے ٹرینوں کی آمدورفت دیکھا کرتے تھے۔
میرے بچے...... اور سرور دنگ کے بچے انتہائی بیزار انداز میں "ایکسپریس ٹرین" کی داستانوں کو اپنے دل پہ لے رہے تھے۔

اور اس وقت پونے سات بج چکے تھے اور ایکسپریس ٹرین نے ابھی اصل مقام یعنی لاہور ریلوے سٹیشن پہنچ کر اپنی ابتدا کرنا تھی اور آگے اس ایکسپریس ٹرین کی "من مرضیاں" کیا گل کھلائیں گی یہ کہنا قبل از وقت تھا۔ فی الحال تو ہم میر تقی میر کو حسبِ حال کہہ سکتے تھے۔

سیارہ ڈائجسٹ کی ایک عظیم الشان پیشکش

صحابیاتؓ نمبر

شائع ہو گیا ہے

- 100 سے زائد صحابیاتؓ کا تذکرہ پاک جنہوں نے رسول اکرم ﷺ سے بیعت کی۔
- ان عظیم خواتین کا تعلق ہر شعبہ زندگی سے تھا۔
- اس خصوصی نمبر میں ملاحظہ کریں اس صحابیہ کا ذکر جسے مدینہ منورہ میں امامت کروانے کے سب صحابہ کرام نے خطیبۃ النسا کا خطاب دیا۔
- ایک مظلوم صحابیہ کا قصہ جسے آپ ﷺ نے مسجد نبوی کے صحن میں رہائش کیلئے جگہ دی۔
- مدینہ منورہ کی پہلی خاتون انسپکٹر کا ذکر جن کے ذمہ منڈیوں کے بھاؤ کی جانچ پڑتال کرنا تھی۔

اور اس کے علاوہ بہت سے دلچسپ واقعات ہر واقعہ کے ساتھ مستند کتب کے حوالا جات درج ہیں۔

قیمت: 160 روپے

یہ ایک علمی تاریخی اور تحقیقی دستاویز ہے جس کے بغیر آپ کی لائبریری نامکمل ہے

سیارہ ڈائجسٹ: 240 مین مارکیٹ ریواز گارڈن لاہور۔ فون: 37245412

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

بھئی! لگ پتے جان گے!

اور ہمارے آگے بھی اچھی خاصی پریشانی تھی۔ ہماری لاہوری ٹرپ پارٹی کے تین مستعد متاثرین ''سامان بکف'' گزشتہ پون گھنٹے سے سگنل اور پٹڑی پر نظریں بچھائے ہمہ تن تیار کھڑے تھے۔

اور ادھر ایکسپریس کی ''من مرضیاں'' جاری تھیں اور اُدھر سرو وِنگ کی ان ...... نادیہ کی نخوت' بیزاری اور لاتعلقی نکتۂ انتہا کو پہنچ چکی تھی۔

یہ ناگوار فضا ختم کرنے اور خود اپنی قلبی تشفی و تسکین کی خاطر بار بار کالیں کی جا رہی تھیں کہ اب ٹرین یہاں ہے اب ایکسپریس وہاں ہے۔

اور بالآخر ساڑھے پانچ لاہور سٹیشن سے کوچ کر جانے والی اسلام آباد ایکسپریس چھ بج کر پچاس منٹ پر چنگھاڑتی' سیٹیاں بجاتی لاہور کے تاریخی ریلوے سٹیشن سے ہم کنار ہوئی تو ہمہ تن تیار متاثرین......مسافروں کی صورت اس کی قدم بوسی کو لپکے۔

اس لپک جھپک میں عقیدت کی جگہ اضطرار اور نفسانفسی کا منظر زیادہ تھا۔ اِدھر ہم اپنے ''سامان بکف'' دستے کو دیکھ چکے تھے۔ اشارے کیے جا رہے ہیں۔ فون آزمائے جا رہے ہیں۔ اُن کی کوتاہ فہمی اور کم نظری پہ ہنسا جا رہا ہے کہ سامنے سے بوگی گزر گئی ہے اور کم عقل پھر بھی بھاگے چلے جا رہے ہیں۔

بالآخر اپنے دونوں چھوٹے رنگروٹوں کو بگٹٹ بھگایا۔ اس تاکید پر اصرار کے ساتھ کہ فلاں کپڑوں والی باجی کو کہو کہ اُن کی سیٹیں یہاں ہیں۔

''کوئی اور نشانی؟'' پریشاں حال محسن سرور فرماں بردار کی سے سوال کناں ہوا تو مزید تاکید کو پختہ کر دیا ''اُن آنٹی کی آنکھیں بڑی خوبصورت ہیں' پہچان جاؤ گے'' شریف صورت محسن کے بال کھڑے ہو گئے اور چہرہ مزید پریشان ہوا تھا۔ وہ بارہ بجے انداز میں بولا:۔

''جی اچھا!''

اور ہمارا سارا کیبن زعفران زار ہو گیا۔ سب اپنی اپنی ہنسیاں ہنس رہے تھے۔ مگر میں اپنی بتائی ہوئی نشانی پر مصر تھی اور پتھر پر لکیر تھی...... نادم ہونے کا دور دور تک نام و نشان نہ تھا۔

اور پھر کچھ بھاگ دوڑ کے بعد' وہ خوبصورت آنکھوں والی شہزادی جمیلہ اپنی تمام تر وحشتوں کے ساتھ' بمعہ ساز و سامان آن پہنچیں۔

ساتھ حواس باختہ طاہرہ کلثوم اور اُن کے مستعد میاں بھی چلے آ رہے تھے۔ سامان کی تیزی سے ٹھونسا ٹھانسی ہوئی کچھ بیٹھنے بٹھانے کا معاملات حل ہونے اور کچھ حل پذیر معاملات کے لیے ہمارا سارا ''مردانہ دستہ'' منسلک کوچ کی جانب کوچ کر گیا۔ وہاں ہماری چار سیٹیں تھیں۔ لاہور ریلوے سٹیشن کو اسلام آباد ایکسپریس نے زیادہ گھاس نہ ڈالی اور کوچ کا نقارہ بجا دیا۔

جلد ہی ٹرین نے رفتار پکڑلی۔

منظر تیز ہونے لگے...... دو موریہ پل کی وہ بے ہنگم ایک دوسرے میں گھسی گھسی ٹریفک...... ٹریک پر چڑھے

چڑھے وہ کئی کئی منزلہ یک مرلہ پلازے...... آڑھے ترچھے مکان...... ان مکانوں سے لٹکتے بوسیدہ پردے۔ بالکل پٹڑی سے لگے ادھ ننگے بچے...... کچھ رفع حاجت میں مشغول چند ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے۔

ٹرین نے مزید رفتار پکڑ کر، خود کو "ایکسپریس" ثابت کرنے کی جیسے ضد پکڑ لی۔

اب وہ دریائے راوی کے اوپر سے گزر رہی تھی۔ جو بس اب راوی رہ گیا تھا۔ دریا والا معاملہ اس جون میں بھی مشکوک سا تھا۔ کیا اب راوی کے لیے کوئی گلیشیر نہ رہا تھا جو وہ بہتا ہی نہ تھا بس چپ چاپ لیٹا رہتا تھا۔ اور دیکھتا تھا کہ فیرنگی قدرت کیا ہے؟

کبھی کسی زمانے میں، ماہرین ارضیات عرض کیا کرتے تھے کہ لاہور ایک آتش فشاں کے دہانے پر واقع ہے۔ اس کے اندر ہی اندر لاوے اُبلتے پھر رہے ہیں۔ یہ ساری راوی دریا کی ٹھنڈک ہے کہ وہ ان لاووں کو پھٹنے نہیں دیتا۔ مگر ہمارے ابا جیسے درویش منش ہمیں بتایا کرتے تھے کہ راوی کنارے داتا گنج بخشؒ کا بسیرا رہا ہے۔ اب مزار ہے یہ داتا کی نگری ہے۔ علی ہجویری مظہر نور خدا تھے۔ آپ فیض عالمؒ کل عالم اور کل زمانوں کے لیے ہیں۔ پھر سوچو کہ داتا کی نگری سے لاوے کیسے پھوٹیں؟

اور جب طالبان نے داتا کی نگری اور خود "داتا دے دربار" میں خون کے دریا بہا دیے۔

تو مجھے ان عقیدتوں اور ان وحشتوں کا کوئی جواز نہیں ملتا تھا۔

ہاں! داتا دا دربار...... آج بھی برصغیر کا بارونق ترین دربار تھا۔

ٹرین نے رفتار کو اور مہمیز کیا اور ہماری سوچ و مستی کو بھی ہوا دی اور ابھی ہم ترنگ میں مبتلا بھی نہ تھے کہ اُس نے پہلے دو تین جھٹکے کھائے...... اور پھر لمبا جھٹکا کھا کر رُک گئی۔

سب متوحش نظروں سے مجھے دیکھنے لگے اور مجھ فساد کی اصل جڑ نے کھڑکی کے باہر دیکھا۔ باہر کے ساکت وجامد منظر مزید سلگنے لگ چکے تھے۔ افلاس گزیدہ سے۔

اور پھر وہ جانا پہچانا منظر...... تب میں نے اپنے ساتھیوں کو تاریخی تہذیب کا دلاسا دیا۔

"وہ دیکھو...... نور جہاں کا مقبرہ"۔

"کون نور جہاں؟ میڈم نور جہاں! ملکہ ترنم نور جہاں؟" کسی بچے نے پھبتی کسی اور کیبن میں ہنسی کا نیا فوارہ پھوٹ پڑا" بھئی! وہ نور جہاں تو کراچی میں دفن ہیں۔ اللہ نے بڑا وقت دیا۔ رمضان میں اور وہ ستائیس رمضان میں فوت ہوئیں مگر ہم انسانوں نے اُسے گندے نالے کے قریب دفن کر دیا۔ وہ برصغیر کی ہی نہیں دنیائے موسیقی کی عظیم مغنیہ تھیں"۔

ہم نے اپنی شوبز صحافت و معلومات کی پٹاری کھولنا چاہی" تو پھر یہ نور جہاں؟"

میں نے دیکھا یہ نور جہاں"۔ جالی کا نمونہ تھی یہاں کم گشتہ تھی۔ وہ کسی وحشی کی قبر۔ آج سے لگ بھگ تیس سال پہلے ہماری ادبی و ثقافتی تنظیم "لان کلچرل سوسائٹی" نے یہاں کا خصوصی سروے کیا تھا تو ہم ناکوں پہ رومال رکھ رکھ کر شاہدرہ کی اس بستی میں پہنچے۔ تب پٹڑی کی دوسری طرف شہنشاہ عالم نور الدین جہانگیر کا عالیشان مقبرہ تھا۔

"یہ بھی اک جہاں کا نور تھی، جسے شہزادہ سلیم 'نور محل' کہہ کر اپنی پسندیدہ بیگم بنا دینا چاہتا تھا...... کہ دل کی طرح اس کا حرم بھی کشادہ تھا اور انارکلی...... ہماری رومانوی تاریخ کا سب سے عبرتناک انجام پا جانے والی انارکلی...... زندہ دیوار میں چنوائی جا چکی تھی...... سو شہزادہ سلیم دل کے بہلاوے! کثرت شراب نوشی کرتا۔ وسیع

وہ بعض حرم کو کشادہ کرتا رہا اور زنجیر عدل کے دم خم پر "انصاف" کرتا رہا۔

اب یہ بھی تو انصاف ہے نا، کہ اپنے ایک فوجی شیر افگن علی قلی خاں کی نوخیز منکوحہ پسند آئی۔ سو انصاف کا تقاضہ یہی تھا کہ وہ دنیا سے ہمیشہ کے لیے منہ موڑ جاتا۔ شہنشاہ وقت کی کشادہ دلی دیکھیے کہ بیچاری بیوہ اور وہ بھی لاڈلی بیٹی کی ماں ...... اُسے اپنے حرم کی "پسندیدہ زینِ ملکہ" بنا لیا۔ اس کے بے پناہ حسن کی داد دی اور حکومت کے ان گنت اختیارات دے کر خود قریباً قریباً حکومتی پریشانیوں سے کنارہ کش ہو گئے تا کہ کثرت شراب نوشی کے نئے ریکارڈ "تزکِ جہانگیری" میں درج کرا سکیں۔ پتہ نہیں بزورِ شمشیر یا بجبر زنجیر جہانگیری عدل؟"

بہر کیف! مغلیہ سلطنت خوب فروغ پذیر ہوئی۔ جس کی ایک بڑی وجہ اس خستہ مزار والی نور جہاں کی ذہانت و فطانت بتائی جاتی ہے۔ ایرانی النسل اور قندھار میں جائے پیدائش والی مہر النساء ...... مغلیہ ہندوستان کی سب سے مشہور ملکہ قرار پائی اور عملاً ہندوستان پر حکومت کی یہاں تک کہ اُس زمانے میں "مغلیہ سکہ رائج الوقت" پر ملکہ کا نام بھی چلا تھا۔

ایرانی تہذیب اور شاعری خوب پروان چڑھی۔

نسواں فیشن نے صنعت کا درجہ پا لیا۔ کپڑوں اور زیورات دونوں میں۔ مصوری کے سر پہ شفقت کا ہاتھ رکھا گیا۔

اور جب آرکیٹیکٹ شہنشاہ شاہ جہاں جیسے باغوں کے رسیا بادشاہ نے بزورِ نگوار تاریخ کا دھارا بدلا تو یہی مہر النساء المعروف نور جہاں کو اُس نے نظر بند کرا دیا۔

اور سنا ہے کہ وہ تب بھی باغ و باغیچے گل و گلزار کرنے میں معروف رہتی تھیں۔

مگر اس زرخیز ترین سے ...... اُس باذوق و حسین ملکہ کا جو بدحال مزار نظر آ رہا تھا وہ تو ساحر لدھیانوی کے شعری نوحے کا جیتا جاگتا "مردہ مزار" تھا۔ کہ وہ ان بدنصیبوں میں تھیں جو زندگی کی طرح، موت کے بعد واقعی مر جاتے ہیں۔

مردہ قبروں والے مردہ نصیب شاندار لوگ۔

ویسے یہ ترقی پسند ادیب و شعراء بھی کمال کے لکھاری ہیں حال ہو کہ ماضی ...... کوئی نہ کوئی عیب اور نقص ہی تلاشیں گے ...... اور یہ ساحر لدھیانوی ...... میرے باس حمید اختر کے یارِ غار اور ترقی پسند تحریک کے ہراول دستے کے مجاہد تھے ...... ساحر لدھیانوی نے ہر معاشی، معاشرتی اور تہذیبی و تاریخی حقائق کو "میں نہ مانوں" والی تکرار سے بس رد ہی کیا ہے کسی نے سات عجائبات کے حسین محبوبے تاج محل کے حسن سے متاثر ہو کر کہہ دیا کہ

اک شہنشاہ نے بنوا کے حسین تاج محل
ہم غریبوں کو محبت کی نشانی دی ہے

ساحر ...... کہ جو تمام شہنشاہوں' اُن کے مقبروں اور اُن کے بنائے ہوئے مقبروں پر لعنت بھیجتے تھے جھٹ کہہ دیا نظم "تاج محل" کی صورت:۔

اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اُڑایا ہے مذاق

اب سچا کون؟ یہ تو محبت کرنے والے اور محبت دفن کرنے والے جانیں۔ ہم تو اس وقت "اسلام آباد ایکسپریس" کے تکنتا انجماد کے شکار تھے۔ میری نظریں فضائی و ذہن آلودگی میں دھنسی "نور جہاں" کے خراب حال مزار پر منڈلاتی تھیں اور ذہن مغلیہ عہد جبروت میں گھومتا تھا اور ساحر کی وہ نظم کھوج کھوج کر یاد کرتا تھا جس میں

اُن کا اپنا نکتۂ نظر تھا اپنی عینک سے وہ فرعونیت، آمریت اور استعماریت کے استعاروں کو بہانگ دہل للکارتے تھے اور "نور جہاں کے مزار پر" کھڑے ہو کر دل کے تار چھیڑتے تھے کہ

کبھی سہمی سی فضاؤں میں یہ ویران مرقد
اتنا خاموش ہے فریاد کناں ہو جیسے
سرد شاخوں میں ہوا چیخ رہی ہے ایسے
روح تقدیس و وفا مرثیہ خواں ہو جیسے

تو مری جان! مجھے حیرت و حسرت سے نہ دیکھ!
ہم میں کوئی بھی جہاں نور و جہاں گیر نہیں
تو مجھے چھوڑ کے، ٹھکرا کے بھی جا سکتی ہے
تیرے ہاتھوں میں، مرے ہاتھ ہیں زنجیر نہیں!

"یہ مس فرخ کہاں گم ہیں؟" سعدیہ سرور نے پراشتیاق انداز میں پوچھا۔

"اپنے کسی افسانے کے کردار کی کنز یومنٹ میں مصروف" ہماری والی شہزادی نے ایک رومانوی سی گرہ لگائی "یہ لکھاری لوگ ہر جگہ اپنی کہانیاں ڈھونڈنے بیٹھ جاتے ہیں"۔

میں پھیکے انداز میں مسکرا دی۔ اس وقت چھیڑ چھاڑ کا موڈ نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے آنکھیں موند لیں۔ اور اپنے پسندیدہ رائٹر کے ساتھ اس تہذیب و تاریخ میں بدروح کی طرح بھٹکنے لگی۔ نور جہاں کو کتنا بدنام کیا گیا مگر اس کی نازک رگیں کس نے ٹٹولیں؟ اُس نے جواں شوہر کی میت پہ کیا کیا بین کیے ہوں گے؟ اُس نے اپنی محبت کے قاتل شہنشاہ کے لیے اپنی سیج کس دل سے سجائی ہوگی؟

کون؟ کون جانے؟

مگر ساحر جانتا تھا اُس نے کتنی صدیوں بعد اس خفتۂ قبر کے افسانے افشا کیے تھے۔

پہلوئے شاہ میں، یہ دخترِ جمہور کی قبر
کتنے گم گشتہ فسانوں کا پتہ دیتی ہے
کتنے خونریز حقائق سے اٹھاتی ہے نقاب
کتنی کچلی ہوئی جانوں کا پتہ دیتی ہے
کیسے مغرور شہنشاہوں کی تسکیں کے لیے
سال ہا سال حسیناؤں کے بازار لگے
کیسے بہکی ہوئی نظروں کے تعیش کے لیے
سرخ محلوں میں جواں جسموں کے انبار لگے
کیسے ہر شاخ سے منہ بند مہکتی کلیاں
نوچ لی جاتی تھیں تزئینِ حرم کی خاطر
اور مرجھا کے بھی آزاد نہ ہو سکتی تھیں

"ظلِ سبحان" کی الفت کے بھرم کی خاطر
کیسے اک فرد کے ہونٹوں کی ذرا سی جنبش
سرد کر سکتی تھی بے لوث وفاؤں کے چراغ
لوٹ سکتی تھی دمکتے ہوئے ہاتھوں کا سہاگ
توڑ سکتی تھی مئے عشق سے لبریز ایاغ
سہمی سہمی سی فضاؤں میں یہ ویران مرقد
اتنا خاموش ہے فریاد کناں ہو جیسے

"بھئی! سب لوگ اس قدر خاموش کیوں ہیں؟" یخ بستہ کیبن میں کسی کی بیزار آواز ابھری تو میں چونک اٹھی۔
"کہاں ماضی اور کہاں حال کا یہ پر جوش سفر...... جہاں ہم سب عازم کشمیر تھے اور فی الحال سوئے اسلام آباد تھے۔ ٹرین فراٹے بھرتی گوجرانوالہ کی جانب رواں دواں تھی۔
شاہدرہ کہیں بہت پیچھے رہ چکا تھا۔
تاریکی گہری ہو رہی تھی اور میرا گوجرانوالہ آنے والا تھا۔ جو میرا شہر تھا۔
جو امیر تاپرجم کا شہر تھا۔
جو عدم کا شہر تھا۔
میں عرصہ ہائے دراز کے بعد اس کے سٹیشن سے گزرنے والی تھی جس کے پہلو سے اک سڑک نکلتی تھی اور دریائے چناب سے نکلی سب سے بڑی نہر "اپر چناب" عبور کرتی میرے گاؤں کو جاتی تھی۔ میرا گاؤں فیروز والا۔ جہاں میں نے اپنے بچپن اور لڑکپن کے چندرہ سال گزارے تھے۔ کھیلا بچپن گاتا لڑکپن حسین ترین بچپن۔
مگر افسوس! رات کے اس سے سب تاریکی میں لپٹا ہوا تھا۔

باب تین:۔ یہ ساری "ن" کا قصہ ہے!

اس ہنستی گاتی، موج مستی میں ڈوبی زندگی میں ہوتے ہیں کچھ لوگ کہ جو بہت سی "ن" کا وزن اٹھائے اٹھائے اسے اپنی مرضی سے گزارنے کی کوشش کرتے ہیں۔
نئے ماحول سے ناخوش۔
نئے لوگوں سے نالاں۔
نئی فضا کے چنگل میں پھنسے ناگواری کا جیتا جاگتا نمونہ وہ اک نو وارد لڑکی...... جو "ن" سے نادیہ تھی اور جو "ن" سے سارے نخرے اپنی کھڑی کھڑی ناک پہ رکھے اس یخ بستہ کیبن میں یوں داخل ہوئی تھی کہ جیسے ناگواری کا اٹل فیصلہ پہلے ہی کر رکھا ہو۔ اس نے چند لمحوں اپنی ستواں ناک کو ماحول سونگھنے کا کام سونپا اور پھر جھٹ بھاری بھرکم بکسوں اور دیگر الم غلم کی "سیٹنگ" میں مصروف ہو گئی۔
پتہ نہیں کیوں وہ شکل میری پہچان میں ابھرتی ڈوبتی رہی پتہ نہیں کیوں؟؟
میرا ذہن الجھ سا گیا۔ اس وقت بھی جب وہ ڈھیروں ڈھیر انگریزی کی ہم "اردو دانوں" پہ دھاک بٹھا کر خود بھی سیٹ پہ بیٹھ گئی۔ پھر کونے کی طرف لڑھک گئی اور بند کھڑکی کے شیشے سے باہر ماحول کو بے معنی اور بیزار نظروں

سے دیکھنے لگی۔ اس کی ساری بناوٹی توجہ کھڑکی سے باہر تھی۔ یوں جیسے وہ کیبن کے بخ بستہ ٹھنڈے ٹھار ماحول سے فرار چاہ رہی ہو۔ یہ نخرے اور ناگواری کی دیواروں میں چنی نادیہ سرور، اتنے دن اس ''لاہوری بھانڈ پارٹی'' کی مصاحبت کے ساتھ وقت کیسے گزارے گی؟

میں نے دکھ سے سوچا اور پھر اپنی چہرہ شناسی کی علت پر لعنت بھیج کر کیبن سے باہر نکل گئی۔ یہ جواز دیتے ہوئے کہ ''میں ذرا اسعد کو دیکھ لوں'' وہ بھی ہمیشہ کا مردم بیزار۔ یہ جواز گھڑ کے ٹرین کے دروازے میں کھڑا تھا کہ روانگی کے گارڈ کی ساری کارروائی بہ نظر غائر دیکھوں گا۔ میں نے کچھ وقت اس کے ساتھ گزارا۔ زبردستی چند باتیں شیئر کیں۔ بچپن میں سٹیشن سے خریدے پکوڑوں اور سموسوں کی لذت بتائی۔

مگر وہ خالی خالی نظروں سے دور آسمان کو تکتا رہا تھا۔

میں واپس کیبن میں لوٹ آئی تو تب تک ان۔ نادیہ اپنی تمام تر ''ن'' کے ساتھ بدستور لاتعلق تھی۔ کسی دیسی لاٹ صاحب کی طرح جس نے فرنگی اپنا اکڑ اور خوبو چھوڑ گیا ہو۔

''کمال ہے بھئی! یہ بچاری بچی تو اس 'سیاحتی دورے' کو ''ن'' سے ناکام کرنے پر تلی ہے اور اک ہم کہ یہ طے کر کے اس سیاحتی مشن پر نکلے تھے کہ آئندہ تمام دنوں کو پنجابی سے منسوب کریں گے اور پنجابی بھی ٹھیٹھ سکھوں کی سی پنجابی......''۔

یہ لئے دیئے والی صورت حال ریلوے سٹیشن لاہور پھر شاہدرہ اور یہاں تک کہ گوجرانوالہ تک برقرار تھی۔ درمیان میں کوئی 'مصنوعی کنکر' پھینک دیا جاتا۔ ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوتا اور پھر سب نو وارد تہذیب و تمدن کے استعارے بن جاتے۔ ماحول کو زندہ رکھنے کا سارا بوجھ ہم چاروں نے اٹھا رکھا تھا۔ جو اس سیر و سیاحت کے اصل قصوروار بلکہ ''سزاوار'' تھے۔

نوخیز اور نوجوان سیاحتی طبقہ ہمارے لطیفوں اور سٹاف روم سے جڑی یادوں کا ''سطحی ردعمل'' دے کر بس لئے دیئے سے ہی بیٹھا تھا اور نادیہ سرور کو تو باہر کے اندھے اندھیرے منظروں کو بے بصارت نگاہوں سے دیکھنا تھا بس۔

یکا یک...... ہماری شہزادی جمیلہ کو قیمے والے نان یاد آ گئے۔ فوراً دسترخوان بچ گیا۔ اچھرے لاہور کے خاص نان تھے۔ بچے، لڑکے، لڑکیوں کے چہرے کچھ کھلے۔ سرگرمی سے مزید ارطعام کو انجام پہنچایا۔

اب ماحول کو رنگین بنانے کی خاطر نعرہ لگا۔

''چلو بھئی! گانے گاؤ...... نادیہ بور ہو رہی ہے''۔

''چلو! چلو!'' سب ہمہ تن شوق، اس کار خیر میں شریک ہونے کو تیار تھے۔ ''محسن تمہارا گٹار کدھر ہے؟ بڑی دھوم سنی تھی اس کی''۔

''وہ تو بھول گیا'' وہ شرمندہ تو ہوا مگر فوراً مستعدی سے بولا ''دوسرا سسٹم ہے''۔

لیپ ٹاپ کے ساتھ کچھ 'تار رسانی' کر کے اُسے سعدیہ سرور کے لائے سپیکر سے منسلک کیا ہی جا رہا تھا کہ برادر کلاں حسن سرور پہلے کچھ بے چین ہوئے پھر پیٹ پر ہاتھ رکھ کر اپنی بڑی آپا سے کچھ خصوصی معاملات پہ مشاورت کی اور پہلے حالوں کی پکار پر اس خانے کی طرف لپکے جسے گھروں میں سے واش روم کہہ لیا جاتا ہے۔ البتہ ٹرینوں کے نزدیک وہ بہت اُتلا ہی ہیں۔ جو انتڑیوں کی گو مگو کو ''خلا'' فراہم کرنے کا موقع عطا کرتے ہیں۔ جب حسن سرور کامیاب ہو کر واپس لوٹے تو ہماری محفل موسیقی خاصی رنگ پکڑ چکی تھی۔

ایکسپریس اسلام آباد بھی...... اب سوائے وقتاً فوقتاً کھڑے رکھنے کے اور کچھ نہ کرتی تھی۔

حسن سرور کچھ شرمندہ اور بہت سے نادم نادم شریکِ محفل ہوئے اور جب خود اُن کا کوئی گایا ہوا گانا لیپ ٹاپ سے دکھایا گیا تو بھی حسن بھائی فخریہ موڈ میں آنے کی بجائے پیشانی سے عرقِ انفعال ہی پونچھ رہے تھے۔ یوں جیسے ابھی کچھ دیر پہلے والی کی گئی "حرکت" کوئی گناہ کبیرہ تھی اور وہ بھی ایسا گناہ جسے دنیا والوں نے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہو اور اب شرمندگی سے ندامت پائے۔

ہم بھی کیسے عمدہ لوگ ہیں۔ کیسی کیسی غیر فطری باتوں پر خود کو مورد الزام ٹھہرا کر شرمندہ ہوتے رہنے والی قوم۔

محفلِ موسیقی محسن سرور کے اونچے نیچے اور جان پر کھیل کھیل کر گائے گئے سروں کی ہمراہی میں عروج پر تھی کہ تبھی یک سعدیہ کا لایا ہوا سپیکر کھانسنے سسکنے لگا۔

"لو جی ہمارا 'ساؤنڈ سسٹم' تو خطرے کی گھنٹی بجانے لگا ہے۔ اب دنیائے موسیقی کی ساری ذمہ داری 'ہمارے مدقوق سے محسن سرور کے ناتواں کندھوں پر تھی۔ اُن کا بھی کچھ ساتھ حسن سرور نے دیکر 'سروں' کا سر اونچا رکھنے کی کوشش تو کی۔ مگر ان کے نیچے پڑتے سروں نے اس کی اجازت نہ دی کہ پیٹ کے تکلیف دہ بلاوے اس دنگ میں مسلسل بھنگ ڈال رہے تھے۔

تبھی کیبن میں ایک پُرشوق پیش کش ابھری۔

"تم سب ہٹو...... میں گاتی ہوں"

یہ تو نادیہ سرور تھی...... کمال ہے میری طرح میری ساتھیوں کے چہروں پر بھی حیرت تھی اور یہ حیرت اُس وقت کوئی جھٹکا سا بن گئی۔ "زبردست الیکٹرک شاک" جب کیبن میں اُس کی آواز ابھری۔

ایکسپریس کی فراٹے دار چھک چھک جیسے معدوم ہو گئی تھی۔ بس ہماری سماعتیں تھیں اور اس کے گلے کے سرگوشی سُر۔ غضب کا اُتار چڑھاؤ اور آواز میں کمال کی لوچ۔

میں نے مستا میں وجد کر دنیا کی اس کول سی، بے تکلف اور بے ساختہ مترنم لڑکی کو دیکھا۔ ان لمحوں میں اس کا سارا نخرہ، ساری آدم بیزاری، تمام بلیکی کٹ اپ کا نمائشی رعب داب لپیٹ لپاٹ کر بند کھڑکی میں سے باہر پھینکا جا چکا تھا۔ ساری 'ن' غائب ہو چکی تھی وہاں اب صرف نادیہ تھی۔ سچے سروں میں ڈوبی نادیہ...... بڑے چنچل انداز میں بے تکلفی سے بیٹھی اپنی مستی کے بہاؤ میں گم۔ اور سارے سامعین اسے عقیدت بھری تحسین سے دیکھ رہے تھے۔

تبھی وہ ہوا...... جو اکثر میرے ساتھ ہوتا ہے۔ اُس پیاری سی بچی نے ہولے سے قدم اٹھائے۔ دستک بھی نہیں دی اور دھیرے سے میری روح سے لگ کر بیٹھ گئی۔

احساس کے تمام تر بندھنوں کے ساتھ۔

جس بندھن میں...... خون یا سماج کا کوئی سلسلہ مطلوب نہیں ہوتا۔ جس بندھن کو بندھنے کے لیے بس ایک لمحہ چاہیے اور جو پھر لمحوں تو کیا دنوں، مہینوں، سالوں حتیٰ کہ صدیوں سے بھی نہیں ٹوٹتا۔ جہاں ٹوٹ پھوٹ کی جگہ اٹوٹ کی سچائی آ جاتی ہے۔ سچ ہے موسیقی روح کی غذا ہے اور موسیقی میرے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے تھی۔

سو میرے نہاں خانوں کی اک اونچی "برجستی" پر وہ دھرنا دے کر آ بیٹھی۔ بالکل حسن کی سی بے ساختگی اور اپنائیت کو لاڈ سے آلتی پالتی مارے۔ ایسی دل داری کو کون دروں سے بیدخل کر سکتا ہے۔

مگر اس نے تو کہا تھا...... بہت دنوں بعد...... اس نے گلوگیر آواز میں اپنی اُسی میٹھی مترنم ٹون میں اعتراف

کیا تھا کہ خود سے شکایت کی تھی شاید؟

”میں ”اچھے لوگوں“ کو کھو دیتی ہوں“ جذبات کی شدت سے اُس کی رواں آواز میں رخنے ڈال دیئے تھے ”پتہ نہیں کیوں مجھے انہیں سنبھالنا نہیں آتا؟“

وہ سچ کہہ رہی تھی کیونکہ وہ سچ کا وقت تھا۔ صبح صادق کا وقت، سحری کا وقت، جب پاکیزگی اور صداقت کے سوا فضاؤں میں کچھ نہیں ہوتا۔ جب دنیا دار نو دنیاوی فکروں کے مارے ڈھت پڑے ہوتے ہیں اور اللہ والے جاگتے ہیں۔ اللہ سے سوال کناں ہوتے ہیں۔ کھوٹ، نمائش اور دنیاداری کا نام ونشان نہیں ہوتا۔

بس صداقت ہوتی ہے۔ صدق وصفا کے اُس وقت...... کہ جو وقت خالق نے تہجد کے لیے عطا کیا ہے......

وہ بالکل سچ کہہ رہی تھی اُس وقت۔

اور اظہارِ صدق کے لمحوں میں...... اُس چنچل لڑکی کے اُس معصوم سوال کا جواب بھی تھا میرے پاس۔ میرے تجربوں کے جوابوں کی صورت۔ مگر میں نے اُسے کوئی جواب نہیں سکھایا کہ یہ ”سبق“ ...... یہ تلاش...... یہ ”سود وزیاں کا سفر لاتنہا“ ...... اُسے خود ہی کرنا ہوگا۔ چاہے یہ سفر کانٹوں بھرا ہو۔ تنہائیوں میں سسکتا ہو۔ یا اچھے لوگوں میں گھرا۔ یہ سولی اُسے خود ہی چڑھنا تھے۔

میں اُس کے لیے دعا کرسکتی تھی۔ جو روح کی تمام تر گہرائیوں کے ساتھ میں نے کی۔

بلکہ ہم دونوں نے کی اور درمیان میں صادق گھڑیاں تھیں صبح صادق کا تہجد وقت۔

کیبن کا لرزیدہ...... چہک چہک ماحول اسلام آباد کی جانب رواں دواں تھا۔ گجرات تو کب گزر چکا تھا مگر کھاریاں جہلم کی بھی خبر نہ ہوئی کہ باہر تاریکی کی گہرائیاں تن کر، ہمارے سارے منظر نگل چکی تھیں۔ اب ہماری دلچسپیاں بس ایک دوسرے کے لیے تھیں۔

لطیفے اور تلخ وشیریں واقعے سنا سنا کر، ہمارے منہ بھی تھک چکے تھے۔ اُس پر کل کی فکر نے الگ اعصاب شل کر رکھے تھے کہ ہم جس ”سیاحتی مہم“ پر جانے والے تھے اُس کے منتظمین نے ’شارپ ایٹ او کلاک‘ کی وارننگ دے رکھی تھی۔ اسلام آباد کے ایک جانے مانے ہوٹل کے باہر پاکستان کے طول وعرض سے ”عشاقِ نیلم وادی“ نے اکٹھا ہونا تھا اور ہمیں چند ضروری مالی لین دین کے امور سے فارغ ہوکر ساڑھے آٹھ کو ہالہ پل کی جانب روانہ ہونا تھا۔

درمیان میں ملکۂ کوہسار مری اور اس کے مضافاتی پہاڑی سلسلہ پہاڑ تھے۔

مگر ہم تو ابھی رات کے اُس سیاہ پہر میں سلسلۂ نمکستان یعنی (Salt Range) کے شروعاتی کنارے پہ تھے اور ٹرین تھی کہ لاہور کی ”من مرضیاں“ پھر دہرا رہی تھی۔ چیونٹی کی چال کو مات دے رہی تھی مگر اب یہ چال...... اُس کی مجبوری تھی کہ پہاڑی چڑھائی اور ایک انجن اتنی لمبی ٹرین کو لئے چل رہا تھا۔

مگر باہر مناظر خوفزدہ کردینے والے تھے۔ اور نوجوان ونوخیز چہروں سے خوف اور وحشت جھلکنے لگی تھی دل لرزیدہ تھے۔ پھر یکلخت ٹرین نے دو تین جھٹکے کھائے اور آگے بڑھنے سے انکار کردیا۔ چند ہی لمحوں میں کئی دروازے کھلے اور لوگ اس سنسانے میں سرگشت کرنے لگے۔ ایک دوسرے کو پوچھنے لگے۔ سنی سنائی وجوہات‘ افواہوں کی صورت گردش کرنے لگیں۔

(جاری ہے)

عطیہ زاہد

نور



”وہ روشنی بھی تھی، وہ روشنی زادِ راہ بھی تھی، قافلہ بھی اور رہبر بھی، وہ روشنی ہمیں سیدھی منزل تک لے جاتی تھی۔ جب تک ہم نے اس روشنی کی پیروی کی۔ اسے دل و جان سے بڑھ کر چاہا تو ہم کامران تھے اور سربلند بھی“۔

ایک قوم کی کتھا، جس نے اپنے نور کو بھلا کر اندھیروں کو مقدر کرلیا تھا

آدھا دن گزر چکا تھا ایسے میں تھکے ہارے لوگ گھروں کو لوٹ رہے تھے، لیکن ایک ان کا خاندان تھا جہاں زندگی کو اندھیرا بڑھنے کے ساتھ ساتھ جاگنا تھا اور اپنی زندگی کے لیے جدوجہد کرنا تھی۔ ”آدھا دن گزر چکا ہے۔ سورج آسمان کے وسط میں چمک رہا ہے۔ آخر تمھیں نیند کیوں نہیں آرہی؟ سو جاؤ اب......!“ ماں نے بچے کو خوفزدہ کرتے ہوئے کہا لیکن بچے کی آنکھوں سے

نیند آج کوسوں دور تھی۔ ماں نے جب اپنے لاڈلے کو سونے پر آمادہ نہ دیکھا تو خود کروٹ بدل لی۔ جبکہ بچے نے ماں کی بےزاری محسوس کرتے ہوئے باپ کو متوجہ کیا اور باپ کے قریب ہوتے ہوئے بولا "ابو.....ابو.....؟"

"جی بیٹا.....کیا بات ہے؟"

"ابو کیا آپ کو بھی نیند آرہی ہے؟" بچے نے ڈرتے ڈرتے باپ سے سوال کیا۔ تو باپ مسکراتے ہوئے بولا "بیٹے جن کے تیرے جیسے بچے ہوں ان کے نصیب میں سونا کہاں؟"

"ارے کم بخت سو جا، آخر تو سوتا کیوں نہیں ہے، تیرے جیسی اولاد بھی کسی کی نہ ہو۔ رات ہوتے ہی رزق کی تلاش میں نکلنا ہے، اس لیے چپ کرکے سو جا مجھے اور اپنے باپ کو بھی سونے دے"۔ اس کے مسلسل سوالات پر ماں نے اسے اچھی خاصی ڈانٹ پلادی لیکن وہ ماں کی ڈانٹ کو نظرانداز کرتے ہوئے دوبارہ اپنے باپ سے مخاطب ہوا۔ "ابو.....ایک بات تو بتائیں؟ جب سارے لوگ حتیٰ کہ جانور اور پرندے بھی دن کو اپنے اپنے گھروں سے نکلتے ہیں، گھومتے ہیں، پھرتے ہیں، اپنا رزق تلاش کرتے ہیں تو پھر ہم رات کو کیوں نکلتے ہیں؟ آخر ہماری قسمت میں یہ اندھیرے کیوں ہیں؟ ہم آخر روشنی میں باہر کیوں نہیں نکلتے ہیں۔ سارے جاندار دن کی روشنی سے اپنا اپنا حصہ وصول کرتے ہیں۔ پھر ہمارا حصہ کہاں ہے؟ ہم اندھیروں کی قید کیوں کاٹ رہے ہیں؟ ابو..... جب میں بڑا ہوجاؤں گا میں دن کی روشنی میں پھولوں کا اصلی رنگ دیکھوں گا میں پرندوں کی اڑان دیکھوں گا۔ میں تتلیاں دیکھوں گا، ابو..... میں دنیا کو اس کے اصلی رنگ میں دیکھوں گا۔ اب بھی دیکھتا ہوں پھر تو اور زیادہ واضح دیکھ پاؤں گا اور سب سے بڑھ کر میں کسی شفاف پانی کے جھرنے میں اپنے چہرے کے خدوخال دیکھ سکوں گا۔ ابو سچ کتنا مزہ آئے گا"۔ بچہ معصوم انداز میں اپنے باپ سے پے در پے سوال کرنے لگا۔ بچے کے سوالات پر باپ نے بڑا زبردست قہقہہ لگایا جس سے اس کا چہرہ مزید بدصورت اور کریہہ ہوگیا۔ جتنے زور سے اس نے قہقہہ لگایا تھا اتنی ہی جلدی قہقہہ ختم بھی ہوگیا۔ وہ ایک دم خاموش ہوگیا اور کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ باپ کو خاموش دیکھ کر بچے کی بے چینی بڑھ گئی۔ اب کی بار اس نے اپنے باپ کو باقاعدہ جھنجوڑ کر کہا "ابو..... کچھ تو بولیے نا آخر آپ خاموش کیوں ہیں؟ مجھے ڈر لگ رہا ہے" بچے کے ذہن پر ماں کی ڈراؤنی کہانیوں کا اثر ہونے لگا۔ اس سے پہلے کہ اس کا باپ جواب دیتا۔ اس کی ماں دوبارہ اسے ڈانٹنے لگی "خاموش کم بخت تو ہمیشہ اپنی عمر سے زیادہ بڑی باتیں کرتا ہے" بچہ سہم کر اپنے والد کے اور قریب ہوگیا۔ والد نے اس کو چمٹا لیا اور اپنی بیوی سے بولا "اری نیک بخت بچے کو ڈانٹ کیوں رہی ہو؟ بولنے دو، ماشاء اللہ ہمارا بچہ غیر معمولی ذہانت لے کر پیدا ہوا ہے۔ یہ سب سوالات ذہانت کی نشانی ہیں" اس کے والد نے مسکرا کر فخر سے کہا۔ "تو پھر بھگتو" ماں نے غصے میں کروٹ بدل کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ بچہ اب خاموش تھا لیکن اس کی آنکھوں میں لاتعداد سوالات تھے۔ باپ نے اس کو اپنے آپ سے تھوڑا سا الگ کیا اور پھر کہنے لگا "دیکھو بیٹا! یہ جو ہمارا چمگادڑوں کا قبیلہ ہے۔ یہ تمام جانداروں میں سب سے کمزور قبیلہ ہے۔ ہمارے لاتعداد دشمن ہیں۔ اس لیے ہم دن کو باہر نکل نہیں سکتے ہیں"۔ "ابو میں آپ کی یہ بات نہیں مانتا کیونکہ ہم تعداد میں کسی بھی قبیلے سے کم نہیں ہیں پھر ہم میں دوگنی قوت ہے۔ ہم پرندوں کی

طرح اُڑ بھی سکتے ہیں اور ہمارے کسی کتے بلکہ بھیڑیے جیسے تیز اور مضبوط دانت بھی ہیں۔ ہم سے کئی گنا کمزور چمگادڑ تو دن میں اُڑتے ہیں۔ یہ چھوٹی چھوٹی چڑیاں یہ حشرات تو ہم سے بہت ہی حقیر ہیں۔ انہیں تو کوئی کچھ نہیں کہتا“۔ بچہ آج باپ کو زچ کرنے پر تلا ہوا تھا۔ ”بچے تمہاری ماں سچ کہتی ہے تمہارے پیٹ میں داڑھی مونچھ ہی نہیں دانت بھی ہوں گے“۔ باپ نے مسکراتے ہوئے کہا ”ابو کہیں یہ بات تو نہیں کہ ہم بہت بدصورت ہیں اور شرم کے مارے دن میں نہیں نکل سکتے“ بچہ باپ کے بولنے سے پہلے بول پڑا۔ ”بیٹے آخر کیوں ضد کر رہے ہو؟ آخر تم سچ کیوں سننا چاہتے ہو؟ بعض سچ جاننے سے نہ جاننا بہتر ہے۔“ بچہ بولا ”ابو میں سچ سننا نہیں چاہتا، بلکہ مجھے سچ جاننے کی ضرورت ہے؟“

”کیوں میرے زخموں کے کرنڈوں کو نوچ رہے ہو، اگر سننا چاہتے ہو تو پھر پوری کہانی سنو! یہ جو تم اپنے آپ کو بدصورت کہہ رہے ہو، ہم شروع سے ایسے نہ تھے۔ ہم خوبصورت ہوا کرتے تھے۔ ہماری پیدائش کے بعد ہمارے حسن کے دم سے یہ دنیا حسین تر ہو گئی تھی۔ یہ جو ہماری کریہہ اور بدشکلیں ہیں، بیٹے! یہ تو ہمارے اعمال ہیں۔“ اس کے باپ کا لہجہ بڑا دلخراش تھا ”تو ابو کیا ہم پہلے روشنی میں اُڑا کرتے تھے“ بچے نے بے قراری سے کہا۔ ”میں نے ایک بار تمہیں منع کیا ہے نہ کہ درمیان میں مت بولو“ یہ کہہ کر وہ کسی اور دنیا میں کھو گیا۔ بلکہ وہ کسی مجذوب کی طرح خود کلامی کر رہا تھا۔ اس کے ایک ایک لفظ سے دکھ ٹپک رہا تھا۔ وہ جذب کی کیفیت میں بولنے لگا ”روشنی...... ہاں روشنی دن کا اُجالا‘ چمکتا سورج‘ مہکتے اور رنگین پھول‘ حسین نظارے‘ جھومتے گرجتے اور برستے بادل‘ بے کراں فضا‘ اس فضا میں ہماری بلند پروازی‘ اب تو یہ سب کچھ قصے کہانیاں ہیں یا تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہیں کبھی وہ بھی زمانہ تھا کہ یہ راتیں ہماری تھیں یہ دن ہمارے تھے، یہ سورج ہمارا تھا۔ بیٹے! روشنی کے علاوہ قدرت نے ہر جاندار کو ایک اور بھی روشنی دے رکھی ہے تمام جانداروں کے پاس اپنی اپنی جو روشنی تھی۔ اس میں ہماری روشنی سب سے پرنور تھی۔ ہمارے پاس تو ایسی روشنی تھی کہ اس روشنی سے سارا جہاں منور تھا۔ جہاں کا تو صرف ظاہر روشن تھا جبکہ ہمارا باطن منور تھا۔ اگر وہ روشنی ان کے لیے بصارت بن گئی تھی تو ہمارے لیے بصارت کے ساتھ ساتھ بصیرت بھی تھی کیونکہ وہ ہماری اپنی تھی۔ اس روشنی میں ہم راہیں متعین کرتے تھے۔ اس میں سفر کرتے تھے، وہ روشنی ہی تھی، وہ روشنی زادِ راہ بھی تھی، قافلہ بھی اور رہبر بھی، وہ روشنی ہمیں سیدھی منزل تک لے جاتی تھی۔ جب تک ہم نے اس روشنی کی پیروی کی۔ اسے دل و جان سے بڑھ کر چاہا تو ہم کامران تھے اور سربلند بھی“۔

”تو پھر کیا ہوا؟“ بچے نے بے چینی سے سوال کیا۔ سوال سنتے ہی اس کے جسم نے جھٹکا کھایا، جیسے سانپ نے کاٹ لیا ہو۔ ”ہاں...... ہاں...... بیٹے!“ ”تو پھر کیا ہوا؟“۔

”ہوا یہ کہ ہمیں بدقسمتی سے اپنی ہی روشنی بری لگنے لگی۔ ہم اپنی ہی روشنی سے ڈرنے لگے۔ حیلوں اور بہانوں سے فرار کے راستے ڈھونڈنے لگے۔ ہم اس روشنی کو چاہتے ہوئے بھی اس سے آنکھیں چرانے لگے۔ اپنی روشنی کے ہوتے ہوئے بھی ہم دوسروں سے روشنی مانگنے لگے۔ اس بیگانی روشنی میں طلسماتی چمک تو تھی مگر اس میں دائمی پن نہ تھا۔ وہ روشنی صرف روشنی تھی۔ نور نہیں تھا بیٹے! تم ابھی چھوٹے ہو، تمہیں عام روشنی اور نور کا فرق معلوم نہیں، بلکہ ایک تم کیا؟ ہمارے بڑے بھی روشنی اور

نور میں تمیز نہیں کر سکتے، بس تم یوں سمجھو کہ دوسروں کے پاس سیارے تھے، تو ہمارے پاس کائنات کا سب سے عظیم پر نور روشن ستارہ تھا بلکہ وہ ستارہ آج بھی پوری آب و تاب سے چمک رہا ہے۔ اس کی جاں فزا قوت بخش، سکون بخش اور فرحت بخش ضیاء ہر سو پھیلی ہوئی ہے۔ مگر افسوس کہ ہم کور چشم ہو چکے ہیں۔ ہم اس روشنی سے محروم ہیں۔" "ابو آخر ہمیں اپنی ہی روشنی کیوں بری لگنے لگی ہم اس سے کیوں خوف زدہ تھے؟" بچے نے ایک بار پھر درمیان میں ٹانگ اڑائی۔

"بیٹے..... منافقت، صرف اور صرف منافقت..... شروع میں ہم بہت سیدھے سادے تھے، سادگی اور سچ میں ہماری برتری تھی، ہماری قوت تھی، ہم دو اور دو چار والے لوگ تھے، سب سے پہلے سادگی ہم سے چھوٹ گئی، ہم تکلفات اور خرافات میں پڑ گئے۔ ہم اپنے درمیان اپنی ہی نسل میں چھوٹے اور بڑے تلاش کرنے لگے۔ ہم طبع ساز بن گئے۔ اسی نفاق سے ہماری ہوا اکھڑ گئی۔ ہم جھوٹے ہوتے گئے تو چھوٹے ہو گئے۔ ہماری شکلیں بدلنے لگیں ہم بدصورت بنتے گئے۔ ہماری روشنی جھوٹ کو برداشت نہیں کر سکتی، یہ تو وہ آئینہ ہے جس میں اصلی شکل ہی نظر آتی ہے۔ لہٰذا ہم اس روشنی اور آئینے سے ڈرنے لگے اور ہم دوسروں سے روشنی مانگنے لگے۔ ہم ہر بھکاری کی طرح یہ سمجھ رہے تھے کہ ہمیں دوسروں سے روشنی مفت مل رہی ہے۔ مگر اس جہاں میں کوئی بھی چیز مفت نہیں ملتی، ہر مانگی ہوئی چیز کے بدلے میں عزت، غیرت، خودی اور آزادی دینی پڑتی ہے۔ شاید ہمارے جہاں کے تمام پرندے، درندے یہاں تک کے چرند بھی اس انتظار میں تھے کہ کب ہم اپنے یہ ہتھیار رکھ دیتے ہیں۔ عزت، غیرت، شجاعت اور خودی جیسی صفات سے محروم ہوتے ہی وہ ہم پر چڑھ دوڑے اور ہم اپنی آزادی بھی کھو بیٹھے۔ ڈرتے گئے اور بزدل ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ ہم سے دن کی روشنی چھین لی گئی اور ہم اندھیروں کے باسی بنا دیئے گئے۔ سچ تو یہ ہے کہ دن کی روشنی ہم سے دور کر دی گئی اور ہم....." اس کے والد کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو زمین پر گرے اور زمین میں جذب ہو گئے کیونکہ وہ اب بھی اُلٹا لٹک رہا تھا "لیکن ابو بڑا ہو کر میں دن کو اڑوں گا" بچہ سحر زدہ سا ہو کر والد سے کہانی سن رہا تھا اچانک بول اُٹھا "ہاں..... ہاں..... میرے بچے تم دن کو اڑنا چاہتے ہو اور مجھے امید ہے کہ ہماری آئندہ نسلیں ایک بار پھر دن میں اڑا کریں گی۔ ہماری یہ بدہیت اور جسمانی ساخت ایک بار پھر ضرور تبدیل ہوگی مگر اس کے لیے تمہیں چاہیے کہ وہ نور والی روشنی پہلے اپنے اندر جذب کر لو یا اس روشنی میں فنا ہو جاؤ اس لیے اپنی روشنی ساتھ رکھو ورنہ تیز روشنی تم کو جلا دے گی۔ اگر تمہاری اپنی روشنی ساتھ نہ ہوگی تو دوسروں کی روشنی تمہیں اندھا کر دے گی۔ جلا کر بھسم کر دے گی۔ اگر دن کی روشنی کو قابو کرنا ہو، تو اپنے اندر وہ نور والی روشنی سمیٹ لو۔"

"ابو اب تو میری آنکھوں سے نیند ہمیشہ ہمیشہ کے لیے روٹھ گئی ہے جب تک میں اپنی روشنی پا کر رات کو نہ سولوں" بچے نے یہ کہہ کر کروٹ بدلی اور کل کے سہانے تصور میں کھو گیا۔ جہاں اس کا اپنا نور ہر سو پھیلا رہا تھا اور اس نور میں وہ سب سے زیادہ خوبصورت نظر آ رہا تھا۔



خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ

سلطان الہند خواجہ معین الدین اجمیریؒ جو برصغیر کے عوام کے دلوں پر خواجہ غریب نوازؒ کے نام سے حکمرانی کرتے ہیں!

پروفیسر غلام رسول

دورِ غلامی میں ہند کا برطانوی وائسرائے لارڈ کرزن کہا کرتا تھا کہ ”میں نے اپنی زندگی میں دو ایسے بزرگ دیکھے ہیں جو اپنی وفات کے بعد بھی لوگوں کے دلوں پر اس طرح حکمرانی کر رہے ہیں کہ جیسے بہ نفسِ نفیس اُن کے درمیان موجود ہوں۔ اُن میں سے ایک مغلیہ حکمران اورنگ زیب عالمگیر ہے اور دوسرے خواجہ معین الدین اجمیریؒ“۔

اورنگ زیب عالمگیر کی مقبولیت و ہردلعزیزی کے بارے میں لارڈ کرزن کا کہا سچ ہو یا نہ ہو لیکن اس میں کوئی کلام نہیں کہ حضرت معین الدین چشتیؒ کی مقبولیت کے بارے میں اس کا قول حرف بحرف حقیقت ہے۔

سلطان الہند خواجہ معین الدین اجمیریؒ جو برصغیر

کے عوام کے دلوں پر خواجہ غریب نوازؒ کے نام سے حکمرانی کرتے ہیں۔ ایک فضل و کمال میں یکتا قطب المشائخ بزرگ کامل درویش تھے۔ عمر کے پہلے پندرہ سولہ سال کا عرصہ اپنے حال میں مست و سرشار ہو کر گزارا۔ نہ حال پر نظر نہ مستقبل کی فکر۔ باپ فوت ہو چکا تھا، منزل منصور میں تھے۔ لہٰذا باپ کا چھوڑا ہوا ترکہ، جو کہ ایک باغ اور پن چکی پر مشتمل تھا، کو سنبھالا۔ صبح سے شام تک باغ کی نگہداشت کرنا۔ پرندوں سے پودوں کو بچانا یا پھر پن چکی سے کام لینا یہی مشاغل تھے یہی روزگار تھا۔

ایک دن معمول کے مطابق باغ کے درختوں کو پانی دے رہے تھے۔ سورج سوا نیزے پر تھا۔ سخت گرمی میں، سخت مشقت کے اس کام سے جسم پسینہ پسینہ ہوا جا رہا تھا۔ چہرہ دھوپ کی تمازت سے سرخ تھا۔ اپنے آپ میں مگن دل جمعی سے کام میں مشغول تھے کہ اچانک مرد قلندر، نام جن کا ابراہیم قندوزیؒ تھا، باغ میں داخل ہوئے۔ نوجوان کو باغ کی نگہداشت میں یوں جو معروف پایا تو چہرے پر ہلکا سا تبسم پھیل گیا۔ پھر چپ چاپ خاموشی سے ہی ایک درخت کے سائے میں بیٹھ کر غور سے اُسے دیکھنے لگے۔ اچانک نوجوان کی نظر شہر کے مشہور قلندر پر پڑی تو سب کام چھوڑ کر فرط محبت وعزت واحترام سے آگے بڑھ کر آداب سے سلام کیا۔ ابراہیم قندوزیؒ نے قلندرانہ انداز میں جواب دیا اور پھر اُسی خاموشی سے سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ جس طرح باغ میں داخل ہوئے تھے۔ نوجوان قلندر کی معراج سمجھتا تھا۔ تصوف کی اصطلاح میں قلندر اسے کہتے ہیں جو تصوف میں منتہی ہوتا ہے۔ نوجوان کم عمر تو تھا لیکن اتنا کم علم نہیں۔ وہ قلندر کے مرتبے کو کچھ نہ کچھ تو جانتا ہی تھا۔ سو دوبارہ پلٹا، انگوروں کی بیل سے ایک رس بھرا خوشہ انگوروں کا توڑ کر فرط عقیدت سے بزرگ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے ادب سے بولا:۔

”حضرت! انگور نوش فرما کر اس خادم کو شرف بخشیں“۔

قلندر نے ایک نگاہ نوجوان پر ڈالی جس میں نہ جانے کیا تاثیر تھی کہ وہ بے خود سا ہونے لگا۔ بزرگ نے اُس کے بڑھے ہاتھوں سے انگوروں کا خوشہ لیا اور چند انگور توڑ کر کھا لیے۔ نوجوان وہیں عقیدت سے اُن کے سامنے بیٹھ گیا۔ پھر اس بزرگ نے اپنی بغل سے کوئی چیز نکالی۔ کچھ خود چبائی اور باقی جو بچی وہ نوجوان کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے ”لے تو بھی کھا“۔

نوجوان جھوٹی چیز کو بے چوں و چرا لے کر کھانے لگا۔ نجانے وہ شے کیا تھی کہ جس کا حلق سے اُترنا ہی تھا کہ نوجوان کی دنیا ہی بدل گئی۔ وہ باغ جو کل تک اُسے اپنے درخشاں مستقبل کا امین نظر آتا تھا خاردار جھاڑیوں سے زیادہ اہم نہ لگا۔ ہر چیز حقیر سی نظر آنے لگی۔ طبیعت میں ایک بے چینی سی پیدا ہو گئی۔ دل عشق الٰہی اور رسول کی محبت سے معمور ہو گیا۔ نگاہوں میں دنیا کی ہر چیز حقیر لگی۔ قلندر تو اپنا کام کر کے چلتا بنا، نوجوان کا سکون غارت ہو گیا۔ دل ہر چیز سے اُچاٹ ہوا تو سب کچھ چھوڑ کر تحصیل علم اور راہ نجات کی خاطر سمرقند و بخارا کی راہ لی۔ قرآن حفظ کیا۔ ظاہری علوم حاصل کیے پھر دل تو آتش سوزاں میں اسی بری طرح پھنکنے لگا کہ کسی پل چین نہ رہا جب کچھ علم نہ تھا تو سب ٹھیک تھا۔ جب علم حاصل ہوا تو طبیعت میں ایک بے نام سی بے چینی بڑھ گئی۔ راہ نوردی عشق کی تلاش تھی۔ مرد کامل کی رہنمائی چاہتے تھے۔ مرد کامل کی تلاش میں کوچہ گردی صحرا گردی شروع کر دی۔

جگہ جگہ کی خاک چھانتا یہ نوجوان جب نیشاپور کے نزدیک ایک بستی ہارون (جسے لوگ ہرون بھی کہتے ہیں) میں داخل ہوا تو اس جگر سوختہ کو وہاں ایک ایسے مرد کامل مل ہی گئے جو فضل و کمال میں

فائق ترین تھے۔ یہ عثمان ہارونیؒ تھے۔ وہ نوجوان اب دن رات اُن کی صحبت میں رہنے لگا۔ آخر ایک دن بے تاب ہو کر عثمان ہارونیؒ سے گویا ہوا "حضرت اب ضبط کا یارا نہیں رہا۔ خادم کو شرف بیعت سے نوازنے کا کرم فرمائیے"۔

عثمان ہارونیؒ نے شفقت سے پاس بٹھایا اور سینے سے لگا کر فرمانے لگے "جا...... اب جا کر وضو کر کے آ اور دو رکعت نماز ادا کر۔ نوجوان جو شرف بیعت کے حصول کے لیے بیتاب تھا فوراً حکم کی تعمیل کے لیے اُٹھا اور جیسا کہ حکم بجالایا۔ عثمان ہارونیؒ نے نوجوان کو دیکھا جو پھرتی سے اُن کے ارشاد حکم کی تعمیل کے بعد مزید ہدایات کا منتظر تھا۔ دوبارہ حکم دیا کہ جاؤ قبلہ رو ہو کر سورۃ البقرہ پڑھو۔ اس حکم کی تعمیل کے بعد نوجوان پھر آن حاضر ہوا۔ اب کے اکیس بار درود شریف پڑھنے کا حکم جاری ہوا۔ جب نوجوان اس سے بھی عہدہ برآ ہو گیا تو عثمان ہارونیؒ نے اس نوجوان کا ہاتھ تھاما اور آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا" آج سے تجھے اللہ کے سپرد کیا"۔ پھر نوجوان کے بڑھے بال تراشے سر پر کلاہ رکھی اور حکم دیا "اب سورۃ اخلاص کا ہزار بار ورد کر اور پھر ایک دن ایک رات مجاہدے میں گزار کر ہمارے پاس آنا"۔

مطیع اور فرمانبردار نوجوان بزرگ کامل کے حکم کے مطابق واپس اپنے ٹھکانے پہنچا اور پورے خشوع وخضوع کے ساتھ حکم کی تعمیل میں مشغول ہو گیا اور پھر عثمان ہارونیؒ کی خدمت میں آ کر عقیدت سے سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ مرشد نے گہری نظروں سے مرید کا جائزہ لیا۔ کچھ دیر اسے دیکھتے رہے پھر حکم دیا "اوپر دیکھ"، اوپر دیکھا تو نظریں درمیان میں حائل وسعتوں کو عبور کرتی جن حدود میں پہنچیں وہ یہ نوجوان بیان نہ کر سکا گھبرا کر نیچے دیکھا تو نظریں تحت الثریٰ میں اُترتی چلی گئیں۔ نوجوان نے گھبراتے ہوئے حیرت زدہ ہو کر مرشد کی طرف دیکھا، جو مسکراتے ہوئے مرید کا بغور مطالعہ کر رہے تھے اور اس کی کیفیت میں یہ حیرانگی کا تغیر دیکھ کر لطف اندوز ہو رہے تھے۔ نوجوان کو یوں جو حیران و پریشان اپنی سمت دیکھتا پایا تو اپنی دو انگلیوں کے درمیان میں فاصلہ پیدا کر کے اُس کی جانب بڑھایا اور حکم دیا "اب ان انگلیوں کے درمیان فاصلے میں دیکھ"۔

اب جو نوجوان نے انگلیوں کے درمیانی حصہ میں دیکھا تو انگشت بدنداں رہ گیا۔ اس کے سامنے ایک عجیب وغریب منظر تھا جسے ماورائے عقل وگمان ہرگز تسلیم نہ کر سکتی تھی مگر یہ حقیقت تھی کہ وہ اپنی ہی دنیا جیسی ہزارہا دنیاؤں کو ان انگلیوں کے درمیانی فاصلے پر دیکھ رہا تھا۔ نوجوان سراسیمہ ہو کر بولا "حضرت...... یہ کیا ہے؟"

عثمانؒ نے کہا "بس...... اب تیرا کام ختم ہوا اور یہ جو تم نے ابھی دیکھا اٹھارہ ہزار دنیائیں تھیں جن کا ابھی انسان کو علم نہیں"۔ اس کے بعد یہ نوجوان مرید عثمان ہارونیؒ کا ہی ہو کر رہ گیا۔ شب و روز آپ کی صحبت میں گزارا کرتا۔ ظاہری وباطنی علوم کا حصول انہی کے طفیل تھا۔ سو عزت کا یہ حال تھا کہ آگے مرشد ہوتا اور پیچھے سعادت مند نوجوان مرید۔ نوجوان مرید کی یہ سعادتمندی دیکھ کر عثمان ہارونیؒ نے ایک دن فرمایا۔

معین الدین محبوب خدا است
مرا فخر است بر مریدی او

یہی معین الدین آگے چل کے خواجہ معین الدین چشتیؒ کہلائے۔

کچھ عرصہ کے بعد آپؒ کے دل میں روضہ رسولؐ کی زیارت کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ مدینہ کے لیے روانہ ہوئے۔ مزار اقدس پر حاضری دی۔ ابھی مدینہ میں ہی تھے کہ خواب میں رسول اللہؐ سے شرف ملاقات حاصل ہوا۔ آپ خواجہ غریب نوازؒ کو خواب

میں ہندوستان کی طرف جانے کی ہدایت فرماتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ ''معین الدین ہم نے تمہیں اللہ کی رضا و خشا سے سلطان الہند مقرر کیا ہے اب تم اپنے مرشد سے ہندوستان جانے کی اجازت حاصل کر کے وہاں چلے جاؤ''۔

اگلے دن خواجہ چشتیؒ نے اپنا یہ خواب عثمان ہارونیؒ کو سنایا۔ عثمان ہارونیؒ کو بھی خواب میں اسی قسم کی ہدایت مل چکی تھی۔ سو انہوں نے بصد خوشی اجازت دی۔ عثمانؒ نے جن کا چہرہ اپنے مرید کی اس عزت افزائی سے خوشی سے تمتما رہا تھا خواجہ سے کہا ''تم نے ہندوستان نہیں دیکھا، ذرا آنکھیں بند کرو تاکہ تمہیں اس اجنبی سرزمین کی سیر کرا سکیں''۔

حضرت خواجہؒ نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے مرشد عثمانؒ کے فیض روحانی سے ہندوستان کے ان مقامات کو دیکھا جہاں آپ کو تشریف لے جانا تھا۔

ہندوستان اُس زمانے میں دنیا بھر میں بُت پرستی کا سب سے بڑا گہوارہ تھا۔ کفر کے اندھیروں میں ڈوبی اس سرزمین پر اگرچہ اسلام کی روشنی خواجہ چشتیؒ سے پہلے پہنچ چکی تھی مگر ابھی تک اسلام کو وہ غلبہ حاصل نہ ہوا تھا جو ہونا چاہیے تھا۔ سلطان محمود غزنوی جو آندھی و طوفان کی طرح ہندوستان کے باطل خداؤں اور ان بُت پرستوں پر خدا کے قہر کی طرح ٹوٹتا تھا اور جس نے کفر کی سرزمین پر اسلام اور بُت پرستی کا عظیم الشان معرکہ سومنات کے علاقہ میں جیتا تھا اب اس دنیا میں نہیں تھا۔ اُس کی اولاد نے باپ کی فتوحات کو صحیح طور پر نہ سنبھالا اور محمود غزنوی جس کے دم قدم سے ہندوستان کے بُت پرستوں کے کلیجے کانپتے تھے اس کے منظر سے ہٹتے ہی ہندوؤں نے پھر پر نکالنا شروع کر دیے اور جلد ہی وہ غزنی کی مسلمان سلطنت کے دائرہ سے اپنا بڑا حصہ نکال سکنے میں کامیاب ہو گئے۔ بعد کے مسلمان حکمرانوں نے ہندوؤں کے ساتھ لاتعداد جنگیں لڑیں مگر کوئی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہوئی۔

خواجہ معین الدین چشتیؒ جن دنوں ہندوستان پہنچے، اُن دنوں مشہور راجپوت حکمران پرتھوی راج اپنی دو لاکھ سپاہ اور تین ہزار ہاتھیوں کے بل بوتے پر مسلمان حاکم شہاب الدین غوری کی بارہ ہزار سپاہ کو شکست دے کر ترائن کے محاذ پر کامیابی حاصل کر چکا تھا اور اس کامیابی کے نشے میں بدمست وہ کسی بپھرے ہوئے ہاتھی کی طرح ہندوستان میں نشۂ کبر و پندار میں دندناتا پھر رہا تھا۔

خواجہ معین الدین چشتیؒ نے ہندوستان کی سرزمین پر پہلا قدم رکھتے ہی جس دربار میں سب سے پہلے حاضری دی وہ گنج بخش علی ہجویریؒ کا مزار اقدس تھا۔ یہاں آپؒ نے چلہ کشی کی اور پھر ملتان تشریف لے گئے۔ ملتان جو اُن دنوں ہندوستان میں علم و ادب کا گہوارہ تھا۔ آپؒ نے وہاں ہندوستان میں بولی جانے والی معروف زبانیں سیکھیں۔ کچھ عرصہ ملتان میں قیام کے بعد آپ دلی تشریف لے گئے اور پھر اجمیر کا رُخ کیا۔

اجمیر اُن دنوں ہندوستان میں بڑی اہمیت کا شہر تھا۔ یہ پرتھوی راج کی حکومت کی راجدھانی تھی۔ اجمیر میں داخل ہوتے ہی آپؒ نے جس جگہ کو اپنے قیام کے لیے پسند فرمایا وہ اتفاق سے پرتھوی راج کے اونٹوں کی جائے قیام نکلی۔ پرتھوی راج کے ساربانوں نے جب ایک مسلم کو اپنے راجہ کی زمین پر یوں قبضہ کر کے بیٹھے دیکھا تو انہیں ٹوکنے لگے کہ وہ اس جگہ کو چھوڑ دیں۔ خواجہ صاحبؒ نے بے نیازی سے جواب دیا ''بھائیو! اتنا بڑا میدان ہے تمہارے راجہ کے اونٹ کہیں بھی بیٹھ سکتے ہیں۔ پھر مجھ غریب کو کیوں تنگ کرتے ہو؟'' مگر وہ ساربان مسلسل ضد میں الجھتے رہے کہ نہیں اگر راجہ کو علم بھی ہو گیا کہ ایک

"بے دین" اُس کی زمین پر ڈیرا جمانے بیٹھا ہے تو نجانے وہ کیا کر ڈالے۔ آخر جب ساربان حد سے زیادہ بڑھنے لگے تو خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اُس جگہ سے اُٹھتے ہوئے ساربانوں کو مخاطب کیا "لو بھئی ہم تو اُٹھ کے جا رہے ہیں تم بٹھا لو اب اپنے راجہ کے اونٹوں کو مگر خدا معلوم وہ بھی ہماری طرح اُٹھ سکیں گے یا نہیں"۔ آپؒ تو یہ کہہ کر اُٹھ کے چل پڑے اور ساربان آپؒ کی بات کے مفہوم سے ناآشنا اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

حضرت خواجہؒ نے اپنے ساتھیوں سمیت اناساگر نامی جگہ پر جا کر قیام کیا جو بعد میں اولیا مسجد کے نام سے مشہور ہوئی۔ ادھر مہاراجہ پرتھوی راج کے اونٹ میدان میں ایسے بیٹھے کہ اُٹھنا ہی بھول گئے۔ لوگوں کے ہاتھ ایک عجیب تماشا لگ گیا۔ شہر بھر کے لوگ میدان میں اکٹھے ہو گئے اور شاہی ساربانوں کی اُن مضحکہ خیز کوششوں کو دیکھنے لگے جو وہ اونٹوں کو اُٹھانے کے لیے کر رہے تھے۔ راجہ کو بھی خبر ہو چکی تھی۔ سو وہ بھی موقعہ پر پہنچ گیا جب کسی طور پر بھی اونٹ اپنی جگہ سے نہ ہلے تو بالآخر ساربانوں کو حضرت خواجہؒ کے الفاظ یاد آ گئے جو انہوں نے میدان سے اُٹھتے ہوئے کہے تھے۔ انہوں نے ڈرتے ڈرتے مہاراجہ سے ذکر کیا۔ پرتھوی راج یہ سن کر جہاں حد سے زیادہ خوفزدہ ہو گیا وہیں ساربانوں پر بھی آنکھیں نکالیں اور کہنے لگا جاؤ اُسی بزرگ سے جا کر معافی مانگو اور عزت و احترام سے اُن کی جو خواہش ہو پوری کرنا۔ ساربان کانپتے کانپتے آپؒ کے پاس پہنچے اور آپؒ کے قدموں میں گر کر معافی کے طلبگار ہوئے۔ آپؒ نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا "تمہارے راجہ کے اونٹ اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں اب کیا تم بیٹھنا چاہتے ہو جاؤ...... جا کر اپنا کام کرو" ساربان گھبرا کر کھڑے ہوئے اور میدان کی طرف دوڑ لگا دی۔ یہاں واقعی اونٹ میدانوں میں کھڑے تھے۔ اس واقعہ کے بعد خواجہ معین الدین چشتیؒ کی شہرت علاقہ بھر میں پھیل گئی۔

اناساگر جہاں خواجہؒ نے اپنا نیا ٹھکانہ بنایا تھا۔ اس جگہ ہندوؤں کے لاتعداد مندر تھے۔ یہ جگہ انادیو نامی راجہ نے بنوائی تھی۔ خواجہ صاحبؒ نے اسی جگہ کو اپنی تبلیغ کے لیے منتخب کر لیا اور وہیں بیٹھ کر کفرستان میں نورِ حق سے اُجالا کرنے لگے۔ آپؒ کی پُراثر تبلیغ اور پھر دینِ حق کی کرامات سے اردگرد کے لوگ جوق در جوق مسلمان ہونے لگے۔ یہ صورتحال دیکھ کر علاقے کے پنڈتوں سمیت عام متعصب ہندوؤں میں تہلکہ مچ گیا اور انہوں نے پرتھوی راج کو اس کے خلاف کارروائی کے لیے آمادہ کرنا شروع کیا۔

پرتھوی راج میں اتنی عقل تو بہرحال تھی ہی کہ وہ ایک مسلمان صوفی سے جھگڑنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ عیار ذہن کا شخص تھا اُس نے سوچا یہ مسلم صوفی جو کرامات دکھاتا ہے ان کا مقابلہ کسی ایسے ہی بندے سے کروانا چاہیے۔ اس نے اس سلسلے میں اجمیر کے سب سے بڑے مہنت رام دیو کو حکم دیا کہ "جا اُن درویش اور اُن کے مریدوں سے مل۔ یہ لوگ تو مجھے جاسوس سمان دکھائی دیتے ہیں، پرنتو ایسا نہ ہو کہ ہم غفلت میں مارے جائیں اور یہ اسلامی راج کی راہ ہموار کر کے چلتے بنیں۔ تو جا انہیں ٹٹول اور کسی طرح اجمیر سے بھی نکال دے۔ اگر طاقت بھی استعمال کرنا پڑے تو اوش کرنا"۔

رام دیو پنڈتوں اور پجاریوں کے ایک ہجوم میں بڑی شان سے گردن اکڑائے خواجہؒ کے آستانے کی طرف بڑھا اور جیسے ہی ان کے روبرو پہنچا، خواجہؒ نے اپنی ایک ہی نگاہ اُن پر ایسی ڈالی کہ اس بزرگ کامل کی نگاہ کو باطل کا شکنجہ سہہ نہ سکا اور اگلے ہی لمحے اس غول کا سردار رام دیو مہنت آپؒ کے قدموں میں

کر اسلام کی امان میں آنے کیلئے رو رہا تھا۔ آپؒ نے اُسے حلقہ اسلام میں لانے کے لیے کلمہ توحید پڑھایا اور اُس کا نام شادی دیو رکھ دیا۔

رام دیو کے مسلمان ہوتے ہی ہندوؤں اور خود راجہ کے دل میں آپؒ کا خوف جڑ پکڑ گیا۔ ہندوستان میں شعبدہ بازی عام تھی۔ وہ لوگ آپؒ کو بھی ایک ساحر سمجھنے لگے اور خیال کرنے لگے کہ آپ اپنی انہی ساحرانہ قوتوں کے بل بوتے پر ہندوؤں کو مسلمان کر رہے ہیں چنانچہ راجہ نے سوچا جس طرح زہر زہر کا تریاق ہوتا ہے اسی طرح اس مسلمان ساحر کے مقابلے میں کوئی ساحر ہی لانا چاہیے تاکہ لوہا لوہے کو کاٹ سکے۔ اس زمانے میں اجمیر اور آس پاس کے علاقوں میں جے پال نامی ساحر کا بڑا چرچا تھا۔ راجہ نے اسے فوراً اجمیر طلب کیا اور خواجہ غریب نوازؒ کے مقابلے کے لیے آمادہ کرنے لگا۔ بدی کا یہ جیتا جاگتا نمونہ جے پال تو خوش ہی ایسے شیطانی کاموں سے ہوتا تھا۔ چنانچہ وہ جھٹ تیار ہوا اور اس شان سے مقابلے کے لیے نکلا کہ خود تو مرگ چھالے پر سوار ہوا میں اُڑتا پھر رہا تھا اور چیلے گرو کے نیچے درندوں پر سوار خواجہؒ کی سرکوبی کے لیے کمر بستہ...... ہوکر جا رہے تھے۔ خواجہ غریب نوازؒ نے انہیں دیکھا تو اپنے ساتھیوں کو ان کے شر سے بچانے کی خاطر ایک حصار کھینچ کر اس میں محفوظ کر لیا۔ اب جے پال اور اس کے چیلے اپنے ہتھکنڈوں سے پورا زور صرف کرنے لگے کہ کسی طرح اس حصار کو توڑ دیں مگر کامیاب نہ ہو سکے جب اُن کا زور کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا تو خواجہ غریب نوازؒ نے اپنی کھڑاؤں اُتاری اور ہوا میں اُچھال دی۔ کھڑاؤں ہوا میں بلند ہوتی گئی یہاں تک کہ جے پال کی کھوپڑی اس کی پہنچ میں آ گئی۔ چنانچہ عین جے پال کے سر پر پہنچ کر کھڑاؤں نے منڈلانا شروع کر دیا اور جے پال کے سر پر ضربیں لگانے لگی۔ جے پال نے ہر ممکن کوشش بچنے کی اختیار کی مگر کھڑاؤں کہاں رُکنے کا نام لینے والی تھی۔ بالآخر تکلیف کی شدت سے عاجز آ کے جے پال فوراً مرگ چھالہ سمیت زمین پر اُترا اور آپؒ کے قدموں میں گر کر اعتراف شکست کیا۔ ساتھ ہی اسلام قبول کرنے کا خواہش مند ہوا۔ خواجہ غریب نواز نے اُسے معاف کرتے ہوئے مسلمان کیا اور اسلامی نام عبداللہ رکھا۔

جے پال کے مسلمان ہوتے ہی لوگوں نے جوق در جوق اسلام قبول کرنا شروع کر دیا اور وہ بستی جہاں کبھی مندروں کی گھنٹیاں گونجا کرتی تھیں اب اذان کی آواز سے فیض یاب ہونے لگی۔ پرتھوی راج اس صورتحال سے بہت جز بز ہوا۔ بہت دفعہ اس نے چاہا کہ خواجہ صاحبؒ کے خلاف کوئی سخت قدم اٹھائے لیکن پھر اُس کی ماں آڑے آ جاتی اور اسے سمجھاتی کہ ان بزرگوں سے مت اُلجھو۔ ان کے پاس ماورائی طاقتیں ہیں۔ ہم تم ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ہاں ان سے چھیڑ خانی کر کے اپنا آپ تباہ و برباد کر سکتے ہیں۔ پرتھوی راج ماں کی باتوں کو اچھی طرح سمجھتا تھا اور اُسے یہ احساس بھی تھا کہ ماں کے دلائل حقیقت پر مبنی ہیں مگر جے پال اور پھر ہندوؤں کی کثیر تعداد کا مسلمان ہونا ایسا امر نہ تھا کہ وہ اسے آسانی سے بھلا پاتا۔ چنانچہ اس نے پھر ایک منصوبہ بنایا اور ایک شخص کو خواجہؒ کے پاس اسلام قبول کرنے کے بہانے بھیجا اور ساتھ ہی ہدایت کی کہ موقع ملتے ہی آپؒ کو زہر دے دے۔ وہ شخص انعام کے لالچ میں اسی وقت آپؒ کے دربار میں حاضر ہوا اور اسلام قبول کرنے کی خواہش ظاہر کی۔

آپؒ نے اُس پر ایک کڑی نگاہ ڈالی اور ناراض ہوتے ہوئے کہا ”بدبخت تجھے اسلام سے کیا غرض، تیری جو تمنا ہے وہ پوری کر اور چلتا بن“ یہ سُن کر اس شخص کی تھرتھری چھوٹ گئی اور رو رو کر آپؒ سے معافی مانگنے لگا ساتھ ہی اُس نے دین حق کو قبول

کرنے کا سچے دل سے اقرار کیا اور دیر تک اپنی ناپاک سوچ پر توبہ کرتا رہا۔

یہ ایک خاموش اور پراسرار جنگ تھی بلکہ آج کے زمانے کی اصطلاح میں اسے سرد جنگ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ پرتھوی راج کھل کر سامنے نہیں آرہا تھا مگر اندر ہی اندر آپؒ کے خلاف محاذ قائم کیے ہوئے تھا اور یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ وہ ہر معرکہ میں خواجہ صاحبؒ کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہوتا آرہا تھا۔ خواجہ صاحبؒ نے پرتھوی راج کو جو یوں مسلسل تنگ کرتے پایا تو ایک جارحانہ قدم اٹھاتے ہوئے اسے اسلام کی دعوت دے ڈالی۔ راجہ پرتھوی جس کے آباؤ اجداد بتوں کے نام لیوا تھے اور اس پر فخر کرتے تھے۔ آپؒ کی اس جسارت اور دلیری پر غصے سے آگ بگولا ہو گیا۔ نفرت اور حسد کی آگ میں وہ دن رات جلنے لگا۔ وہ دیکھا کرتا تھا کہ راجہ ہونے کے باوجود اس کے گرد لوگوں کا وہ ہجوم وہ عقیدت مندی کے مظاہرے نہیں ہوتے جن میں خواجہ غریب نوازؒ گھرے ہوئے ہیں۔

پرتھوی راج نے حضرت خواجہؒ کی خدمت میں اپنا ایک سردار بھیجا جس نے آپؒ کو پرتھوی راج کی طرف سے پیغام پڑھ کر سنایا کہ آپؒ کی بہتری اسی میں ہے کہ آپؒ جتنی جلد ہو سکے اجمیر چھوڑ کر کہیں بھی تشریف لے جائیں۔

خواجہؒ نے راجہ کا پیغام سنا مگر اثر کوئی نہ لیا لیکن جب نامہ بر مسلسل آپؒ کے چہرے کی طرف جواب کی امید لیے دیکھتا رہا تو آپؒ نے ارشاد فرمایا "ہم نے پتھورا کو زندہ گرفتار کر کے مسلمانوں کے حوالے کر دیا"۔

پرتھوی راج کو یہ جواب ملا تو وہ اس کا مفہوم نہ سمجھ سکا چنانچہ جھنجلا کر اس نے خواجہؒ پر یہ الزام لگایا کہ انہوں نے مہاراجہ کی ہتک عزت کی ہے کیونکہ مہاراجہ نے جب ایک شخص کو ان کے پاس اسلام قبول کرنے بھیجا تو خواجہؒ نے اس کی نیت پر شبہ کا اظہار کیا اگرچہ بعد میں انہوں نے اسے مسلمان تو کیا لیکن پہلے انکار کر کے راجہ کی اہانت ضرور کی۔ چنانچہ وہ اور ان کے رفقاء اسی وقت اجمیر کی حدود چھوڑ کر چلے جائیں۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اس حکم پر ذرا بھی توجہ نہ دی اور ایک شان بے نیازی سے گویا ہوئے "تین دن کی بات ہی کیا ہے جو ہونا ہے ہو کر رہے گا"۔

مہاراجہ کا ایلچی اس گول مول جواب کو لے کر جب پرتھوی راج کے سامنے پہنچا تو راجہ بھی اس کا مفہوم نہ سمجھ سکا لیکن دل میں خیال کرنے لگا کہ شاید خواجہؒ نے تین دن کی مہلت مانگی ہے۔

ہندوستان سے دور شکست خوردہ شہاب الدین غوری راجہ پرتھوی کے ہاتھوں شکست کے بعد انتہائی افسردہ اور غمگین بیٹھا مستقبل کے لیے لائحہ عمل تیار کر رہا تھا اُسے اپنی ناکامی کا انتقام لینا تھا مگر اپنے وسائل پر نظر ڈال کر پھر رہ جاتا کہ اس مٹھی بھر سپاہ سے ہندو راجہ کی کثیر سپاہ سے اُن کی اپنی زمین پر لڑنے جانا خودکشی ہی کہی جائے گی۔ اسی غمزدگی اور ملولی کی کیفیت میں اس نے رات ایک خواب دیکھا کہ ایک بزرگ اُسے کہہ رہے ہیں "غوری...... اُٹھ ہندوستان کا تخت و تاج تیرا انتظار کر رہا ہے"۔

شہاب الدین غوری جو پہلے ہی انتقام کی آگ میں بھڑک رہا تھا اس خوش کن خواب کو دیکھ کر اس نے ہمت و جذبہ کے ساتھ دوبارہ ہندوستان پر حملے کی تیاری کا حکم دیا اور برق رفتاری سے ہندوستان کی طرف کوچ کرنے لگا۔

ادھر پرتھوی راج جو ابھی خواجہ معین الدین چشتیؒ کے اسلام قبول کرنے کے پیغام کو پا کر غصے سے کھول رہا تھا۔ اسے ایک اور اہانت آمیز پیغام موصول ہوا۔ یہ شہاب الدین غوری کی طرف سے اُس کا قاصد لے کر آیا تھا جس میں سلطان نے لکھا تھا:۔

سیارہ ڈائجسٹ آپ سے تحریریں طلب کرتا ہے

اور آپ کو صلاحیتوں کے اظہار کے **بھرپور مواقع** فراہم کرتا ہے

کیا آپ زندگی میں کبھی **عجیب و غریب واقعات** سے دوچار ہوئے ہیں؟

کیا آپ نے کہیں کوئی **دلچسپ بات** پڑھی ہے؟

کیا آپ یا آپ کے کسی واقف کار کے ساتھ کچھ **ان ہونے واقعات** گزرے ہیں؟

تو زیادہ سے زیادہ دو ہزار الفاظ میں ہمیں لکھ بھیجیے، ہم اسے آپ کی تصویر اور تعارف کے ساتھ شائع کریں گے

کہانی کوئی دلچسپ کہانی جو پڑھنے والوں پر تاثر چھوڑ جائے

تاریخی کہانی اسلامی تاریخی پس منظر میں لکھی جانے والی کہانی

ترجمہ انگریزی یا کسی اور غیر ملکی زبان سے ترجمہ شدہ کہانی

شرائط

1- کاغذ کے ایک طرف لکھیے۔

2- کھلا اور صاف ستھرا لکھیے۔

3- بہتر ہے ٹائپ کروالیجیے۔

4- اقتباس یا تلخیص کی صورت میں اصل حوالے یا کتاب کا نام مع مصنف لکھیے۔

5- کہانی کے اختتام پر اپنا نام، پتا لکھنا نہ بھولیے۔

6- مختصر تعارف اور پاسپورٹ سائز تصویر مسودہ کے ساتھ منسلک کریں۔

7- مسودہ واپس چاہیے ہو تو جوابی لفافہ ساتھ بھیجیے۔

"سرہند اور تھانیسر کا علاقہ مسلمانوں کی ملکیت ہے تم اسے خالی کر کے اسی طرح اطاعت گزار بن کر رہو جیسے سلطان محمود غزنوی اور اس کی اولاد کے باج گزار بن کر رہے ہو۔ ورنہ دوسری صورت میں تم سے بزور شمشیر یہ علاقے لیے جائیں گے اور تمہیں عبرت ناک انجام سے دوچار ہونا پڑے گا۔

پرتھوی راج اس پیغام کو پا کر غم و غصہ سے آگ بگولا ہو گیا اور حقارت سے شہاب الدین کے فرمان کو پھاڑ کر قاصد کے ہاتھ کہلوا بھیجا "اگر تم سرزمین ہند سے اسی وقت نہ نکل کھڑے ہوئے تو میرے قہر سے نہ بچ سکو گے"۔

حضرت خواجہؒ کے بموجب جب تیسرے برس نرائن کے مقام پر پھر ایک خونریز گھمسان کا رن پڑا اور پرتھوی راج اپنی سپاہ سمیت مسلمانوں کے غیض و غضب کا شکار ہو کر فرار ہو گیا مگر مسلم لشکر نے اس کا پیچھا کیا اور گرفتار کر کے قتل کر دیا۔ شہاب الدین غوری ایک فاتح کی حیثیت سے اجمیر میں داخل ہوا اور جب اسے معین الدین چشتیؒ سے شرف ملاقات ہوئی تو انہیں دیکھ کر وہ حیرت سے اچھل پڑا اور بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا "آپؒ......آپؒ ہی وہ بزرگ کامل ہیں جنہوں نے مجھے ہندوستان پر فتح کی بشارت دی تھی"۔

حضرت خواجہؒ نے مسکرا کر شہاب الدین کو سینے سے لگایا اور اسے نصیحت کی "دیکھو اپنے بندوں کا تجھے اللہ نے خادم مقرر کیا ہے۔ ہمیشہ عدل و انصاف سے حکمرانی کرنا اور اپنے کسی قول و فعل سے خدا کے بندوں کو دکھ نہ دینا۔ پرتھوی راج کا لڑکا نیک ہے، اسے تو اجمیر کا حاکم بنا دے اور وہ بھی تیرا اطاعت گزار بنا رہے گا"۔ سلطان نے آپؒ کی نصیحتوں پر حرف بحرف عمل کیا اور اجمیر کی حکمرانی راجہ پرتھوی کے لڑکے کو سونپ کر آگے چل پڑا۔

حضرت خواجہ معین الدینؒ کی عظمت و بزرگی کے سبھی قائل رہے اور نگ زیب عالمگیر آپؒ کا بہت مداح تھا۔ وہ آپؒ کے آستانہ مبارک پر کئی بار حاضری دیتا اور اپنی والہانہ چاہت و عقیدت کا اظہار کرتا۔

حضرت خواجہؒ نے اپنی پوری زندگی تبلیغ و اشاعت میں بسر کر دی۔ آپؒ نے دین اسلام کے عروج کی خاطر ہند میں دن رات کام کیا اور اسلام کے نور سے کفر میں گھری سرزمین ہند کو منور کیا۔

حضرت خواجہؒ پچاس برس ہندوستان میں رہے۔ یہاں کی رسومات کا بغور مطالعہ کیا۔ آپؒ نے محسوس کیا کہ یہاں کے باشندوں میں موسیقی کا بڑا دخل ہے اور یہ راگ رنگ کے دیوانے لوگ ہیں۔ ہندوؤں کے مندروں سے دل فریب مسحور کن موسیقی گونجتی رہتی ہے۔ چنانچہ آپؒ نے بھی موسیقی سے تبلیغ کا کام انجام دینے کا سوچا۔ آپؒ نے محفل سماع کی بنیاد ڈالی۔ اس طرح ہندوؤں کے دل پسند طریقے سے اسلام کا مؤثر پیغام انتہائی دل نشین انداز میں اُن تک پہنچنے لگا۔ یہی محفل سماع آہستہ آہستہ قوالی کی شکل اختیار کر گئی۔

آپؒ کہا کرتے تھے "لوگو! تم میں ضعیف ترین شخص وہ ہے جو ایک بات کہے اور پھر اس پر ثابت قدم نہ رہ سکے"۔

ایک بار آپؒ نے فرمایا "بت پرستی کا دوسرا نام خود پرستی اور نفس پرستی ہے جب تک انسان ان سے چھٹکارا نہیں پاتا وہ خدا پرستی کی منزل سے دور رہتا ہے"۔

"متوکل وہ ہے جو مصائب اور تکالیف سے بے حال ہو جائے مگر حرف شکایت زبان پر نہ لائے"۔

حضرت معین الدین چشتیؒ ترانوے سال کی عمر میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ آپ کا سن وفات ۱۲۳۶ھ ہے۔

عدالت

محمد سلیم اختر

اب اس کی کیفیت جال میں پھنسے شکار کی سی تھی۔ اوپر سے مقتول کے وارث کے پستول لوڈ کرنے کی آواز آئی اور اسے یقین ہوگیا کہ حریف کی گولی پستول کے دہانے سے نکلنے کے لیے بے تاب ہے۔ اسی اثناء میں اس نے چیخ کر کہا: "گولی مت چلانا۔ میں اوپر تمہارے پاس آرہا ہوں"۔

ایک قاتل کے تعاقب اور انجام کی کہانی، پشتو ادب سے انتخاب

وہ اپنے باپ کے قاتل کے تعاقب میں چیتے کی طرح دیوانہ وار بھاگ رہا تھا۔ قاتل کی ٹانگوں کو بھی موت کے خوف نے بے پناہ قوت بخشی تھی۔ اس لیے وہ بھی اس سے جان چھڑانے کے لیے آندھی کی طرح اُڑ رہا تھا۔ دونوں مسلسل پے در پے گولیوں کا تبادلہ کر رہے تھے۔ گولیاں ان کے سروں پر سے گزر رہی تھیں۔ دونوں ان سے اپنی جان بچانے کی تگ و دو بھی کر رہے تھے اور بھاگنے میں بھی مصروف عمل تھے۔ قاتل نے مقتول کے وارث سے چھپنے کے لیے کھیت، باغ، کھنڈر، کھنڈ، کھائی، پگڈنڈی غرض



کوئی جگہ بھی نظر انداز نہ کی۔ لیکن وہ تیر کی طرح اس کا پیچھا کر رہا تھا اور اسے ہر حالت میں اور ہر قیمت پر جالینے کا تہیہ کیے ہوئے تھا۔ اب قاتل پہاڑ کی ایک بلند و بالا چوٹی تک پہنچ چکا تھا۔ جس کے دامن میں پانی سے لبالب بھرا ہوا دریا بہہ رہا تھا۔ موت اس سے چند قدم کے فاصلے پر تھی اور قریب تھا کہ وہ اس پر باز کی طرح جھپٹتا اور اپنے فولادی پنجوں میں مضبوطی سے جکڑ لیتا۔ لیکن اسی اثناء میں قاتل نے آنکھیں بند کر کے دریا میں چھلانگ لگا دی۔ وہ بھی رکا نہیں اور اس کو دیکھتے ہی اس کے پیچھے دریا میں کود پڑا اور یوں دو انسان خونخوار مگرمچھوں کی طرح دریا کی لہروں کے ساتھ برسرپیکار رہے۔ جب سرکش اور شوریلی لہریں انہیں دریا کی تہہ میں لے جانے کی سرتوڑ کوشش کر رہی تھیں تو بہ بھی انہیں اپنے مضبوط تھپیڑوں کا نشانہ بناتے اور یوں ان سے پیچھا چھڑانے کی حتی الوسع کوشش کرتے تھے۔

دونوں خاصے تھک چکے تھے لیکن دریا کی قوت کے سامنے اپنی ہمت کے ہتھیار ڈالنا بزدلی گردانتے تھے۔ آخر کار مستقل موجیں ان کے جسموں کو دھکیلنے لگیں اور وہ تھک ہار کر دوسرے کنارے تک پہنچ گئے۔ اس دوران قاتل کا پاؤں مکمل طور پر اس کی دسترس میں تھا لیکن دریا کے کنارے پھیلے ہوئے کیچڑ پر پھسلنے کی وجہ سے وہ اس کی زد سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔

قاتل کے پاس پھر بھاگ اٹھنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا اور اس نے بھی اس کے تعاقب کو اپنا فرض جانا۔ اس مرتبہ قاتل نے سامنے گنے کے کھیت کو اپنی کمین گاہ اور پناہ گاہ کے طور پر منتخب کیا۔ اس نے بھی تیر کی طرح پوری برق رفتاری سے اس کا پیچھا کیا۔ گنوں کے ٹوٹنے اور گرنے کی مخصوص آوازیں تک، کٹ، کڑک، کڑاک صاف سنائی دے رہی تھیں اور یوں قاتل کے پیر کھیت میں اپنے لیے راستہ بنانے کی کوشش میں تھے اور وہ بھی اس کے بنائے ہوئے راستے پر دوڑتا اس کا پیچھا کر رہا تھا۔

قاتل سمجھ گیا کہ کھیت اس کے لیے ایک موزوں پناہ گاہ کا کام سرانجام نہیں دے سکتا۔ لہٰذا دوسرے سرے پر پہنچنے کے بعد اس نے پگڈنڈی سے آگے وسیع و عریض علاقے کا بغور جائزہ لیا تو ایک بلند و بالا ٹیلے کے نیچے تمام زمین اسے عمیق کھڈوں اور تھاہ گہرائیوں کی مانند نظر آنے لگی۔ یوں لگتا تھا جیسے تنگ و تاریک قبروں نے اس کے لیے ایک خونخوار اژدہے کی طرح اپنے خوفناک جبڑے کھول دیے ہوں۔ اس نے بلا پس و پیش ان میں سے ایک گہرے کھڈ کا انتخاب کر کے اس میں چھلانگ لگا دی۔

اور جب مقتول کا وارث کھیت میں سے ہو کر پگڈنڈی تک پہنچ گیا اور اس نے گرد و نواح میں اس کا سراغ لگانے کی کوشش کی تو اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ تب اس نے اپنے آپ کو باور کرانے کی سعی کی کہ اس نے کھڈوں میں سے ضرور کسی کھڈ کو پناہ گاہ کے طور پر اپنایا ہوگا۔ لہٰذا وہ ان کھڈوں کا بنظر غائر جائزہ لینے لگا۔ اس دوران زمین پر کسی کے کیچڑ سے لتھڑے قدموں کے خون آلود نشانات دکھائی دینے لگے جو ایک کھڈ کے دہانے تک پہنچ کر ختم ہو جاتے تھے۔ اس کی تمام تر توجہ متذکرہ کھڈ پر مرکوز ہوئی اور جب وہ اس کی تہہ کو ایک گہرے کنویں کے مانند بغور دیکھنے لگا تو اس نے وہاں قاتل کو ایک خوفناک اور خطرناک سانپ کی طرح سکڑ کر ہانپتے ہوئے دیکھا۔

"میں قسم کھا چکا ہوں کہ تم مجھ سے سات زمینوں کی تہہ میں بھی بچ نہیں سکتے اور میں تمہیں پکڑ کر ہی دم لوں گا۔" اس کی آواز کی گونج بجلی کی طرح کڑکتی ہوئی سنائی دینے لگی۔

سیارہ ڈائجسٹ کی ایک اور عظیم پیشکش

شرعی احکام

شائع ہو گیا ہے

قیمت 175 روپے

عبادات سے معاملات تک اور معاشرت سے لیکر سیاسیات تک
تبلیغی نصاب، قرآنی آیات اور صحیح احادیث کی روشنی میں

★ اسلامی ضابطہ حیات جس کی روشنی میں آپ اپنے شب و روز گزار سکتے ہیں۔

★ آخرت کا توشہ، دلوں کی بیماریوں کے لیے شفاء۔

★ نیکیوں کی طرف رہنمائی اور گناہوں سے بچنے کے طریقے۔

★ ایسے سنہری حروف جنہیں پڑھ کر آپ اپنے اخلاق و کردار کی کوتاہیوں کو دور کر سکتے ہیں۔

سیارہ ڈائجسٹ 240 ریواز گارڈن لاہور فون: 37245412

قاتل نے اپنے پستول کو جس میں صرف ایک گولی تھی اٹھایا۔ اور جب اس کا نشانہ باندھنے کے بعد اسے چلانے کی کوشش کی تو گولی نہ چل سکی۔ اب اس نے اپنے آپ کو مکمل طور پر موت کی آغوش میں پایا اور دیوانہ وار اپنی سرخ اور قہر آلود آنکھوں سے کبھی پستول کو اور کبھی اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اس نے پھنسی ہوئی گولی کو چلانے کی بھرپور کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوا۔ اب اس کی کیفیت جال میں پھنسے شکار کی سی تھی۔ اوپر سے مقتول کے وارث کے پستول لوڈ کرنے کی آواز آئی اور اسے یقین ہوگیا کہ حریف کی گولی پستول کے دہانے سے نکلنے کے لیے بے تاب ہے۔ اسی اثناء میں اس نے چیخ کر کہا۔

”گولی مت چلانا۔ میں اوپر تمہارے پاس آرہا ہوں“۔

یہ کہہ کر وہ بلاتردد اوپر چڑھ آیا۔

اس نے اپنا پستول قاتل کے سر سے لگا کر اس کا منہ گاؤں کی طرف پھیر دیا اور اسے مسلسل چلنے کی تاکید کی۔ یوں دونوں ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ قاتل خوف کی وجہ سے لرز رہا تھا۔ اس کے پاؤں کانپ رہے تھے اور وہ بے حس ہوچکے پاؤں بمشکل گھسیٹ رہا تھا۔ وہ پیچھے اور اِدھر اُدھر دیکھنے کی جرأت نہ کرسکتا تھا کیونکہ اسے حکم دیا گیا تھا کہ وہ خاموشی سے چلتا رہے۔ وہ دونوں گاؤں کے اس مقام تک پہنچ گئے جہاں اس کے باپ کو اس قاتل نے جواب مکمل طور پر اس کے پستول کی زد میں تھا...... موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا اور جسے پکڑنے کے لیے اسے اتنی تکالیف کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

مقتول کا خون تاحال خون کا ثبوت تھا جبکہ لاش کو دفنا دیا گیا تھا۔

اُدھر قاتل کرب سے مغلوب ہوکر نہایت عاجزی، مایوسی اور ملتجی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا لیکن اس نے چیخ کر اسے کہا۔

”مت رکو! عدالت تک پہنچنے کے لیے ابھی فاصلہ باقی ہے!“

اور پھر جب فاصلے طے کرنے کے بعد وہ دونوں گاؤں کے سرے پر واقع مسجد تک پہنچ گئے۔ تو اس نے قاتل کو اپنے جوتے اُتارنے کا حکم دیا۔ دونوں نے اپنے اپنے جوتے اُتار دیے۔ مسجد میں داخل ہوئے اور مسجد کے خوش نما دیدہ زیب محراب کے سامنے دوزانو ہوکر بیٹھ گئے۔ اس نے طاق سے قرآن شریف اٹھایا اور نہایت عقیدت و احترام سے چوم کر قاتل کے عین سامنے رکھ دیا اور کہنے لگا:۔

”تمہیں یاد پڑتا ہے کہ اسی مسجد میں اسی جگہ جرگے کے معززین کے روبرو تم نے اسی قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر اور اسے گواہ بنا کر میرے باپ سے ہمیشہ کے لیے اپنی دشمنی ختم کرنے کا حلف اٹھایا تھا اور یوں ہماری آپس میں صلح ہوگئی تھی“۔

قاتل کی سرخ ہوئی آنکھوں سے وہ صاف اور شفاف آنسو گرے اور اس نے سسکیوں سے بھری ہوئی آواز میں کہا ”ہاں مجھے اچھی طرح یاد ہے لیکن اب میں اپنی غلطی پر بے حد نادم ہوں“ پھر وہ چیخ چیخ کر رونے لگا اور ندامت و شرمساری کے شدید جذبات سے مغلوب ہوکر اس کے قدموں میں گر پڑا۔ اس نے جھک کر اسے اٹھایا اور محراب کے قریب لے گیا اور اس کے سر کو زمین کے ساتھ اس انداز میں جھکا دیا کہ وہ سربسجود ہوا اور پھر اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف کر کے چیخنے لگا۔

”اے اللہ! میں نے تیرا باغی تیری عدالت تک پہنچا دیا اور اب یہ تیرے ابدی فیصلے کا منتظر ہے“۔

یہ کہہ کر وہ دوڑتا ہوا اکیلا مسجد سے باہر نکل آیا۔

”اور وہ بدل گئی......!“

نواز خان



”اوہ وہ بدل گئی......!“

نواز خان

”وہ حوا کی بیٹی مرد کو حیران کرنا چاہتی تھی اور اس کے لیے کچھ بھی کر گزرتی تھی“

اس دلچسپ کیس کا تعلق بھی ڈلہوزی سے ہے۔ ڈلہوزی میں میری رہائش بڑی پُرفضا جگہ پر تھی۔ سڑک سے صرف دس بارہ فٹ نیچے ڈھلوان پر یہ بڑے صاف ستھرے کوارٹر تھے۔ عقب میں وسیع دلفریب وادی تھی اور وادی میں بکھرے ہوئے خوبصورت مناظر تھے۔ دائیں طرف گھنے درخت جہاں ایک انگریزی سکول تھا اور سکول کے بچوں کے لیے خوبصورت پارک بنا ہوا تھا۔ بائیں طرف چشمے کا پانی ایک آبشار کی صورت نشیب میں گرتا ہے۔ اس آبشار کے گرد لوہے کا سرخ جنگلے لگے ہوئے تھے۔ سیاح ان جنگلوں کے سہارے جھک کر گھنٹوں آبشار کا نظارہ کرتے تھے۔ کوارٹر کے سامنے سڑک تھی اور اس پر صرف پیدل لوگ ہی آجا سکتے تھے۔ کوارٹروں کے پچھواڑے وادی کے رُخ پر چھوٹے چھوٹے خوبصورت کاٹیج بنے ہوئے تھے۔ ان کی مخروطی چھتیں سرخ تھیں اور ہر کاٹیج میں گھاس کے چھوٹے چھوٹے لان تھے۔ اکثر کاٹیج دو یا تین کمروں پر مشتمل تھے۔ جون، جولائی میں ان کا کرایہ 300 روپے ہفتہ تک پہنچ جاتا تھا۔ اس وقت کا 300 آج کل سات آٹھ ہزار سے کم نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی ان کاٹیجز میں کھاتے پیتے لوگ ہی قیام کرتے تھے۔

ان کاٹیجز میں سے ایک کاٹیج گلزار نامی ایک نوجوان کا تھا۔ گلزار چوڑے چکلے جسم کا مالک ایک ہنس مکھ اور سادا لڑکا تھا۔ اس کی کل جائیداد اور پونجی بھی ایک کاٹیج تھا جو اسے اپنے باپ سے ترکے میں ملا تھا۔ سال میں چھ مہینے تو یہ کاٹیج دوسرے کاٹیجز کی طرح ویران ہی پڑا رہتا تھا۔ اصل سیزن جون جولائی ہی ہوتا تھا جب میدانی علاقوں کی گرمی سے گھبرائے ہوئے عوام و خواص پہاڑی مقامات پر ہلہ بولتے تھے اور ہر اچھی بُری جگہ کرائے پر چڑھ جاتی تھی۔ ان دنوں گلزار کو بھی معقول آمدنی ہو جاتی تھی اور وہ اپنے اور اہل خانہ کے لیے سال بھر کا راشن اکٹھا کر لیتا تھا۔ گلزار کی دو چھوٹی بہنیں تھیں اور ایک بڑا بھائی۔ یہ بھائی بیمار رہتا تھا اور کسی کام کاج کے قابل نہیں تھا۔ اس طرح آٹھ افراد پر مشتمل کنبے کا سارا بوجھ گلزار کے کندھوں پر تھا۔ اس کے اہل خانہ

ست دھارا سے آگے ایک چھوٹے سے "جاہو" نامی گاؤں میں رہتے تھے۔

ایک سیزن میں میری والدہ مجھ سے ملنے ڈلہوزی آئیں۔ ڈھائی تین ماہ میرے پاس کوارٹر میں رہیں۔ مجھے اپنے ہاتھ کی پکی ہوئی روٹی کھلا کر انہیں بڑی تسلی ہوا کرتی تھی۔ کچھ یہی حال میرا بھی تھا۔ رات کو سوتے وقت اُن کے پاؤں دبا کر جو خوشی ملتی تھی وہ ہر خوشی سے بے نیاز کردیتی تھی۔ پڑوسی ہونے کے ناتے گلزار بھی اکثر ہمارے گھر آجایا کرتا تھا۔ میری غیر موجودگی میں وہ ماں جی کو تنہائی کا احساس نہیں ہونے دیتا تھا۔ ماں جی اُس کو بہت پیار کرنے لگی تھیں اور بیٹا کہہ کر بلاتی تھیں۔ ماں جی کے آنے سے پہلے میں گلزار کو پڑوسی سے زیادہ اہمیت نہیں دیا کرتا تھا لیکن وہ ماں جی کو اچھا لگنے لگا تو مجھے بھی لگنے لگا۔ ڈھائی تین ماہ بعد ماں جی تو واپس چلی گئیں لیکن میرے اور گلزار کے درمیان قریبی تعلق قائم کرگئیں۔ گلزار اب اکثر میرے کوارٹر میں آجاتا تھا اور ہم بے تکلفی سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے تھے۔ گلزار کی سب سے بڑی خوبی اس کی سادگی تھی۔ کوئی لالچ دھوکا فریب اس میں نہیں تھا۔ نہ اُس نے کبھی مجھ سے کسی کی سفارش کی۔ نہ کسی پر دباؤ ڈلوایا اور نہ کوئی اور فائدہ اٹھایا۔ وہ بس کام سے کام رکھنے والا اور اپنے حال پر خوش رہنے والا بندہ تھا۔

مجھے یاد ہے وہ ستمبر اکتوبر کے دن تھے۔ سردی نے اپنے پر پرزے نکالنے شروع کردیئے تھے اور خزاں دبے پاؤں سرسبز وادیوں کی طرف بڑھ رہی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ گلزار چند دنوں سے کچھ اُداس اور اکھڑا اکھڑا ہے۔ میں نے اُسے کریدنے کی کوشش کی لیکن وہ حسب معمول ہنس کر ٹال گیا۔ میں نے سوچا شاید یہ سیزن ختم ہونے کی اُداسی ہے۔ سیاحوں کی میزبانی کرنے والے ایسی اُداسی کا اکثر شکار ہوجاتے ہیں لیکن پھر جلد ہی یہ اُداسی ختم بھی ہوجاتی ہے۔ برف باری کا نظارہ کرنے والے اِکا دُکا سیاح ہل سٹیشن پر آنے لگتے ہیں اور سنسان گلیوں میں زیادہ نہیں تو تھوڑی بہت رونق کا سامان ہوجاتا ہے۔ میں نے بھی گلزار سے زیادہ پوچھ تاچھ مناسب نہیں سمجھی اور اسے اُس کے حال پر چھوڑ دیا۔

پھر ایسا ہوا کہ دو تین ہفتے گلزار سے ملاقات ہی نہیں ہوسکی۔ میں تو مصروف تھا مگر گلزار کو ایسی کیا مصروفیت آن پڑی تھی؟ اس شریف آدمی نے اپنی صورت تک نہیں دکھائی تھی۔ مجھے وسوسہ ہونے لگا کہ شاید میری کوئی بات اُسے بُری لگ گئی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ ناراض ہے۔ ایک روز مقامی چھٹی تھی۔ میں نے ایک سنتری کو گلزار کی طرف بھیجا...... سنتری گلزار کو تو نہیں لایا تاہم گلزار کا ایک قریبی دوست جماعت علی خان اس کے ساتھ چلا آیا۔ جماعت علی ایک کانج کا نگران تھا اور گلزار سے اُس کی خاصی بے تکلفی تھی۔ گلزار کے ساتھ وہ ایک دو دفعہ میرے کوارٹر میں بھی آچکا تھا۔ اس نے مجھے سلام کیا اور جھجکتا ہوا ایک کرسی پر بیٹھ گیا...... یہ کوارٹر کا صحن تھا اور یہاں بڑی مزیدار دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے سنتری سے کہا کہ وہ گرما گرم قہوہ پلائے۔ سنتری چلا گیا تو میں نے جماعت علی سے پوچھا "ہاں بھئی...... کدھر ہے وہ تمہارا لنگوٹیا۔ مجھے تو اُس کی شکل بھی بھول گئی ہے کہیں ڈلہوزی تو نہیں چھوڑ گیا"۔

جماعت علی کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ اُبھری، پشتو کے لہجے میں بولا "خو...... وہ ہے تو ڈلہوزی میں لیکن اس کا دل و دماغ ڈلہوزی میں نہیں ہے۔ ام کئی دن سے سوچ رہا تھا کہ آپ سے بات کرے لیکن موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ اب آپ کا سنتری گلزار کو ڈھونڈتا ہوا اُدھر چشمے پر آیا تو ام نے بولا چلو آؤ ام تمہارے ساتھ چلتا ہے"۔

"لیکن اس کو بیماری کیا ہے بھائی...... کچھ پتہ بھی چلے"۔

جماعت خاں کے چہرے پر ایکدم سنجیدگی کے سائے گہرے ہو گئے۔ کچھ دیر سر کھجاتا رہا۔ پھر دائیں بائیں دیکھ کر ذرا رازداری سے بولا "کم بخت خود کو روگ لگا بیٹھا ہے خوامخواہ...... اِدھر ایک میم صاحبہ ٹھہرا تھا ناں اُس کے کاٹیج میں۔ بس اُسی کا نام لے لے کر آہیں بھرتا ہے کہتا ہے وہ ام کو نہ ملا تو ام مر جائے گا"۔

حیرت سے میری آنکھیں کھل گئیں۔ جماعت خاں جس میم صاحبہ کا ذکر کر رہا تھا اس کا نام جینی تھا اور وہ سچ مچ کی میم تھی۔ بے حد تیز طرار اور چلبلی لڑکی تھی۔ اسے دیکھ کر ہالی وڈ کی کسی حسین دلکش ساحرہ کا تصور ذہن میں آتا تھا۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ اُس کا والد صنعت کار ہے اور لاہور کے نواح میں پرزے ڈھالنے کی اُس کی بہت بڑی فیکٹری ہے۔ جینی کے ساتھ اُس کی سہیلی تھی۔ اس کے علاوہ ایک شوفر اور خانساماں بھی تھا۔ جینی اور اُس کی سہیلی کے لیے ایک کاٹیج بھی ضرورت سے زیادہ تھا لیکن انہوں نے ایک ساتھ تین کاٹیج کرائے پر لے لیے تھے۔ ایک میں جینی اور اس کی سہیلی نے قیام کیا تھا۔ دوسرے میں شوفر اور خانساماں صاحب قیام فرما ہوئے تھے۔ تیسرا کاٹیج اس لیے خالی پڑا رہتا تھا کہ کہیں کوئی مہمان نہ آ جائے۔ جینی کی سہیلی پریما ہندوستانی تھی لیکن انگریزی لباس پہنتی تھی۔ انگریزی بولتی تھیں اور انگریزوں سے بڑھ کر ماڈرن تھی۔ وہ کسی اعلیٰ افسر کی بیٹی تھی۔ یہ دونوں لڑکیاں تقریباً دو مہینے ڈلہوزی میں رہی تھیں اور جتنی دیر رہی تھیں اودھم مچائے رکھا تھا۔ لگتا تھا جیسے انہوں نے قسم کھا رکھی ہے کہ کوئی کام سیدھا کرنا ہی نہیں۔ اُن کے پاس نئے ماڈل کی شاندار گاڑی تھی مگر اس گاڑی پر انہوں نے چھ طرح کے رنگ کر رکھے تھے۔ میں نے اس گاڑی کو ڈلہوزی میں جب بھی دیکھا ایسی جگہ کھڑے دیکھا جہاں "نو پارکنگ" کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ جینی اور پریما کا لباس بھی اپنی مثال آپ ہوتا تھا۔ کبھی دس سال پیچھے کا فیشن کبھی دس سال آگے کا فیشن۔ ایک روز میں نے جینی کو ایسے لباس میں شاپنگ کرتے دیکھا کہ سکتے میں رہ گیا۔ میں ہی کیا جس نے بھی دیکھا ہوگا سانس لینا بھول گیا ہوگا۔ لباس کے نام پر اُس نے مشکل سے ڈیڑھ دو گز کپڑا استعمال کیا ہوگا۔ اسکرٹ جسم سے چپکا ہوا تھا اور کولہوں سے نیچے اترتے ہی ختم ہو جاتا تھا۔ یہی حال بازوؤں اور گریبان وغیرہ کا تھا۔ لوگ رُک رُک کر اُسے دیکھ رہے تھے۔

میں نے جماعت خاں کی زبانی گلزار کے بارے میں سنا تو حیران رہ گیا۔ کہاں وہ اونچی سوسائٹی کی نخرے باز لڑکی کہاں یہ نچلے سے نچلے طبقے کا معمولی سا لڑکا۔ گلزار سے زیادہ آن بان والے تو جینی کے ملازم تھے۔ فوراً میرے ذہن میں آیا کہ گلزار کے ساتھ ضرور کوئی شرارت ہوئی ہے یا پھر وہ بے وقوف خود ہی کسی غلط فہمی کا شکار ہو گیا ہے۔ شکل و صورت سے وہ بڑا رومان پسند نظر آتا تھا۔ خاص طور پر اُس کی سوئی سوئی آنکھیں تو جیسے ہر وقت خواب دیکھتی رہتی تھیں۔ میں نے جماعت خاں سے پوچھا "کیا اُسے پاگل کتے نے کاٹا ہے کہ آہیں بھرتا پھرتا ہے؟ جس لڑکی کا وہ نام لے رہا ہے اُس کے تو ملازم بھی اُس سے کہیں زیادہ حیثیت والے ہیں۔ میرے خیال میں تو وہ میرے تمہارے جیسے بندوں سے بات کرنا بھی گوارا نہ کرتی ہوگی"۔

جماعت خاں نے عجیب سے لہجے میں کہا "آپ ٹھیک کہتا ہے نواز صاحب۔ وہ امارے تمہارے جیسے بندوں سے بات کرنا بھی گوارا نہیں کرتی...... لیکن...... یہ حرامی گلزار صاحب تو اُس کے ساتھ سو چکا ہے"۔


اثر دکھائے گا صرف...
کیئر
پریکلی ہیٹ پاؤڈر
TRICLOSAN
Extra Cooling Effects
TRICLOSAN
Coslab Private Limited

میں سکتے میں رہ گیا۔ جماعت خاں کے ہونٹوں سے نکلے ہوئے الفاظ دھماکوں کی طرح میرے کانوں میں گونجنے لگے۔ جماعت خاں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''ام جھوٹ نہیں بولتا نواز صاحب۔ ام کو جھوٹ بولنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ ام نے اب تک کسی کو نہیں بتایا۔ آپ کو بھی صرف اس لیے بتا رہا ہے کہ آپ اس کا سچا دوست ہے۔ اُس پاگل کو اس مصیبت سے نکالنے کا کوئی چارہ کرے۔ ام سولہ آنے سچ کہہ رہا ہے جناب...... آپ کی یہ بات بالکل ٹھیک ہے کہ میم صاحب جیسا اعلیٰ لوگ اور ام جیسا گھٹیا لوگ کے درمیان ہزاروں میل کا فاصلہ ہوتا ہے۔ پر یہ فاصلہ مٹ گیا ہے جناب۔ اور مٹانے والا خود وہ میم صاحب ہے۔ ام کو خبر نہیں اُس نے ایسا کیوں کیا پر اُس نے کیا اور گلزار کو بھی پاگل بنا کر چلا گیا''۔

میں نے اُٹھ کر بیرونی دروازہ بند کر دیا اور جماعت خاں سے کہا کہ وہ مجھے اس واقعے کی پوری تفصیل بتائے۔ جماعت خاں نے اپنے مخصوص لہجے میں بولنا شروع کیا اور دھیرے دھیرے اس واقعے کے اسرار و رموز سے پردہ ہٹانے لگا۔ اُس نے بتایا کہ یہ ڈیڑھ ماہ پہلے کا واقعہ ہے۔ میم صاحب کو ڈلہوزی میں آئے چار ہفتے ہو چکے تھے۔ وہ ہر دوسرے تیسرے دن اپنی سہیلی پریما کے ساتھ گھڑسواری کے لیے نکلتی تھی۔ جینی اُس گھوڑے پر سوار ہوتی تھی جو گلزار کے پاس ہے۔ (گلزار کے پاس دو تین گھوڑے بھی تھے۔ ان میں سے ایک گھوڑا بڑا شاندار تھا۔ کالج میں ٹھہرنے والے لوگ اکثر اُس سے یہ گھوڑا کرائے پر لے لیتے تھے) جینی نے پورے دو ماہ کے لیے اس گھوڑے کا ایڈوانس کرایہ گلزار کو دے رکھا تھا اور اُسے حکم تھا کہ ان دو مہینوں کے دوران گھوڑا ہر وقت تیار رہے گا۔ جینی کے علاوہ کوئی اس پر سوار نہیں ہوگا۔ خود گلزار بھی نہیں۔

گلزار اس حکم کی پوری پابندی کرتا تھا۔ ہر روز نو بجے کے قریب گھوڑے کو بنا سنوار کر لگام سے تھامتا تھا اور کالج میں لے آتا تھا۔ اگر میم صاحب نے گھڑ سواری کے لیے جانا ہوتا تھا تو شوفر گلزار کو بتا دیتا تھا۔ دوسری صورت میں گلزار اُسے واپس لے جاتا تھا۔ ایک روز گلزار گھوڑا لے کر کالج پہنچا تو شوفر اور خانساماں کہیں گئے ہوئے تھے۔ کالج میں صرف پریما اور میم صاحبہ تھیں۔ پریما نے گلزار سے کہا کہ وہ لان میں بیٹھ جائے میم صاحبہ ابھی باتھ روم میں ہیں۔ تھوڑی دیر میں نکلیں گی تو بتائیں گی کہ گھوڑا چاہیے یا نہیں۔

گلزار وہیں لان کے ایک گوشے میں گھاس پر بیٹھ گیا۔ گھوڑا اُس نے کالج کے گیٹ کے سے باندھ دیا تھا۔ وہ قریباً ایک گھنٹہ وہاں بیٹھا انتظار کرتا رہا۔ میم صاحبہ کی صورت دکھائی دی نہ اس کی سہیلی کی۔ دوسرے گھوڑے والا بھی کہیں دکھائی نہیں دیا۔ ساڑھے دس پونے گیارہ بجے کے قریب پریما باہر نکلی اور اس نے گلزار سے کہا کہ میم صاحبہ تمہیں اندر بلا رہی ہیں۔ گلزار کے اوپر کا سانس اوپر رہ گیا۔ اسے اندیشہ ہوا کہ ضرور اس سے کوئی غلطی ہوگئی ہے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس طرح میم صاحبہ کی موجودگی میں وہ کالج کے اندر قدم رکھ رہا تھا۔ دھڑکتے دل اور کانپتی ٹانگوں سے وہ اندر پہنچا اور اس کے ساتھ ہی اس پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹنے شروع ہو گئے۔ وہ جیسے ایک حسین اور عجیب و غریب خواب میں کھو گیا تھا۔ اُس نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا کہ میم صاحبہ اُس سے اس طرح پیش آئیں گی۔ کہاں وہ آسمان کا ستارہ کہاں وہ زمین کا کنکر...... لیکن آسمان کا ستارہ کنکر سے کھیلنے کے لیے زمین پر آ گیا تھا۔ وہ کھیل تھا خواب تھا یا فریب تھا۔ گلزار کی سمجھ میں کچھ

نہیں آرہا تھا۔ خواب گاہ کی نیم تاریک فضا میں وہ تھا اور میم صاحب کی مہربان مسکراہٹیں تھیں۔ ایک حسین جسم ریشمی تھان کی طرح گلزار کے سامنے کھلتا چلا گیا۔ یہ خود سپردگی اُسے ہوش و حواس سے بیگانہ نہ کرتی تو اور کیا ہوتا...... اور وہ بیگانہ ہوتا چلا گیا......

اُس کی کون سی خواہش تھی جو اُس روز پوری نہ ہوئی۔ اُس سے خدمت کرانے والی اُس کی خدمت گار بنی ہوئی تھی۔ دل و جان سے اُس کی میزبانی کررہی تھی۔ اُس روز گلزار نے اپنی زندگی کا بہترین کھانا کھایا۔ بہترین سگریٹ پیے۔ بہترین بستر پر لیٹا اور بہترین عورت کی قربت حاصل کی۔ یہاں تک کہ شام کے سات بج گئے۔ میم صاحب نے خواب گاہ کی گہری تاریکی میں گلزار کو مخاطب کیا ''آج جو کچھ ہوا۔ اُسے بھول جاؤ...... ہمیشہ کے لیے'' اگلے روز جب گلزار پھر نو بجے گھوڑا لے کر آیا تو میم صاحب بالکل اجنبی نظر آرہی تھی۔ نہ وہ مسکراہٹ نہ وہ نرم لہجہ نہ وہ ناز و ادا۔ کچھ بھی کل والا نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا کل کا دن میم صاحب کی زندگی میں آیا ہی نہیں لیکن یہ دن گلزار کی زندگی میں تو آیا تھا اور ایسے آیا تھا کہ وہ مرکر بھی اُسے بھول نہیں سکتا تھا۔ اس واقعے کے بعد میم صاحب تین چار ہفتے مزید ڈلہوزی میں رہیں لیکن پھر کبھی انہوں نے گلزار سے آنکھ ملائی اور نہ مطلب کے علاوہ بات کی۔ یہاں تک کہ اگست کے آخر میں وہ واپس چلی گئیں۔ اب گلزار تھا اور اُس کی بے قراریاں تھیں۔ وہ میم صاحب کے عشق میں گرفتار ہو چکا تھا اور رات دن آہیں بھرتا تھا۔

یہ ایک عجیب کہانی تھی جو جماعت خاں کی زبانی مجھ تک پہنچی۔ ایسے واقعات عموماً جنوں پریوں کی کہانیوں میں ملتے ہیں اور کسی ہوش مند آدمی کے لیے اُن پر یقین کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ شاید میں بھی اس کہانی کو سنتے ہی جھوٹ اور خرافات قرار دے دیتا لیکن چند ہفتے پہلے ایک بات ایسی ہو چکی تھی جس کے سبب میں ایسا نہیں کرسکا اور جماعت خاں کی باتیں سن کر میری رگوں میں سنسناہٹ سی دوڑنے لگی مجھے لگا جیسے یہ واقعہ حقیقت سے زیادہ دور نہیں ہے۔

اب میں آپ کو چند ہفتے پہلے کا وہ واقعہ بتاتا ہوں جو اسی تھانے میں اسی سیزن میں میرے سامنے پیش آیا تھا اور وقت گزرنے کے باوجود میرے ذہن میں پہلے روز کی طرح تازہ تھا۔ قریبی آبادی سے میرا عملہ ایک سیوک سنگھ نامی شخص کو پکڑ کر لایا۔ یہ شخص راج مزدور تھا اور آبادی میں تعمیر ہونے والی ایک عمارت میں مزدوری کررہا تھا۔ ٹھیکیدار نے سیوک پر الزام لگایا تھا کہ اُس نے اُس کے کوٹ کی جیب سے سو روپے چوری کیے ہیں۔ یہ کوٹ ٹھیکیدار نے اُتار کر کرسی کی پشت پر ڈالا ہوا تھا۔ میرا اے ایس آئی سیوک کو پکڑ کر تھانے لے آیا۔ سیوک شکل و صورت سے ہی آوارہ سا نظر آتا تھا۔ اُس کی عمر بائیس سال کے لگ بھگ تھی۔ ہاتھ پاؤں مضبوط اور شانے چوڑے تھے۔ اُس کے ساتھیوں نے بتایا کہ یہ ٹھرا پیتا ہے اور جو پیسے باقی بچتے ہیں اُن سے ٹاکی (فلم) دیکھ لیتا ہے۔ میرے اے ایس آئی نے تھانے میں سیوک کو مار لگوائی تو اُس نے سو روپے کے علاوہ چھوٹی موٹی چند اور چوریاں بھی قبول کرلیں۔ جب حوالاتی کھلنے لگے تو تفتیش کرنے والے کا حوصلہ بلند ہو جاتا ہے اور اُسے اطمینان ہو جاتا ہے کہ وہ ایک بے گناہ شخص کو مار پیٹ کا نشانہ نہیں بنا رہا۔ وہ زیادہ اعتماد کے ساتھ اُسے پھینٹی لگاتا ہے اور اس پھینٹی کا نتیجہ کبھی کبھی کسی انکشاف کی صورت میں نکل آتا ہے۔ سیوک سنگھ کے معاملے میں بھی یہی کچھ ہوا۔ مار پیٹ سے جان بچانے کے لیے سیوک سنگھ نے انکشاف کیا کہ وہ ایک بہت بڑی میم صاحب کے ساتھ اُس کے گھر میں رات گزار چکا ہے اور وہ سب

کچھ کر چکا ہے جو مرد اور عورت کرتے ہیں۔ اے ایس آئی نے اُس سے میم صاحب کا نام پوچھا تو سیوک نے یہ بتا کر اے ایس آئی کے چھکے چھڑا دیئے کہ وہ "پال کالونی" کے آٹھ نمبر گیٹ میں رہتی ہے۔ یہ پڑھی لکھی انگریز صنعت کار کی حسین و جمیل بیٹی جین شیلڈ عرف جینی کا تھا۔ اے ایس آئی فوراً میرے پاس آیا اور بتایا کہ سیوک نامی حوالاتی یہ بات کہتا ہے۔

میں نے خود جا کر سیوک سے پوچھ گچھ کی۔ وہ حلفیہ کہہ رہا تھا کہ ایسا ہو چکا ہے۔ اُس نے بتایا کہ ایک روز میں ڈاک خانے کے سامنے مٹی والے چوک میں دوسرے مزدوروں کے ساتھ دیہاڑی لگانے کے لیے بیٹھا ہوا تھا۔ سرخ رنگ کی ایک کار آئی اس میں وہ میم صاحب تھیں۔ انہوں نے مجھے پاس بلایا۔ دیہاڑی طے کی اور گاڑی میں بٹھا کر پال کالونی لے آئیں۔ یہاں کوئی خاص کام نہیں تھا میں سارا دن ایک باغیچے میں مٹی اِدھر سے اُدھر کرتا رہا۔ دوپہر کو مجھے بڑا لمبا چوڑا کھانا بھی کوٹھی والوں نے ہی کھلایا۔ شام کو میں واپس جانے لگا تو انگریز میم صاحب مجھے اندر لے گئی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ میں خود کو میم صاحب کی جوتیوں میں بیٹھنے کے قابل نہیں سمجھتا تھا پر اُس نے مجھے سر آنکھوں پر بٹھایا۔ صبح میں جانے لگا تو اُس نے پچاس روپے میری جیب میں رکھ دیئے اور کہا کہ جو کچھ ہوا اُسے بھول جاؤ اور آئندہ کبھی اس طرف آنے کی کوشش نہ کرنا۔ نہ ہی کسی کو اس واقعہ کے بارے میں بتانا...... میں چند دن حیران پریشان پھرتا رہا۔ پھر میں نے اپنے دو مزدور ساتھیوں کو اس بارے میں بتا دیا۔ وہ مجھ پر ہنسنے لگے۔ انہوں نے کہا کہ نشہ کر کے ساری رات کسی گندی نالی میں پڑا رہا ہوں اور انہیں سبز پری کی کہانی سنا رہا ہوں۔ انہیں میری کسی بات پر یقین نہیں آیا۔ تھک ہار کر میں چپ ہو گیا۔ جن دو مزدور ساتھیوں کو میں نے اپنی کہانی سنائی تھی انہوں نے میری بات پر یقین نہیں کیا لیکن انہوں نے جس تیسرے شخص کو اس بارے میں بتایا وہ بے وقوف قسمت آزمانے کے لیے "پال کالونی" کے آٹھ نمبر گیٹ پر چلا گیا۔ وہ وہاں گیٹ کے سامنے ٹہل رہا تھا کہ دو آدمیوں نے اسے پکڑ لیا اور مار مار کر کپڑے پھاڑ دیئے۔ پھر اُسے سڑک پر مرغا بنا دیا اور چھڑیوں سے پیٹا۔ بعد میں اُس پر کتے کھول دیئے جو اُسے پال کالونی سے دور لاتمک روڈ چھوڑ کر آئے"۔

سیوک سنگھ کا وہ بیان آج دو تین مہینے بعد حرف بحرف میرے کانوں میں گونج رہا تھا۔ اب اس بیان پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ یہ بات اب ثابت ہو رہی تھی کہ ایک مہینہ پہلے تک گلزار کے خوبصورت کاٹیج میں کچھ "بدصورت" کام ہوتے رہے ہیں۔ مزدور سیوک سنگھ ان دنوں جوڈیشل ریمانڈ پر جیل میں تھا اور مجھے تسلی تھی کہ ضرورت پڑی تو میں اُس سے تفصیلی بیان لے سکوں گا۔

بڑے لوگوں کی بڑی غلطیاں ہوتی ہیں اور وہ چھپ جاتی ہیں۔ چھوٹے لوگ اگر چھوٹی سی غلطی کرتے ہیں تو وہ بھی چھپ نہیں سکتی۔ میم صاحب نے گلزار کے کاٹیج میں جو "کارنامے" دکھائے وہ معمولی نہیں تھے لیکن نہ تو اس پر پکڑ ہوئی اور نہ کسی نے اس بات کو اُچھالا۔ کسی اور کی بات تو رہی ایک طرف خود میں نے اس معاملے کو دبانے کی کوشش کی۔ سب سے پہلے جب سیوک سنگھ نے میم صاحب کے بارے میں بیان دیا تو میں نے اسے سختی سے ڈانٹ دیا تھا کہ وہ اپنی اس بکواس کو اپنے تک رکھے اور کسی کے سامنے زبان نہ کھولے۔ جینی کوئی معمولی لڑکی نہیں تھی۔ اُس نے جو کچھ کیا تھا بغیر کوئی ثبوت چھوڑے کیا تھا۔ اب اگر کوئی اُس پر الزام لگاتا تو یہ سمجھا جاتا کہ وہ اسے بدنام کر رہا ہے۔ اور ایک با رسوخ انگریز

کی بیٹی کو بدنام کرنا کوئی معمولی 'جرم' نہیں تھا۔ میں تو رہا ایک طرف اس جرم میں ہمارے ایس پی صاحب تک کی پگڑی اُڑ سکتی تھی...... سیوک سنگھ کے بعد اب گلزار کے ساتھ بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا تھا۔ میں نے گلزار کو اپنے کوارٹر میں بلایا اور دو ڈھائی گھنٹے لگا کر اطمینان سے اسے سمجھایا کہ جو کچھ ہو گیا ہے وہ اب اُسے بھول جائے۔ یہ ایک خطرناک معاملہ ہے اور جہاں رُک گیا ہے اسے وہیں رُک جانا چاہیے۔ میں نے اُس سے یہ بھی کہا کہ وہ بھول کر بھی اس واقعے کا ذکر کسی اور سے نہ کرے۔

گلزار نے مجھے جو جواب دیا وہ بڑا بیوقوفی کا تھا۔ کہنے لگا "لالہ جی! میں یہ نہیں کہتا کہ میم صاحب پاک صاف اور مجھ سے پہلے وہ کسی اور سے نہیں ملی لیکن ایک بات کا مجھے یقین ہے۔ اُس نے مجھے پسند کیا ہے اور یہاں سے جا کر وہ دن رات مجھے یاد کرتی ہو گی" (وہ مجھے لالہ کہا کرتا تھا)

میرا جی چاہا کہ جوتا اُتار کر گلزار کے سر پر ماروں تاکہ اُس کے دماغ سے عشق کے کیڑے جھڑیں۔ وہ خود کو پرلے درجے کا چغد ثابت کر رہا تھا۔ اُس کا رویہ اُس نوخیز لڑکے جیسا تھا جو پہلی بار کسی طوائف کے پاس جاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اب یہ طوائف اپنا کاروبار بند کر کے بیٹھ جائے گی اور ساری عمر اس کی راہ تکتی رہے گی۔ میں نے گلزار کو سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ "ہوں ہاں" میں سر ہلاتا رہا مگر کوئی بات بھی اس کے دل پر اثر نہیں کر رہی تھی...... میں نے اندازہ لگایا کہ میم صاحب اس کی زندگی میں آنے والی پہلی عورت ہے اور اُس سے مل کر گلزار نے جو انوکھا تجربہ حاصل کیا ہے وہ روگ کی طرح اس کے ذہن سے چمٹا ہوا ہے۔ سب کچھ جانتے بوجھتے بھی وہ خیال کر رہا تھا کہ میم صاحب اُس سے خاص الخاص انداز میں ملی ہے اور کبھی اُسے بھول نہیں پائے گی۔ اُس نے بڑے فخر سے مجھے بتایا کہ برف باری کے سیزن میں میم صاحب پھر یہاں آ رہی ہے اور اُس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ میرے ہی کاٹیج میں ٹھہرے گی۔

دن گزرتے رہے۔ اکتوبر کا سارا مہینہ سرد اور خشک ہوائیں چلتی رہیں۔ نومبر میں خشکی کچھ اور بڑھ گئی۔ درختوں کے پتے زرد ہو کر گرنے لگے۔ خزاں جو دبے پاؤں ان حسین چوٹیوں کی طرف بڑھ رہی تھی ایک دم جست لگا کر نشیب و فراز پر چھا گئی۔ نومبر کے ختم ہوتے ہوتے برف باری کے آثار نمودار ہونے لگے۔ دسمبر کے پہلے ہفتے میں شدید برف باری ہوئی اور "ڈلہوزی" نے برف کا خوبصورت لباس پہن لیا۔ اس لباس کو دیکھنے کے لیے میدانی علاقوں سے لوگ ٹولیوں کی صورت میں یہاں پہنچنے لگے۔ اکا دکا ہوٹل کھل گئے اور گلیوں بازاروں کی ویرانی دور ہونے لگی۔

گلزار بڑی شدت سے میم صاحب کا انتظار کر رہا تھا۔ کچھ عجیب سی حالت ہو چکی تھی اس کی ...... ہر وقت کھویا کھویا رہنا۔ گھنٹوں چشمے کے کنارے خاموش بیٹھا رہنا۔ کبھی گھوڑے پر بیٹھ کر وادی میں نکل جاتا اور دو تین روز بعد لوٹتا۔ میم صاحب نے اُس سے دسمبر کے تیسرے ہفتے میں آنے کا وعدہ کیا تھا۔ جوں جوں دسمبر کا تیسرا ہفتہ نزدیک آ رہا تھا اُس کی بے قراری بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ جب بھی مجھ سے ملتا سب سے پہلے تاریخ پوچھتا کہ لاہور میں موسم کیسا ہو گا۔ بارشوں کی وجہ سے راستے خراب تو نہیں ہو گئے ہوں گے۔ وغیرہ وغیرہ۔ صاف طور پر پتہ چلتا تھا کہ وہ میم صاحب کے انتظار کی ایک ایک گھڑی گن گن کر گزار رہا ہے...... مگر اب زبانی طور پر وہ اس کا اقرار نہیں کرتا تھا۔ کم از کم مجھ پر وہ یہی ظاہر کر رہا تھا کہ میم صاحب کے متعلق اُس نے سوچنا چھوڑ دیا ہے۔ مجھ سے اس نے وعدہ کیا تھا کہ اپنی ماں کے کہے پر عمل کرتے ہوئے وہ اس ماہ اپنی منگنی بھی کرا لے گا۔ اُس کا رشتہ اپنی ہی برادری میں ایک قبول صورت لڑکی سے ہو رہا تھا۔

دسمبر کا تیسرا ہفتہ گزرا اور چوتھا بھی گزر گیا۔ لیکن میم صاحب نہیں آئی۔ گلزار کی حالت قابلِ رحم تھی۔ وہ ظاہر کچھ نہیں کرتا تھا لیکن ایسی "بیماریاں" چھپی کب رہتی ہیں۔ اس کا کھانا پینا چھوٹا ہوا تھا۔ رنگ زرد ہو چکا تھا اور رتجگے سے آنکھیں دھندلائی رہتی تھیں۔ ہر روز علی الصبح وہ اپنے ہاتھوں سے کاٹیج کی جھاڑ پونچھ کرتا، جھاڑو دیتا۔ گراؤنڈ میں پانی وغیرہ لگاتا۔ پھر گھوڑے کے کھانے دانے اور مالش سے فارغ ہو کر چشمے کے کنارے جا بیٹھتا اور اپنی نگاہیں ذرا نیچے وادی میں بل کھاتی ہوئی سیاہ سڑک پر لگا دیتا...... یہاں تک کہ شام ہو جاتی۔

یہ جنوری کی دو یا تین تاریخ کی بات ہے۔ چھٹی کا دن تھا۔ میں اپنے کوارٹر کے صحن میں بیٹھا سورج اور بادلوں کی آنکھ مچولی دیکھ رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میرے ملازم نے دروازہ کھولا۔ سرگودھے سے آئے ہوئے ایک پارسی ڈاکٹر صاحب مجھ سے ملنا چاہتے تھے۔ ساتھ میں ان کے بیوی بچے بھی تھے۔ میں نے ذہن پر زور دیا تو ان کی صورت یاد آ گئی۔ وہ ڈیڑھ سال پہلے گرمیوں کے سیزن میں یہاں چند روز قیام کر چکے تھے۔ "یہاں" سے میری مراد گلزار کا کاٹیج ہے۔ اس قیام کے دوران مجھ سے اُن کی تھوڑی بہت علیک سلیک ہو گئی تھی۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو اندر بلایا۔ انہوں نے اپنا مسئلہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ اُن کی بیوی بچے ایک بار گلزار کے کاٹیج میں رہ چکے ہیں اب وہ ضد کر رہے ہیں کہ گلزار کے کاٹیج میں ہی رہیں گے۔ دوسری طرف گلزار کاٹیج خالی ہونے کے باوجود انہیں دینے پر رضامند نہیں ہے۔

میں نے گلزار کو بلایا۔ وہ کچھ برہم دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے اُسے ایک طرف لے جا کر کہا "کیا بات ہے بھئی کیوں انکار کر رہے ہو ڈاکٹر صاحب کو؟"

وہ بولا "لالہ! تم دیکھتے نہیں ہو، چھ بچے ہیں ان کے ساتھ، بچوں والی فیملی تو کباڑا کر دیتی ہے ہر چیز کا" میں نے کہا "بھلے مانس آدھا سیزن گزر گیا ہے۔ باقی جو آدھا رہ گیا ہے وہ بھی خالی گزر گیا تو کیا کرو گے، کسٹمر تو کہیں نظر نہیں آ رہا، تمہیں قسمت سے مل رہا ہے تو کیوں ٹھکرا رہے ہو؟"

وہ جل کر بولا "لالہ! ایسے کسٹمر سے کاٹیج خالی ہی رہے تو بہتر ہے"۔

میں نے کہا "گلزار ے! کسٹمر تو وہی ہے جسے تم نے پچھلے سال بڑے شوق سے کاٹیج دیا تھا مگر اب تمہاری سوچ دوسری ہے...... بڑی بے وقوفی کا کام کر رہے ہو تم۔ یہ بھی نہیں سوچتے ہو کہ پورے ایک گھرانے کا بوجھ تمہارے کندھوں پر ہے"۔

"کیا مطلب؟" وہ تنک کر بولا۔

"مطلب یہ کہ عشق سے خالی پیٹ نہیں بھرتا...... جس کا انتظار کر رہے ہو وہ نہیں آئی اور نہ ہی آئے گی۔ یہ لکھ لو میری طرف سے کاغذ پر"۔

اُس کا رنگ ایک دم پھیکا پڑ گیا۔ کچھ دیر خاموش رہا، پھر ذرا سنبھل کر بولا۔

"لالہ! تم بالکل غلط سمجھ رہے ہو۔ ایسی بات نہیں یہ لو چابی...... جس کو مرضی دے دو کاٹیج" وہ چابی میرے سامنے میز پر رکھ کر تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔

اُسی ہفتے وہ بیمار پڑ گیا۔ پہلے سر میں درد ہوا پھر تیز بخار چڑھ گیا۔ پانچ چھ روز اُس نے ڈاکٹر کی دوائی کھائی پھر کاٹیج کا کام اپنے دوست جماعت علی کے سپرد کر کے گاؤں چلا گیا۔ گاؤں سے اُس کی واپسی کوئی ایک ماہ بعد ہوئی۔ میں نے اُسے دیکھا تو بہت حیران ہوا۔ وہ بے حد کمزور نظر آ رہا تھا۔ آنکھوں میں جیسے ایک مستقل آگ سی جل رہی تھی۔ اُس نے مجھے بتایا کہ وہ جہلم جا رہا تھا۔ وہاں اُس کا ایک چچا

زاد بھائی ویلڈنگ کا کام کرتا ہے۔ ابھی ادھر ڈلہوزی میں تو کوئی کام ہے نہیں وہ سوچ رہا ہے کہ وہاں جہلم میں چچازاد بھائی کے ساتھ دو تین ماہ لگا آئے۔

میں جانتا تھا بات کچھ اور ہے۔ پولیس والوں کا واسطہ رات دن جھوٹ بولنے والوں سے رہتا ہے۔ انہیں جھوٹ سچ کی پہچان عام آدمی سے زیادہ ہوتی ہے۔ مجھے شبہ تھا کہ جہلم کا صرف بہانہ ہے۔ گلزار داتا کی نگری لاہور جائے گا اور وہاں مسم صاحب کو تلاش کرے گا..... اور اگر جہلم گیا بھی تو بہت جلد وہاں سے بستر بوریا اٹھا کر لاہور پہنچ جائے گا۔ لاہور سے جہلم کا فاصلہ ہی کتنا ہے۔ زیادہ سے زیادہ سو میل۔ میں نے سوچا کہ گلزار کو روکنا چاہیے۔ وہ آگ سے کھیلنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس کا جلنا یقینی تھا کیونکہ حالات نے اُس کے لباس پر غریبی کا تیل چھڑک رکھا تھا۔ گلزار میری والدہ کو اچھا لگتا تھا اس لیے مجھے بھی اچھا لگتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ جسے ماں جی نے بیٹا کہہ کر پکارا ہے وہ اجنبی شہر میں رسوا ہو اور ایک فاحشہ کی خاطر اپنی عزت اور جان خطرے میں ڈالے۔ میں نے ارادہ کیا کہ آج رات اپنی نیند گلزار کی بہتری کے لیے قربان کروں، چھٹی کے بعد گلزار کے گاؤں پہنچوں اور اُس کے گھر والوں سے کہوں کہ وہ منگنی شگنی کو چھوڑیں اور سیدھے سبھاؤ دو بول پڑھوا کر گلزار کے پاؤں میں بیوی کی زنجیر ڈال دیں۔ یہ حقیقت ہے کہ شادی عشق کے بڑے بڑے ڈھیٹ بھوتوں کو بھی مار بھگاتی ہے۔ عاشق "شوہر" بن کر گرہستی کے ایسے چکروں میں الجھتا ہے کہ دھیرے دھیرے سب کچھ بھول جاتا ہے۔ خود میرے پیارے مخبر بلال شاہ کے ساتھ بھی اس سے ملتا جلتا واقعہ ہو چکا تھا۔ آغاز شباب میں وہ ایک لڑکی کے عشق میں گرفتار ہوا تھا۔ وہ بھیڑ بکریاں پالنے والے لوگ تھے۔ جب بلال شاہ کی شادی کسی اور جگہ ہونے لگی تھی تو اُس نے محبوبہ سے کہا تھا "پیاری! میری جان تو تمہارے پاس ہے میرا باپ مجھے نہیں میری لاش کو سہرا باندھ رہا ہے"۔ لاش نے سہرا باندھا تھا، اپنی شادی کے چاول کھائے تھے...... اور پھر اس لاش نے دس عدد بچے پیدا کیے تھے۔ اب یہ لاش سب کچھ بھول چکی تھی۔ وہ دودھ جلیبیاں کھاتی تھی۔ ادھرڑ کے بیچ کی تھی اور بالکل "زندہ انسانوں" کی طرح لمبے لمبے ڈکار لیتی تھی۔

رات آٹھ بجے کے قریب جب میں اپنی سرکاری جیپ میں گلزار کے گاؤں "جاہو" جانے کی تیاری کر رہا تھا جماعت خاں میرے پاس آیا اور اُس نے بتایا کہ گلزار جہلم جانے کے لیے آج تین بجے ڈلہوزی سے روانہ ہو گیا ہے اور میں سر پکڑ کر رہ گیا۔

دو ہفتے بعد میں نے جہلم کے ایڈریس پر گلزار کا پتہ کرایا۔ میرے ہیڈ کانسٹیبل کو گلزار کے چچازاد بھائی نے بتایا کہ گلزار اُس کے پاس آیا تھا۔ پانچ چھ روز اُس نے کام کیا۔ بیماری سے اٹھا تھا، ابھی کمزوری باقی تھی اُسے پھر بخار چڑھنے لگا۔ کہنے لگا کہ لاہور جا کر بڑے ہسپتال میں دکھاؤں گا بس میں بیٹھا اور لاہور چلا گیا۔ ابھی تک واپس نہیں آیا۔

یہ اطلاع میری توقع کے عین مطابق تھی۔ مجھے گلزار کی بیماری کا پتہ تھا اور اُس "بڑے ہسپتال" کا بھی جہاں اُس نے جانا تھا۔ وہ یقیناً جبین عرف جینی کی تلاش میں تھا۔ وہ کوئی بچہ ہوتا تو میں اسے ڈانٹ ڈپٹ کر سمجھا لیتا۔ وہ عاقل بالغ اور اپنے اچھے بُرے کا ذمے دار تھا۔ میں اُسے کہاں تک رسی ڈال کر رکھتا اور پھر میری اپنی مصروفیات بھی تھیں۔ تھانیدار کو تو بعض اوقات آٹھوں پہر ڈیوٹی پر رہنا پڑتا ہے۔ میرے لیے بھی اُس تھانے میں سو طرح کے بکھیڑے تھے۔ ہر تیسرے چوتھے روز کوئی نہ کوئی سنگین واردات ہو جاتی تھی۔ مارچ کے آخر میں

ست دھاوا کے نزدیک ڈکیتی کی ایک بڑی واردات ہوئی اور میں اُس میں ایسا اُلجھا کہ دو تین ہفتے اردگرد کی خبر نہ رہی۔ پٹھانکوٹ اور چمبا میں تفتیش کرنے کے بعد ایک روز میں ڈلہوزی واپس آیا تو میرے اے ایس آئی نے کئی دوسری اطلاعات کے ساتھ ساتھ گلزار کے بارے میں بھی اطلاع دی۔ اُس نے بتایا کہ گلزار کی ماں گاؤں سے آئی ہوئی ہے اور میرے ہی کوارٹر میں قیام پذیر ہے۔ وہ گلزار کے بارے میں بہت پریشان تھی اور چاہتی تھی کہ لاہور میں گلزار کا پتہ کرایا جائے۔ میرے اے ایس آئی نے مجھ سے پوچھے بغیر ہی دو ہیڈ کانسٹیبل روانہ کر دیے تھے تاکہ وہ گلزار کا اتہ پتہ معلوم کریں۔

اے ایس آئی اس کے سوا اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ بہرحال میں گھر پہنچا۔ گلزار کی ماں کے ساتھ اُس کی بڑی بیٹی بھی آئی تھی۔ دونوں زاروقطار رو رہی تھیں۔ گلزار نے ڈلہوزی سے جانے کے بعد کوئی پیسہ نہیں بھیجا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا تھا کہ گھر میں فاقے چل رہے تھے۔ یہ فاقے بھی برداشت کیے جاسکتے تھے مگر یہ تو پتہ چلتا کہ گلزار ہے کہاں۔ جہلم سے گلزار کے چچازاد نے جو خط لکھا اُس میں یہی بتایا تھا کہ وہ چند روز اُس کے پاس ٹھہرنے کے بعد لاہور چلا گیا ہے۔ میں نے ماں بیٹی کو ہر طرح تسلی دی اور انہیں خود واپس گاؤں چھوڑ کر آیا۔ میں نے انہیں کہا جیسے ہی گلزار کا اتہ پتہ معلوم ہوتا ہے میں انہیں خود بتاؤں گا۔ واپس آتے ہوئے میں نے گلزار کے بھائی کی جیب میں چپکے سے چند روز کا خرچہ ڈال دیا۔

لاہور گئے ہوئے کانسٹیبل پورے ایک ہفتے بعد واپس آئے۔ یہ بڑے ہوشیار کانسٹیبل تھے اور سادہ کپڑوں میں سن گن لینے کا انہیں وسیع تجربہ تھا۔ ان میں سے ایک کانسٹیبل نے ”شاہی“ والے کیس میں بڑی مدد کی تھی۔ ان کانسٹیبلوں نے گلزار کے متعلق جو اطلاع دی وہ ہرگز تسلی بخش نہیں تھی۔ انہوں نے بتایا کہ پچھلے مہینے گلزار نہ صرف لاہور پہنچا تھا بلکہ میم صاحبہ سے ملنے اُس کی رہائش گاہ تک بھی گیا تھا۔ یہ وسیع و عریض رہائش گاہ ماڈل ٹاؤن کے ایک شاندار علاقے میں تھی اور اس علاقے سے ایرا غیرہ شخص قدم بھی نہیں رکھ سکتا تھا۔ میرے کانسٹیبلوں کی حاصل کردہ معلومات کے مطابق میم صاحبہ کے والد گرامی کا نام الفریڈ تھا۔ الفریڈ پکی عمر کا ایک بہت لمبا چوڑا انگریز تھا۔ وہ کئی گز لمبی کار میں گھومتا تھا اور اُس کی کار میں ہر وقت ایک نہایت خوفناک صورت کا براؤن کتا موجود رہتا تھا۔ الفریڈ کی رہائش گاہ کے نزدیک ہی ایک کوٹھی میں کوئی کرنل صاحب رہتے تھے۔ کرنل کوٹھی کا چوکیدار پولیس کا ریٹائرڈ ملازم تھا۔ میرے کانسٹیبلوں نے اسی ملازم سے رابطہ کر کے گلزار کے بارے میں سن گن لی تھی۔ کرنل کے چوکیدار نے بتایا تھا کہ پچھلے مہینے پندرہ سولہ تاریخ کو انگریز الفریڈ کی کوٹھی میں کوئی پارٹی تھی۔ گیٹ پر روشنیاں لگی تھیں اور پندرہ بیس گاڑیاں کھڑی تھیں۔ شام سے تھوڑی دیر پہلے شلوار قمیص والا ایک نوجوان گیٹ پر آیا اور چوکیدار سے باتیں کرنے لگا (اس نوجوان کا حلیہ گلزار سے ملتا جلتا تھا) اُس نے پہاڑی چپل پہن رکھی تھی اور سر پر چترالی طرز کی ٹوپی تھی۔ وہ کافی دیر مسٹر الفریڈ کے چوکیدار سے باتیں کرتا رہا۔ پھر ان باتوں نے بحث کی شکل اختیار کر لی۔ ایک دو اور ملازم بھی اکٹھے ہو گئے اور انہوں نے نوجوان کو دھکے دے کر گیٹ سے ہٹا دیا۔ اگلے روز کرنل کے چوکیدار نے اس پہاڑی نوجوان کو پھر کوٹھی کے گرد منڈلاتے دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اُس سے پوچھ گچھ کرتا مسٹر الفریڈ کی کوٹھی سے سرخ رنگ کی گاڑی نکلی...... نوجوان نے ہاتھ دے کر گاڑی کو روکا۔ اُس کی کھڑکی سے جھک کر کچھ دیر

باتیں کرتا رہا۔ اس کا انداز بڑا خوشامدی تھا۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی کا دروازہ کھل گیا اور نوجوان اُس میں بیٹھ کر چلا گیا۔ اس واقعے کے بعد کرنل کے چوکیدار نے اُسے پھر نہیں دیکھا..... کرنل کے چوکیدار نے جو کچھ بتایا تھا اُس کے مطابق سرخ رنگ کی وہ گاڑی ماڈل ٹاؤن کے سب سے امیر اور بااثر شخص لالہ ہرپرشاد کے اکلوتے بیٹے پرتھی پال کی تھی۔ چوکیدار کے مطابق پرتھی پال ایک بہت پڑھا لکھا اور فیشن ایبل نوجوان ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک بہت بڑا غنڈہ بھی ہے۔ درجنوں لوگوں کے ہاتھ پاؤں توڑ چکا ہے اور اُسے جاننے والے اُس کے نام سے کانپتے ہیں۔ یہ پرتھی پال مسٹر الفریڈ کی بیٹی جین کا منگیتر ہے اور اکثر مسٹر الفریڈ کے گھر آتا جاتا رہتا ہے۔ اُس کی گاڑی میں پہاڑی نوجوان کا بیٹھ کر چلے جانا خطرے کی نشانی ہے۔

دونوں کانسٹیبلوں نے اپنے طور پر بہت کوشش کی تھی کہ گلزار کا کوئی سراغ ملے لیکن پرتھی پال کی گاڑی میں بیٹھ کر چلے جانا اُس کا آخری سراغ ثابت ہوا تھا۔

کانسٹیبلوں کی دی ہوئی اطلاع کسی طور پر تسلی بخش نہیں تھی۔ حالات بالکل ویسا رُخ اختیار کر رہے تھے جیسا میں نے اندازہ لگایا تھا۔ گلزار میم کی سنہری زلفوں میں اُلجھ کر لاہور پہنچا تھا اور وہاں سے گم شدہ ہو گیا تھا۔ اِدھر ڈلہوزی میں اُس کے گھر والوں پر قیامت گزر رہی تھی۔ میں نے گلزار کی والدہ سے وعدہ کیا تھا کہ جلد گاؤں آ کر اُسے گلزار کی خیر خیریت سے آگاہ کروں گا اور ہو سکا ہے گلزار کو اپنے ساتھ ہی لے آؤں اب میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس منہ سے گاؤں جاؤں اور انہیں تسلی دوں۔ گلزار کو ڈلہوزی سے نکلے اب قریباً سات ہفتے ہو چکے تھے اور گزرنے والے ہر دن کے ساتھ اُس کی گمشدگی سنگین ہوتی جا رہی تھی۔

دو تین روز کے اندر میں نے تھانے میں اپنے ضروری کام نمٹائے اور کانسٹیبل احسان الٰہی کو لے کر ڈلہوزی سے عازم لاہور ہو گیا۔ ہم پٹھانکوٹ سے ٹرین میں پنڈی پہنچے اور وہاں سے بذریعہ بس ایک دشوار سفر کے بعد لاہور آ گئے۔ یہ اپریل کا مہینہ تھا۔ لاہور میں ابھی گرمی کا زور نہیں ہوا تھا لیکن ڈلہوزی کی ٹھنڈی ٹھار ہواؤں سے نکل کر آئے تھے لہٰذا ہمیں کافی گرمی محسوس ہو رہی تھی۔ لاہور پہنچتے ہی میں نے مقامی تھانے کا رُخ کیا۔ ایس ایچ او ناتھا سنگھ ایک مددگار شخص تھا۔ میرے دونوں کانسٹیبل پہلے ہی اُس سے مل چکے تھے لہٰذا اس کیس کی الف ب اُسے معلوم تھی۔ وہ مجھے کچھ ڈرا ڈرا نظر آیا۔ اس ڈر کی وجہ کوئی ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ میں جس معاملے کی چھان بین کے لیے یہاں آیا تھا اُس میں مسٹر الفریڈ اور لالہ ہرپرشاد جیسے لوگوں کا نام آرہا تھا۔ اگر خدانخواستہ یہ معاملہ بگڑ جاتا تو ناتھا سنگھ کے لیے تو قیامت ہی آ جاتی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ کوئی بھی کارروائی کرنے سے پہلے ناتھا سنگھ کو سب کچھ بتا کر پوری طرح اعتماد میں لے لوں۔

میں نے اُسے گلزار اور جین (میم صاحب) کی پوری سٹوری سنائی۔ جب میں نے ناتھا کو بتایا کہ مسٹر الفریڈ کی یہ خوبصورت بیٹی گھر سے دور جا کر کیا گل کھلاتی رہی ہے تو وہ بھی ششدر رہ گیا...... ناجائز تعلقات اور وہ بھی بالکل معمولی قسم کے لوگوں سے...... حیرت کی بات تھی۔ جین جیسی لڑکیاں تو جس پھل کی طرف ہاتھ بڑھائیں وہ شاخ سمیت جھک آتا ہے۔ اعلیٰ خاندان کے حسین و جمیل نوجوان جین جیسی لڑکی سے دوستی کے خواہشمند ہو سکتے تھے۔ پھر وہ کیوں راج مزدوروں، ڈرائیوروں اور چوکیداروں پر نگاہ کر رہی تھی...... ناتھا سنگھ میری بات سن کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ کہنے لگا۔

"نواز خان! میری سمجھ میں ایک ہی بات آتی ہے۔ یہ جو گوری ہے ناں پنچھی (ڈاٹی) پیدا ہوئی

ہے۔ تھوڑا بہت میں بھی جانتا ہوں اسے۔ اس میں کوئی کل سیدھی ہے ہی نہیں۔ بس دوسروں کو حیران کرنا چاہتی ہے۔ چاہے اس کے لیے سارے کپڑے اُتار کر بھرے بازار میں کھڑا ہونا پڑے۔ یہ پچھلی دیوالی کی بات ہے۔ وہ اور اس کی سہیلی حرامجادی...... کیا نام ہے اُسکا...... ہاں پریما...... وہ دونوں اپنی دس گز لمبی کار میں بیٹھ کر پرانی انارکلی میں دہی بلّے کھانے پہنچ گئیں۔ اوپر سے لباس ایسا پہن رکھا تھا کہ چھ سال کا بچہ بھی دیکھے تو ایک دم اٹھارہ سال کا ہو جائے۔ وہاں تو بھئی مجمع لگ گیا تماش بینوں کا۔ ایک سے بڑھ کر ایک بھن کا دیر تھا۔ راہگیر بھی رُک رُک کر دیکھنے لگے۔ ٹریفک جام ہو گئی۔ میرا ایک سب انسپکٹر اُدھر سے گزر رہا تھا۔ اس نے اُن دونوں کو سمجھایا کہ وہ کیوں اپنا اور دوسروں کا تماشا بنا رہی ہیں۔ بازاروں میں اچھے برے ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ یہ نہ ہو کہ کوئی مصیبت پڑ جائے۔ اگر دہی بلّے کھانے کا اتنا ہی شوق ہے تو گھر جا کر کھا لیں...... بس اتنی سی بات پر حرامجادی آگ بگولا ہو گئیں۔ سب انسپکٹر کی بے عزتی کر ڈالی وہ تو بندہ سمجھدار تھا ہوا کا رُخ دیکھ کر پیچھے ہٹ گیا ورنہ ہو سکتا تھا تھپڑ شپڑ ہی پڑ جاتے بچارے کو۔"

انسپکٹر ناتھا سنگھ اور میں دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ناتھا سنگھ نے بڑی ہمدردی کے ساتھ مجھے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ معمولی لوگ نہیں ہیں اور اگر میں ان سے پوچھ گچھ کرنا ہی چاہتا ہوں تو اپنے آپ کو پوری طرح تیار کر لوں۔ ناتھا سنگھ کی بات میں وزن تھا میں نے اُسی روز ہیڈکوارٹر میں انگریز ایس ایس پی صاحب سے رابطہ قائم کیا اور انہیں تمام صورتحال بتائی۔ عام طور پر انگریز افسر اپنے کسی ہم وطن کے خلاف کسی مقامی کو کارروائی کی اجازت نہیں دیا کرتے تھے لیکن ایس ایس پی صاحب مجھے عرصے سے جانتے تھے اور کئی کیسوں میں میری مدد کر چکے تھے۔ انہوں نے میری بات تسلی سے سنی۔ "مسٹر الفریڈ اور لالہ ہرپرشاد دونوں شہر کے معزز لوگوں میں سے ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ قانون سے بالاتر کوئی نہیں۔ تم اگر ہرپرشاد کے بیٹے سے پوچھ گچھ کرنا چاہتے ہو تو ضرور کرو۔ ہاں...... یہ بات کہ وہ بہت مصروف شخص ہے۔ میں فون پر بات کر کے اُس سے وقت لے لوں گا پھر تمہیں بتاؤں گا۔"

مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ جہاں اتنے دن انتظار کیا تھا وہاں ایک آدھ دن مزید انتظار کرنے سے کیا فرق پڑتا تھا۔ تیسرے روز ایس ایس پی صاحب نے انسپکٹر ناتھا سنگھ کو فون کر کے بتایا کہ انسپکٹر نواز خان آج سہ پہر ٹھیک تین بجے پرتھی پال کے آفس واقع ڈیوس روڈ پہنچ جائے۔

میں ٹھیک تین بجے پرتھی پال کے دفتر پہنچ گیا۔ یہ دفتر ایک بہت بڑی عمارت میں تھا۔ عمارت کی پیشانی پر دھات کے بڑے خوبصورت الفاظ میں "وِنڈرکا ونٹس ڈیلرز" کے الفاظ آویزاں تھے۔ پرتھی پال نے ایک آراستہ پیراستہ دفتر میں مجھے ملاقات کا "اعزاز بخشا" وہ شکل وصورت سے ہی ایک بگڑا ہوا رئیس زادہ نظر آتا تھا۔ گلے میں سونے کی موٹی زنجیر، ہاتھوں میں ڈائمنڈ کی انگوٹھیاں۔ آنکھوں پر سنہری فریم کی عینک۔ وہ ایک وسیع میز کے پیچھے مجھے خشمگیں نظروں سے گھور رہا تھا۔ جیسے پوچھ رہا ہو۔ اچھا...... تو یہ تم ہو وہ دو ٹکے کے انسپکٹر جس نے مجھ سے پوچھ تاچھ کی جرأت کی ہے۔

"بیٹھو" اس نے اپنے بھاری بھرکم لہجے میں کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میں بیٹھ گیا۔ "کہو! میں کیا سیوا کر سکتا ہوں تمہاری" وہ اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا۔ اس کے انداز سے لگتا تھا جیسے مجرم میں ہوں اور وہ تھانیدار ہے۔

میں نے کہا" پرتھی پال صاحب! ڈلہوزی کا ایک نوجوان گلزار پچھلے ڈیڑھ ماہ سے لاپتہ ہے ہم اُس کی تلاش میں یہاں آئے ہوئے ہیں۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ یہ نوجوان مسز الفریڈ کی رہائش گاہ کے آس پاس دیکھا گیا تھا۔ میں اسی سلسلے میں آپ سے چند سوال کرنا چاہتا ہوں"۔

وہ طنزیہ لہجے میں بولا" میں آپ کے سوالوں کے جواب دینے کے لیے ہی تو یہاں بیٹھا ہوا ہوں۔ اب آپ منہ سے کچھ نکالیں گے تو مجھے پتہ چلے گا ناں کہ مجھے کیا جواب دینا ہے"۔

میں نے کہا" پچھلے مہینے سولہ تاریخ کو بروز جمعرات مسز الفریڈ کی رہائش گاہ پر ایک سالگرہ پارٹی تھی کیا آپ اس پارٹی میں شریک ہوئے تھے؟"

"بالکل ہوا تھا" پرتھی پال نے جواب دیا" ہوتا کیوں نہ وہ جینی کی سالگرہ تھی اور جینی میری ہونے والی لائف پارٹنر یعنی کیا کہتے ہیں بیوی ہے"۔

"آپ اس پارٹی میں کب تک رہے"۔

"شروع سے آخر تک"

"میں ٹائم پوچھنا چاہتا ہوں"۔

پرتھی پال مجھے گھورتے ہوئے بولا" بال کی کھال اُتارنا چاہتے ہو تو یہ کوئی اچھا شوق نہیں ہے"۔

"گستاخی معاف، میں شوق کے لیے نہیں قانونی ضرورت کے تحت پوچھ رہا ہوں"۔

وہ گہری سانس لے کر بولا" پارٹی قریباً ساری رات چلتی رہی تھی۔ صبح دم اکثر مہمان انیکسی میں ہی سو گئے تھے۔ میں بھی صبح دس گیارہ بجے اُٹھ کر آیا تھا"۔

میں نے پوچھا" کیا اس سے پہلے بھی ایسا ہوتا رہا ہے کہ آپ نے اپنی منگیتر کے گھر شب بسری کی ہو؟"

وہ تیکھے لہجے میں بولا" بالکل ہوتا رہا ہے نچلے لوگوں جیسی تنگ نظری ہمارے گھرانوں میں نہیں ہوتی۔ ہم اکٹھے گھومتے پھرتے ہیں۔ پارٹیوں میں جاتے ہیں اکثر پارٹیاں رات دیر تک چلتی رہتی ہیں اور شام کو گئے ہوئے مہمان صبح ہی واپس آتے ہیں"۔

میں نے کہا" پرتھی پال صاحب! آپ کے بیان سے ظاہر ہے کہ شام کے وقت آپ مسز الفریڈ کی کوٹھی میں تھے۔ چند گواہوں کے مطابق شام کے وقت کوٹھی کے گیٹ پر چھوٹا سا جھگڑا ہوا تھا۔ ایک اجنبی نوجوان کوٹھی میں جانا چاہتا تھا۔ چوکیداروں نے اُسے روکا تھا اور بحث تکرار کے بعد دھکے دے کر اُسے وہاں سے چلتا کیا تھا۔ آپ کو اس جھگڑے کے بارے میں پتہ ہے؟"

پرتھی پال بولا" تم نے ذکر کیا ہے تو مجھے یاد آیا ہے۔ شام کے وقت گیٹ پر کچھ ہلا گلا ہوا تھا۔ ایک خبطی سا پہاڑی لڑکا تھا۔ کپڑے بوسیدہ تھے اور داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ غالباً اُس نے کچھ نشہ وغیرہ بھی کر رکھا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ میں نے میم صاحبہ سے ملنا ہے۔ میم صاحبہ سے اُس کی مراد غالباً جینی ہی تھی۔ چوکیدار نے پوچھا میم صاحبہ سے تمہارا کیا واسطہ ہے۔ وہ بولا بس میں میم صاحبہ کا خادم ہوں اُن کا سیوک ہوں۔ انہوں نے میرا بنگلہ بک کر رکھا ہے۔ میں نے اُن سے پوچھنا ہے کہ وہ میرے بنگلے میں رہنے آئیں گی یا نہیں..... پتہ نہیں کیا واہی تباہی بک رہا تھا۔ چوکیدار پہلے تو اُسے سمجھاتے رہے، وہ باز نہیں آیا تو انہوں نے اس کی مرمت کر دی اور دھکے دے کر وہاں سے ہٹا دیا"۔

میں نے پوچھا" موقع پر موجود مہمانوں کا نوجوان کے بارے میں کیا خیال تھا؟"

وہ بولا" خیال کیا ہونا تھا۔ وہ اُسے ولی اللہ سمجھنے سے تو رہے۔ سب دیکھ رہے تھے کہ وہ پاگل سا نشے باز ہے"۔

میں نے پوچھا" اس نوجوان سے آپ کی دوسری ملاقات کب ہوئی"۔

وہ بولا" ابھی تک تو نہیں ہوئی اگر ہو گئی تو میں

سب سے پہلے تمہیں اطلاع دوں گا“۔

”لیکن کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ نوجوان پارٹی سے اگلے روز دس بجے کے قریب آپ کی گاڑی میں بیٹھ کر آپ کے ساتھ گیا تھا“۔

وہ سگریٹ کا کش لے کر بولا” جن لوگوں کا یہ خیال ہے انہیں چار نمبر بس پر بٹھا کر پاگل خانے پہنچادو...... یا پھر انہیں باؤلے کتے نے کاٹا ہوگا اُن کا علاج شلاج کراؤ......“۔

پرتھی پال کا لہجہ بڑا تند و تیز تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اگر میں نے اُسے مزید کریدنے کی کوشش کی تو وہ بھڑک جائے گا۔ میں نے موضوع بدل دیا اور تھوڑی دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے اُس کے پاس سے اُٹھ آیا۔

پرتھی پال سے ملاقات کے بعد میں نے ضروری سمجھا کہ اُس چوکیدار سے ملاقات کی جائے جس نے ایک مہینہ پہلے گلزار کو پرتھی پال کی سرخ کار میں سوار ہوتے دیکھا تھا۔ اس چوکیدار سے ملاقات کرنل کی کوٹھی میں ہی ہو سکتی تھی۔ شام کو میں سادہ لباس میں کرنل کی کوٹھی جا پہنچا۔ چوکیدا کا نام محمد حسین تھا اور وہ پنجاب پولیس میں حوالدار رہ چکا تھا۔ مہندی رنگے بالوں والا یہ ادھیڑ عمر شخص مجھے بڑے تپاک سے ملا۔ میرے کانسٹیبلوں سے اُسے میرے بارے میں سب کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ کرنل کی کوٹھی کے گیٹ پر لکڑی کا بنا ہوا ایک سبز رنگ کا کیبن تھا۔ اس کیبن میں دو کرسیاں اور ایک چارپائی پڑی تھی۔ ایک تھری ناٹ تھری رائفل۔ گولیوں والی ایک بیلٹ ایک ٹارچ، چائے کے برتن اور چابیوں کا ایک بڑا گچھا۔ یہ اس کیبن کی کل کائنات تھی۔ میں محمد حسین کے ساتھ چارپائی پر جا بیٹھا۔ کوٹھی میں مکمل تاریکی تھی۔ معلوم ہوا کہ کرنل صاحب بمعہ اہل و عیال کہیں گئے ہوئے ہیں...... کیبن کی ایک کھڑکی سے تارکول کی صاف ستھری سڑک نظر آتی تھی۔ اس سڑک کی دوسری جانب کوئی سو گز کے فاصلے پر مسز الفرید کی کوٹھی کا جہازی سائز گیٹ تھا۔ چوکیدار محمد حسین نے مجھے تفصیل سے بتایا کہ وہ کہاں تھا۔ شلوار قمیص والا پہاڑی نوجوان کہاں گھوم رہا تھا اور پرتھی پال نے کس جگہ گاڑی روک کر نوجوان کو گاڑی میں سوار کرایا تھا۔

میں نے چوکیدار محمد حسین سے کہا” تم جو کچھ بتا رہے ہو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ 17 مارچ کی صبح پرتھی پال نے گلزار کو کسی بُرے ارادے کے ساتھ اپنی گاڑی میں بٹھایا اور کہیں لے کر چلا گیا۔ اب دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں۔ وہ اُسے قتل کر چکا ہے یا پھر کسی محفوظ جگہ پر حبس بیجا میں رکھا ہوا ہے۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایسی محفوظ جگہ کون سی ہو سکتی ہے“۔

محمد حسین نے کہا” جناب! اس بارے میں میں نے بھی سوچ بچار کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو کالا شاہ کاکو والی فیکٹری سے پتہ کرنا چاہیے......“۔

میں کالا شاہ کاکو کی فیکٹری کا ذکر پہلی بار سن رہا تھا۔ میں نے پوچھا” یہ کس کی فیکٹری ہے؟“

محمد حسین نے بتایا” جناب! میرے علم کے مطابق اس فیکٹری کی زمین پرتھی پال صاحب کو اپنی منگنی کے تحفے میں ملی ہے۔ اب اس زمین پر وہ اپنے خرچے سے فیکٹری بنوا رہے ہیں۔ بڑی لمبی چوڑی عمارت ہے۔ سیلاب کی وجہ سے فیکٹری میں پانی چلا گیا تھا۔ اس لیے پچھلے پانچ سات مہینے سے وہاں کام رُکا ہوا ہے۔ پرتھی پال صاحب وہاں اکثر آتے جاتے رہتے ہیں۔ سنا ہے وہاں رنگ رلیاں بھی ہوتی ہیں۔ پرتھی پال صاحب نے وہاں دو تین کمرے بنوا رکھے ہیں۔ جہاں اپنے دفتر کی ملازم لڑکیوں کو ”نوکری پکی کرنے“ کے لیے لے جاتے رہتے ہیں...... میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ اگر پرتھی پال صاحب نے اُس لڑکے کو کسی بُری نیت سے گاڑی میں بٹھایا تھا تو ضرور اُس فیکٹری میں لے گئے ہوں گے وہاں ایک تو کیا سو پچاس بندے بڑی آسانی

سے قید رکھے جا سکتے ہیں اور اگر کسی کو قتل کر کے مدعا غائب کرنا ہوا تو بھی وہ جگہ بڑی مناسب ہے۔

رات خنک اور پرسکون تھی۔ چودھویں تاریخ تھی اپریل کی اور چاند کی بھی غالباً چودھویں پندرھویں ہی تھی۔ زرد چاند گندم کے سنہری کھیتوں پر گر کر کچھ اور بھی زرد نظر آرہی تھی۔ میں نے اپنی جیپ فیکٹری کے بلند و بالا گیٹ سے کوئی ایک فرلانگ دور جنتر اور کیکر کے گھنے درختوں میں روک دی۔ میں سادہ لباس میں تھا۔ قمیص کے نیچے میں نے ہولسٹر باندھ رکھا تھا اور اس میں بھرا ہوا سرکاری ریوالور تھا۔ فیکٹری کا اندر باہر مکمل تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا صرف لوہے کے زنگ آلود گیٹ کے قریب کچھ روشنی نظر آرہی تھی۔ روشنی کی موجودگی میں اشارہ ملتا تھا کہ شاید فیکٹری میں چوکیدار موجود ہو لیکن یہ کوئی ضروری بھی نہیں تھا۔ میں گیٹ کے قریب سے گزرا اور درختوں میں ٹہلتا ہوا چار دیواری کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ جونہی میں فیکٹری کے پچھواڑے پہنچا مجھے ٹھٹھک کر رک جانا پڑا۔ فیکٹری کی دیوار کے ساتھ ہی مزدوروں کی چند جھونپڑیاں نظر آرہی تھیں۔ ایک شخص لپک کر میرے سامنے آیا اور بڑے ادب سے جھک کر سلام کی۔ وہ ایک ادھیڑ عمر شخص تھا جسم پر فقط ایک لنگوٹی تھی اور چاندنی میں کپکپاہٹ نمایاں نظر آرہی تھی۔ وہ ہاتھ جوڑ کر بولا "معاف کرنا صاحب! اس کا بچہ بیمار تھا وہ آنہ سکی۔ آج آپ نہ آتے تو میں ابھی خود چھوڑ کر آتا اُسے۔ معاف کر دیں صاحب۔ وہ بالکل تیار ہے میں ایک سیکنڈ میں حاضر کرتا ہوں اُسے......"

پھر وہ تیزی سے مڑا اور جھونپڑے کی طرف منہ کر کے دبی آواز میں بولا "او راجی...... او راجی...... چل آجا باہر۔ بابو صاحب آگئے ہیں......"۔

میں حیرت سے گم یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ دو سیکنڈ بعد جھونپڑے کا پردہ ہلا اور ایک دبلا سا نکل کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔ وہ چوبیس پچیس سال کی ایک عورت نما لڑکی تھی۔ رنگ گندمی، آنکھیں بڑی بڑی اور جسم نازک لیکن فاقہ زدہ۔ مدقوق بوڑھا مجھے اور لڑکی کو آمنے سامنے چھوڑ کر گستاخانہ انداز میں جھونپڑے کے اندر غائب ہو گیا۔ میں چند سیکنڈز مبہوت کھڑا رہا۔ پھر تیزی سے فیصلہ کیا اور ایک طرف چل دیا۔ لڑکی پائل اور چوڑیاں چھنکاتی میرے ساتھ آئی۔ کیسی سادگی تھی قربان ہونے کو دل چاہ رہا تھا۔ نہ پتہ پوچھا نہ آنے کی وجہ، نہ کوئی سوال کیا اور لڑکی میرے ساتھ روانہ کر دی...... چینی مفکر کنفیوشس کہتا ہے کہ معدہ خالی ہو تو عقل دماغ سے نکل کر معدے میں اتر جاتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ بھوکا شخص روٹی سے آگے کی نہیں سوچتا۔ اس بھوکے ننگے شخص کو بھی شاید صرف روٹی نظر آرہی تھی جو اسے اپنی بہو بیٹی کی عزت کے بدلے میں ملتی تھی۔ میں لڑکی کو درختوں میں چلاتا ہوا جیپ کی طرف لے آیا۔ جیپ دیکھ کر وہ ایک دم حیران بلکہ خوفزدہ نظر آنے لگی۔ اس کے ہونٹوں سے ڈری سہمی آواز نکلی "بابو صاحب! کہاں جانا ہے؟"

"تھانے میں" میں نے تسلی سے جواب دیا۔

لڑکی کا زرد چہرہ ایک دم تاریک نظر آنے لگا مجھے محسوس ہوا کہ وہ ایک دم بھاگ اٹھے گی۔ میں نے لپک کر اس کا بازو پکڑ لیا۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ روہانسی آواز میں بولی "میرا اس میں کوئی قصور نہیں ہے تھانیدار جی۔ میرے گھر والے کا باپ جو کہتا ہے میں وہ کرتی ہوں۔ میرا گھر والا ہسپتال میں ہے جی۔ اس کی گردن میں جہرباد کا پھوڑا ہے۔ ہمارے پاس کھانے کو کچھ نہیں ہے، خالی پیٹ ہم کسی سے ٹکر کا ہے کو لے سکتے ہیں۔ وہ بابو لوگ بڑے جور والے ہیں ہم ان کا کہنا نہ مانیں گے تو کیا کر لیں گے۔ عزت تو پھر بھی جانے گی ہی، جو چند روپے پیٹ کا دوزخ بجھانے کو ملتے ہیں وہ بھی نہیں ملیں گے" وہ چہرہ ہاتھوں

میں چھپا کر زار و قطار رونے لگی۔

میں نے اُسے پوچھا "کون ہیں وہ بابو لوگ؟"

وہ روتے روتے بولی "اس کارخانے کے مالک وہ بڑی بڑی گاڑیوں میں یہاں آتے ہیں"۔

صورت حال کافی حد تک میری سمجھ میں آرہی تھی۔ میں نے لرزتی کانپتی لڑکی کے شانے پر ہاتھ رکھا اور بڑی نرمی کے ساتھ اُسے گاڑی کے اندر لے آیا۔ میں نے اُسے سمجھایا کہ بابو اور اُس کے ساتھیوں پر زبردست چھاپہ پڑنے والا ہے۔ اگر وہ تھانے کچہری کے چکروں سے بچنا چاہتی ہے تو ہر بات صاف صاف بتادے...... میری یہ بات دُبلی پتلی لڑکی کی سمجھ میں آگئی۔ وہ پہلے تو ہچکچائی رہی پھر اُس نے ہمت کرکے سب کچھ میرے گوش گزار کردیا۔ اُس کا نام حسنہ تھا اور کوئی ایک برس پہلے اُس کی شادی ہوئی تھی۔ اُس نے جو کچھ بتایا وہ مختصراً اس طرح ہے۔

فیکٹری میں سیلاب آنے سے پہلے بابو پرتھی پال اور اس کے یار دوست ہر ہفتے اس جگہ محفل جماتے تھے۔ شراب اور جوا وغیرہ تو اس محفل میں ہمیشہ چلتا تھا کبھی کبھی کوئی لڑکی بھی بلالی جاتی تھی۔ ایک مرتبہ انھیں کوئی لڑکی نہ ملی تو حسنہ کو زبردستی اٹھا کر اپنی محفل میں لے گئے۔ شیر کے سامنے کون احتجاج کرسکتا ہے۔ یہ بھوکے ننگے مزدور بھی لہو کے گھونٹ پی کر چپ ہو رہے۔ حسنہ اس جھونپڑا بستی کی سب سے خوبصورت لڑکی تھی۔ وہ ایک بار فیکٹری میں گئی تو پھر اکثر جانے لگی۔ پہلے وہ روتی منہ بسورتی جاتی تھی لیکن جب نوٹ وغیرہ ملنے لگے تو اپنی مرضی سے جانے لگی۔ بلکہ ایک موقع ایسا آیا کہ بستی کی دوسری لڑکیاں اُس پر رشک کرنے لگیں۔ انہی دنوں فیکٹری میں سیلاب کا پانی گھس گیا اور کئی مہینوں کے لیے یہ مستیاں دم توڑ گئیں...... اب مہینے ڈیڑھ مہینے سے یہ سلسلہ پھر شروع ہوگیا تھا۔ کل بھی فیکٹری میں محفل جمی ہوئی تھی۔

بڑے بابو صاحب نے چوکیدار کے ہاتھ پیغام بھیجا تھا کہ حسنہ فیکٹری میں آجائے۔ اُسے تخت بخار تھا اور پھر بارش بھی شروع ہوگئی تھی۔ وہ نہ جاسکی۔ آج وہ اور اُس کا شوہر خوف سے کانپ رہے تھے، اتنے میں میں وہاں پہنچ گیا۔ حسنہ کا شوہر مجھے اندھیرے میں دیکھ کر یہی سمجھا کہ بڑے بابو صاحب نے اپنے کسی ساتھی کو بھیجا ہے۔ اُن کے سوا یہاں اور آبھی کون سکتا تھا۔ اُس نے فوراً بیوی کو میرے ساتھ روانہ کردیا۔

میں نے حسنہ نامی ایک لڑکی سے اندر کی تمام معلومات حاصل کرلیں۔ اُس نے بتایا کہ آج کل فیکٹری میں صرف ایک چوکیدار ہے اور وہ بڑے گیٹ کے پاس لیٹا رہتا ہے یا کرسی پر بیٹھا رہتا ہے۔ بڑے بابو صاحب (پرتھی پال) کے ساتھ تین یا چار لڑکے ہوتے ہیں۔ اُن کے پاس کوئی اسلحہ وغیرہ نہیں ہوتا۔ ہاں بڑے بابو کی گاڑی میں ایک عجیب سا پستول پڑا رہتا ہے...... میں نے حسنہ کو پوری طرح اعتماد میں لے لیا تھا۔ میں نے اُسے بتایا کہ آج سے کوئی ایک مہینے پہلے پرتھی پال نے ڈلہوزی سے آتے ہوئے ایک لڑکے کو اغوا کیا ہے۔ ہم اُسی کو تلاش کررہے ہیں۔ کیا وہ اس سلسلے میں ہماری کوئی مدد کرسکتی ہے۔

وہ ڈری ہوئی آواز میں بولی "صاحب جی! اپنے بچے کی قسم مجھے اس بارے میں کچھ پتہ نہیں۔ پچھلے ایک ڈیڑھ مہینے میں میں صرف تین بار کارخانے میں گئی ہوں۔ مجھے تو وہاں بڑے بابو اور اُس کے یاروں کے سوا اور کوئی نظر نہیں آیا"۔

میں نے پوچھا کارخانے میں کوئی ایسی جگہ ہے جہاں کسی کو بند رکھا جاسکے اور کارخانے میں آنے جانے والے اُسے دیکھ بھی نہ سکیں؟

وہ بولی "ہاں جی! ضرور ہے ایسی جگہ...... اور......"

ایک دم وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہوگئی۔ مجھے اس کے

چہرے پر گہری سوچ اور تحیر کے آثار نظر آئے۔ صاف محسوس ہوتا تھا کہ اُسے کوئی بہت اہم بات یاد آئی ہے۔ پوچھنے لگی "صاحب جی! یہ جو آپ نے اغوا والی بات بتائی ہے یہ کب کی ہے.......؟"

میں نے کہا "پچھلے مہینے سترہ اٹھارہ تاریخ کی"۔

وہ بولی "مجھے انگریزی مہینے کا تو پتہ نہیں...... چاند کی وہ پندرہ تاریخ تھی، مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اُس رات بڑی دیر تک کارخانے کے اندر سے چیخوں کی آوازیں آتی رہی تھیں۔ آپ نے دیکھا ہی ہے ہمارے جھونپڑے کارخانے کی دیوار کے بالکل ساتھ ہیں اندر کی ساری آوازیں باہر آتی ہیں۔ ہمارا خیال ہے اُس رات بڑے بابو اندر کسی بندے کو مار رہے تھے۔ وہ زور زور سے روتا تھا اور ہائے ہائے کرتا تھا۔ بڑا ڈر لگتا تھا اُس کی آواز سن کر"۔

لڑکی کا بیان بڑا اہم تھا۔ میں نے حساب لگایا وہ چاند کی جو تاریخ بتا رہی تھی اُس کے مطابق عین سترہ مارچ کی رات آتی تھی۔ ایک طرح سے اب بات واضح ہوتی جارہی تھی۔ 16 تاریخ ہی کی شام مسٹر الفریڈ کی کوٹھی پر ہنگامہ ہوا تھا اور چوکیدار محمد حسین نے ہنگامہ کرنے والے نوجوان کا جو حلیہ بتایا وہ سو فیصد گلزار کا تھا۔ اگلے روز دس بجے یہی گلزار اپنے رقیب پرچھی پال کی سرخ گاڑی میں بیٹھ کر کسی نامعلوم مقام کی طرف چلا گیا۔ یہ سترہ تاریخ تھی۔ سترہ اور اٹھارہ تاریخ کی درمیانی شب کو پرچھی پال کی زیر تعمیر فیکٹری سے نامعلوم مظلوم کی آوازیں باہر تک سنی گئیں۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ یہ ابھی اندھیرے میں تھا۔ مجھے اسی اندھیرے کا پردہ چاک کرنا تھا۔

میں نے حسنہ نامی اس لڑکی کو حفاظت کی ضمانت دی اور پوری طرح اعتماد میں لینے کے بعد کہا کہ وہ آج رات کسی طرح فیکٹری کے اندر جانے میں میری مدد کرے۔ وہ بہت ڈری ہوئی تھی۔ پہلے تو اُس نے انکار کیا لیکن پھر یہ بات اُس کے دماغ میں آگئی کہ میری بات مان کر وہ پولیس کی مدد کرے گی اور بڑا بابو کتنا بھی زور آور ہے پولیس سے زور آور تو نہیں ہو سکتا۔

اُس نے بتایا کہ فیکٹری کے اندر شمالی دیوار کے ساتھ بڑے بابو نے ایک چھوٹا سا مکان بنا رکھا ہے۔ اس میں تین چار کمروں کے علاوہ کام کرنے کا دفتر، غسل خانہ اور باورچی خانہ وغیرہ بھی ہے۔ اس مکان کا ایک چھوٹا سا دروازہ فیکٹری سے باہر کھیتوں میں کھلتا ہے۔ حسنہ نے بتایا کہ اس دروازے میں اندر کی طرف اکثر تالا پڑا رہتا ہے لیکن کبھی کبھی تالا نہیں بھی ہوتا۔ وہ بولی "صاحب جی! اگر مجھے اُس طرف آنے کا موقع مل گیا اور دروازے پر تالا نہ ہوا تو میں اندر کی کنڈی گرادوں گی۔ آپ دروازہ دھکیل کر اندر چلے آنا"۔

......اور اُس کمزور سی لڑکی نے یہ مشکل کام کر دکھایا۔ اُس کے فیکٹری میں چلے جانے کے ایک گھنٹے بعد میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور فیکٹری کی بلند و بالا دیوار کے ساتھ چلتا ہوا شمالی رُخ پر اُس چھوٹے سے آہنی دروازے کے سامنے پہنچ گیا جو اپنے گیرواں رنگ کی وجہ سے دیوار کا ہی حصہ نظر آرہا تھا۔ قمیص تھپتھپا کر میں نے ریوالور کی موجودگی کا یقین کیا اور پھر بہ آہستگی دروازے کو دھکیلا۔ وہ بڑی روانی کے ساتھ بے آواز کھلتا چلا گیا۔ میں نے اندر قدم رکھا اور اس کے ساتھ ہی مجھے احساس ہوا کہ میں نرم قالین پر کھڑا ہوں اور جس کمرے میں کھڑا ہوں وہ ایک دفتر ہے۔ میں نے دفتر کے اندرونی دروازے کو دھکیلا اور اُسے کھول کر ایک برآمدے میں آگیا۔ اس برآمدے کے سامنے فیکٹری کا وسیع و عریض احاطہ نظر آرہا تھا۔ یہ قریباً چار پانچ ایکڑ جگہ تھی۔ ہر طرف تعمیر کا سامان بکھرا ہوا تھا۔ کچھ حصے تعمیر ہو چکے تھے، کچھ ادھورے تھے اور کچھ ابھی شروع ہی ہوئے تھے۔ برآمدے کے عین

سامنے مجھے تین گاڑیاں نظر آئیں۔ ایک بڑی جیپ تھی اور دو کاریں تھیں۔ ان میں سے ایک سرخ رنگ کی کار میں پرچی پال کے ڈیوس روڈ والے دفتر میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ یہ پرچی پال کی پسندیدہ کار تھی۔ میں کچھ دیر برآمدے میں کھڑا سن گن لیتا رہا۔ مکان کے کسی اندرونی کمرے سے ہنسنے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ یقیناً یہ پرچی پال اور اس کے دوست تھے۔ میں بڑی احتیاط سے چلتا ہوا ایک لمبوترے کمرے سے گزرا اور ایک ایسی کھڑکی کے سامنے پہنچ گیا جہاں سے روشنی چھن چھن کر باہر نکل رہی تھی۔ میں نے کھڑکی کی ایک درز سے کمرے میں جھانکا۔ یہ کمرہ خالی تھا۔ محفل ساتھ والے کمرے میں جمی ہوئی تھی۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس خالی کمرے میں حسنہ داخل ہوئی۔ ننگے پاؤں تھی۔ سر سے اوڑھنی غائب تھی۔ الماری کے پاس رک کر اس نے ایک بوتل سے چار گلاسوں میں وہسکی انڈیلنی شروع کی۔ روشنی میں میں نے اسے غور سے دیکھا۔ سانولی ہونے کے باوجود وہ خاصی پرکشش تھی اس کا جسم گداز تو نہیں تھا تاہم دبلے پن میں بھی ایک نزاکت تھی۔ یقیناً پرچی پال وغیرہ کے ہتھے چڑھنے سے پہلے وہ اس سے زیادہ پرکشش رہی ہوگی۔ میں نے کھڑکی سے نگاہیں ہٹا کر ایک دوسری کھڑکی میں جھانکا۔ یہاں تاریکی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ محتاط انداز میں میں نے سارا مکان دیکھ لیا مگر ڈرائنگ روم کے علاوہ اور کہیں زندگی کے آثار نظر نہیں آئے۔ مجھے گلزار کی تلاش تھی اور اگر وہ زندہ تھا تو عین ممکن تھا کہ اس وقت اس فیکٹری کی چاردیواری میں کہیں موجود ہو۔

مکان سے باہر نکل کر میں ایک خاموش سائے کی طرح فیکٹری کے طول و عرض میں گھومنا شروع کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ رہائشی مکان اور ایک زیر تعمیر گودام کے سوا مجھے فیکٹری میں کوئی ایسی جگہ نظر نہیں آئی جہاں کسی شخص کو چھپایا جاسکے اور وہ دونوں جگہیں خالی تھیں۔ میں گھومتا ہوا سرخ کار کی طرف آگیا۔ دفعتاً مجھے اندازہ ہوا کہ کار کا ایک دروازہ لاک نہیں ہے۔ میں نے مڑ کر دیکھا فیکٹری کا مین گیٹ قریباً دو سو فٹ کی دوری پر تھا۔ لازمی بات تھی کہ وہاں رائفل بردار چوکیدار موجود تھا مگر وہ مجھے نظر نہیں آرہا تھا میں نے آہستگی سے دروازہ کھولا اور گاڑی کے اندر گھس گیا۔ مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا کہ گاڑی کے ڈیش بورڈ میں وہ عجب سا پستول دیکھوں جس کا ذکر حسنہ نے کیا تھا۔ ڈیش بورڈ بغیر تالے کے تھا۔ میں نے اسے کھولا تو فلالین کے کپڑے میں لپٹا ہوا پستول مجھے نظر آگیا اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی پتہ چل گیا کہ حسنہ نے اسے عجب کیوں کہا تھا۔ اس پستول کے آگے کوئی آٹھ انچ لمبا سائلنسر لگا ہوا تھا۔ پستول اور سائلنسر دونوں امپورٹڈ تھے اور ان کی قیمت موجودہ حساب سے چودہ پندرہ ہزار سے کم نہیں تھی۔ میں ڈیش بورڈ بند کر کے گاڑی سے نکلنا ہی چاہتا تھا کہ ایک شے پر میری نگاہ پڑی اور میں ٹھٹک سا گیا۔ یہ ایک سیاہ ڈائری تھی جس کا ایک کونہ ڈیش بورڈ کے نچلے خانے سے جھانک رہا تھا۔ بوسیدہ سی جلد تھی میں نے چاند کی روشنی میں اس کی ورق گردانی کی تو انکشاف ہوا کہ یہ سچ مچ کی ڈائری ہے۔ یعنی ہر صفحے پر تاریخ وار روزمرہ کی مصروفیات لکھی ہوئی تھیں۔ تحریر انگریزی میں تھی اور کافی شکستہ تھی تاہم اچھی طرح روشنی میں پڑھی جاسکتی تھی۔ اس گاڑی میں اس سے قیمتی شے میرے لیے بھلا کیا ہوسکتی تھی۔ میں نے یہ ڈائری اپنے لباس میں رکھ لی اور گاڑی سے باہر نکل آیا......

تھوڑی ہی دیر بعد میں دوبارہ فیکٹری کے آفس میں کھڑا تھا۔ میں نے بیرونی دروازہ کھولا اور جس خاموشی سے آیا تھا اسی خاموشی سے باہر نکل آیا۔

ڈائری میرے سامنے میز پر پڑی تھی اور میں سر

پکڑے بیٹھا تھا۔ اس ڈائری نے میری تفتیش کو آگے بڑھانے کی بجائے فل سٹاپ لگا دیا تھا۔ میں نے اس ڈائری کو کئی جگہ سے پڑھا تھا خاص طور پر سترہ مارچ والا صفحہ میرے زیرِ مطالعہ رہا تھا۔ مارچ کی دوسری تاریخوں کی طرح اس تاریخ میں بھی پرتھی پال نے ایک معروف دن گزارا تھا۔ صبح دس بجے سے رات بارہ بجے تک معروفیات لکھی ہوئی تھیں۔ اس ڈائری میں پرتھی پال نے جو کچھ بھی لکھا تھا بڑی احتیاط سے لکھا تھا۔ کم از کم اس ڈائری کی وجہ سے اُس پر کوئی حرف نہیں آ سکتا تھا اور اُس کی سترہ تاریخ کی معروفیات تو ویسے بھی بالکل سیدھی سادی تھیں۔ اس نے لکھا تھا "رات پارٹی دیر سے ختم ہوئی تھی۔ اس لیے دیر سے سویا اور دیر سے اُٹھا۔ سر بہت بھاری تھا۔ سوچا گھر جا کر نہاتا ہوں لیکن باہر پورچ میں آیا تو پتہ چلا کہ گاڑی سونا لے کر گئی ہے۔ سونا ایسی ہی حرکتیں کیا کرتی ہے۔ یہ ساڑھے گیارہ کے قریب واپس آئی۔ میں اُس وقت تک نہا دھو کر ناشتہ کر چکا تھا۔ پھر بھی اپنے شیڈول سے آدھ گھنٹہ لیٹ تھا۔ پہلی کی بجائے دوسری فلائٹ سے چنڈی جانا پڑا۔ وہاں میٹنگ بھی کافی دیر تک چلی یوں رات گیارہ بجے سے پہلے واپسی نہ ہو سکی۔ کالا شاہ کاکو جانے کا تو اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ فلیٹیز میں ڈنر کیا، وہاں ڈاکٹر رائے سے ملاقات ہو گئی۔ اُن کی خوبصورت وائف بھی ساتھ تھی۔ ڈاکٹر رائے اپنے کینٹ والے پلاٹ کا ذکر لے بیٹھے۔ اُن کا خیال ہے...... اس سے آگے پلاٹ کے جھگڑے کا طویل ذکر تھا جس کا اس کہانی سے تعلق نہیں۔

یہ تحریر دیکھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ سترہ اور اٹھارہ مارچ کی درمیانی شب ایک بجے تک اور غالباً اس کے بعد بھی پرتھی پال فلیٹیز ہوٹل میں تھا...... اب سوچنے کی بات یہ تھی کہ اُس رات کالا شاہ کاکو کی فیکٹری میں ایک نامعلوم شخص پر تشدد کرنے والا کون تھا اور کیوں تشدد کر رہا تھا۔ میرا دھیان رہ رہ کر اس تحریر کی ابتدائی سطروں کی طرف جا رہا تھا اور مجھے احساس ہو رہا تھا کہ ان سطروں میں ایک اہم نقطہ چھپا ہوا ہے۔ پرتھی پال نے لکھا تھا کہ وہ پورچ میں پہنچا تو پتہ چلا کہ گاڑی کو سونا لے گئی ہے...... یہ کوئی دس بجے کا عمل تھا۔ اور یہی وقت تھا جب کرنل کے چوکیدار محمد حسین نے سرخ گاڑی کو گیٹ سے نکلتے اور آگے جا کر اُس میں گلزار کو سوار ہوتے ہوئے دیکھا۔ میں پرتھی پال کی سرخ گاڑی کو اچھی طرح دیکھ چکا تھا۔ اُس کی پچھلی کھڑکیوں اور ایک سکرین پر پردے پڑے ہوئے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ چوکیدار محمد حسین نے جب اپنے کیبن سے اس گاڑی کو دیکھا ہوگا تو اُسے ٹھیک سے پتہ نہیں چل سکا ہوگا کہ گاڑی کون چلا رہا ہے لیکن چونکہ پرتھی پال کی گاڑی تھی اور وہ اسی پر یہاں پہنچا تھا لہٰذا محمد حسین نے تصور کیا کہ گاڑی پرتھی پال چلا رہا تھا۔

اب اس ڈائری کی تحریر بتا رہی تھی کہ گاڑی پرتھی پال نہیں وہ سونا نامی لڑکی چلا رہی تھی۔ سونا نامی یہ لڑکی کون تھی اور پرتھی پال سے اُس کا کیا رشتہ تھا؟ اس بارے میں ڈائری کچھ نہیں بتاتی تھی۔ میں نے ڈائری کی اچھی طرح ورق گردانی کی۔ پچھلے ڈھائی مہینوں کی روداد میں تین چار جگہ اس سونا نام کی لڑکی کا ذکر آیا تھا لیکن اس "ذکر" سے لڑکی کے حدود اربعے پر کوئی روشنی نہیں پڑتی تھی۔

میں اپنی سوچوں میں گم بیٹھا تھا۔ یہ انسپکٹر ناتھا سنگھ ہی کا کمرہ تھا۔ وہ کسی تفتیش پر گیا ہوا تھا۔ اُس کا سنتری دروازے پر چوکس کھڑا تھا۔ دفعتاً مجھے محسوس ہوا کہ سنتری کسی عورت سے باتیں کر رہا ہے۔ چند لمحے بعد سنتری نے اندر آ کر کھٹاک سے سیلوٹ کیا اور مجھے اطلاع دی کہ ایک میم صاحب مجھ سے ملنا چاہتی ہیں۔ میم صاحبہ کا نام سن کر میری رگوں میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ دھیان سیدھا جبین عرف جینی کی طرف گیا۔ میرا اندازہ

درست نکلا۔ وہ جینی ہی تھی سنتری نے چق اٹھائی تو وہ جھک کر اندر آ گئی۔ میں اُسے پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ آج وہ پہلے سے زیادہ خوبصورت اور ماڈرن نظر آ رہی تھی۔ اس نے پتلون کے اوپر ایک تنگ سی بنیان پہن رکھی تھی۔ اس "بیچاری بنیان" سے مسم صاحبہ کا جوبن سنبھالے نہیں سنبھلتا تھا۔ حد یہ تھی کہ وہ اپنا گدھے کے سائز کا کتا بھی ساتھ ہی لیتی چلی آئی تھی۔ یہ بلڈاگ بڑی خونخوار نظروں سے اردگرد چیزوں کو گھور رہا تھا۔ ظاہر ہے میں اور سنتری بھی "ان چیزوں" میں شامل تھے۔

اچھی طرح اطمینان سے بیٹھنے کے بعد جینی نے گفتگو کا آغاز کیا۔ وہ ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں اردو بولتی تھی۔ کہنے لگی "انسپکٹر نواز خان! ہم نے تم کو ڈلہوزی میں دیکھا تھا۔ آج یہاں دیکھا تو بڑا خوشی ہوا۔ ہم کو مالوم ہوا ہے کہ تم گول زار (گلزار) کا انوسٹی گیشن کرنے کے لیے ادھر آیا۔ گاڈ جانتا ہے ہم کو اس کا لاپتہ ہونے کا بڑا دکھ ہے۔ وہ گڈ مین تھا۔ بڑا اچھا آدمی تھا۔ ہم کو مالوم ہوا کہ وہ ہم سے ملنے آیا ہے تو ہم خود اس کو اپنے پاس بلاتا لیکن وہ پال واچ مین سے جھگڑا کرتا رہا پھر مالوم نہیں کدھر چلا گیا۔

میں نے کہا "مس جینی! وہ گیا نہیں اسے لے جایا گیا ہے اور لے جانے والی کار آپ کے منگیتر محترم پرتھی پال صاحب کی ہے۔"

"یہ تم کو کس نے بتایا" اس نے ماتھے پر شکنیں ڈال کر پوچھا۔

میں نے چوکیدار محمد حسین کا نام ظاہر کیے بغیر جینی کو بتایا کہ سترہ مارچ کی صبح کوٹھی سے نکلنے والی سرخ کار کو گلزار نے ہاتھ دے کر روکا تھا اور کار چلانے والا اُسے اپنے ساتھ سوار کر کے لے گیا تھا اس کے بعد گلزار کا کچھ پتہ نہیں۔"

وہ بولی "سرخ کار تو پرتھی کا ہی ہے لیکن ہم کو یقین نہیں آ رہا کہ وہ ایسا کر سکتا۔ ہاں...... وہ کبھی نشے میں نہ ہو۔ نشے میں اُس کو کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ تم نے اس بارے میں اس سے بات کیا؟"

میں نے کہا "بات کی ہے لیکن وہ ایسا بھلا مانس کہاں ہے کہ آسانی سے بتا دے۔"

جینی کے چہرے پر اب سوچ کی گہری پرچھائیاں تھیں۔ وہ سیلانی لڑکی نظر نہیں آتی تھی جو راہ چلتے مردوں کو پکڑ کر "پرستان" کی سیر کرا دیتی تھی۔ وہ دبے لہجے میں بولی "انسپکٹر! ہم مانتا ہے کہ پرتھی ہمارا منگیتر ہے مگر ہم انصاف کا گلا کاٹنا نہیں مانگتا۔ ہم چاہتا ہے کہ جو بھی سچ ہے وہ سامنے آئے۔ ہم تم سے درخواست کرتا کہ تم اس کیس کو اچھی طرح دیکھو۔"

جینی کی باتوں سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ جیسے وہ خود بھی پرتھی کے متعلق شبے میں پڑی ہوئی ہے اور سمجھتی ہے کہ گلزار کے غائب ہونے میں پرتھی یا اس کے کسی ساتھی کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ کتنے گھٹیا کردار کے لوگ تھے یہ اور کتنے کمزور تھے ان کے رشتے۔ وہ ایک دوسرے کو دھوکہ دے رہے تھے اور ساتھ ساتھ اس خیال سے بھی ڈر رہے تھے کہ ان سے دھوکا ہو گا۔

جینی سے میری باتوں کے دوران ہی ٹیلیفون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے ریسیور اٹھایا تو دوسری جانب ایک جانی پہچانی آواز آئی۔ یہ پرتھی پال تھا وہ مجھے انسپکٹر ناتھا سنگھ سمجھ رہا تھا اور پوچھ رہا تھا کہ جینی ادھر پولیس سٹیشن تو نہیں آئی۔ جینی نے فوراً اندازہ لگا لیا کہ یہ پرتھی پال کا فون ہے اور وہ اس کے متعلق پوچھ رہا ہے۔ وہ اشاروں میں مجھے منع کرنے لگی کہ میں اُسے نہ بتاؤں میں نے پرتھی پال سے کہہ دیا کہ نہیں، یہاں کوئی نہیں آیا۔ پرتھی پال نے فون بند کر دیا۔

پرتھی پال سے گفتگو کر کے میرے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ چند لمحوں کے اندر اندر گلزار کی اُلجھی ہوئی گتھی سلجھ گئی تھی۔ دراصل اس گفتگو کے دوران پرتھی پال کے ہونٹوں سے ایک لفظ ادا ہوا تھا

جس نے اس کیس کے سارے انجر پنجر ڈھیلے کر کے مجرم کو چاروں شانے چت کر دیا تھا۔

میں نے اطمینان سے سگریٹ سلگایا اور جینی سے کہا" مس جینن! آپ اطمینان سے گھر جائیں میرا خیال ہے میں آج شام تک اس معمے کو حل کرلوں گا۔ بلکہ ہوسکتا ہے میں جب شام کو آپ کے پاس آؤں تو گلزار بھی برآمد ہو چکا ہو"۔

"اوگاڈ" وہ حیرانی سے بولی" اتنا جلدی؟...... یہ کیسے ہوسکتا ہے؟"

"ایسا ہی ہوگا" میں نے اُسے یقین دلایا پھر گھڑی دیکھتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا" ویری ساری...... مجھے ذرا جلدی نکلنا ہے" اس نے کتے کی زنجیر کھینچ کر اسے جلدی سے میرے راستے سے ہٹالیا۔ میں لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر صحن میں آ گیا۔ جینی بھی میرے پیچھے ہی پیچھے نکل آئی۔

شام آٹھ بجے میں مسز الفریڈ کی کوٹھی میں اُن کے شاہانہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔ یوں لگتا تھا وکٹوریہ دور کے کسی محل میں آ گیا ہوں۔ مسز الفریڈ خود گھر میں نہیں تھے۔ اُن کی شوخ و شنگ بیٹی بڑی ادا سے میرے سامنے بیٹھی تھی۔

"ہاں کیا رپورٹ ہے مسٹر انسپکٹر کچھ اتہ پتہ چلا؟"

"میں نے آپ سے جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کیا ہے"۔

"او مائی گاڈ" جینی نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا" کہاں ہے گول زار ہم اُس کے بارے میں بڑا وری تھا۔ بڑا بے قراری تھا ہم کو کہاں ہے گول زار کس نے اغوا کیا تھا اس کو"۔

میں نے سگریٹ کا کش لے کر اطمینان سے کہا

"تم نے مس جینن...... تم نے اغوا کیا تھا اُسے اور پھر کالا شاہ کاکو کی فیکٹری میں اُس پر تشدد کر کے ختم کر ڈالا اُسے"۔

وہ حیرت سے منہ پھاڑے میری طرف دیکھ رہی تھی" کک...... کیا کہتا ہے انسپکٹر...... تمہارا برین تو خراب نہیں ہو گیا"۔

"میرا دماغ خراب نہیں ہے مس جینن...... اور ابھی تمہارا دماغ بھی ٹھکانے پر آ جائے گا"۔ میں نے سب انسپکٹر کو آواز دی۔ وہ ڈرائنگ روم سے باہر بیٹھا تھا۔ اندر آ کر اُس نے سیلوٹ کیا۔ میں نے کہا "جاؤ...... گاڑی سے چوکیدار کو لے آؤ"۔

وہ میرے کہنے سے پہلے ہی چوکیدار کو اندر لا چکا تھا۔ دروازہ کھول کر اُس نے چوکیدار کو ڈرائنگ روم میں داخل کر دیا۔ یہ کالا شاہ کاکو والی فیکٹری کا چوکیدار تھا۔ اس کا نام کیکر سنگھ تھا۔ تھانے میں کیکر سنگھ کے سارے کس بل نکل چکے تھے۔ اُس کے نچلے ہونٹ سے خون رس رہا تھا اور پیشانی پر بڑا سا گومڑ پڑا ہوا تھا۔

میں نے کہا" ہاں کیکر سنگھ سترہ اور اٹھارہ تاریخ کی درمیانی شب رات نو بجے کیا ہوا تھا؟"

کیکر سنگھ گلوگیر آواز میں بولا" میم صاحبہ اپنی گاڑی میں ایک شخص کو لے کر آئی تھیں۔ ان کے ساتھ پریمالی بی بی بھی تھیں۔ میں اُس وقت نشے میں تھا۔ انہوں نے پہلے مجھے جھاڑیں پلائیں پھر پوچھا کہ پرتھی پال صاحب کہاں ہیں؟ میں نے کہا انہوں نے آنا تو تھا لیکن آئے نہیں، سنا ہے پنڈی گئے ہوئے ہیں۔ میم صاحب غصے میں بڑبڑانے لگیں۔ پھر انہوں نے گیٹ کھلوایا اور گاڑی اندر لے گئیں۔ میں گیٹ پر بیٹھا رہا اور وہ گاڑی میں ساتھ آنے والے بندے کو لے کر مکان میں چلی گئیں۔ میرے اوپر نشہ زور مار رہا تھا۔ چارپائی پر بیٹھے بیٹھے میں پھر سو گیا۔ گہری نیند میں مجھے کبھی کبھی چیخوں کی آوازیں آتی رہیں۔ ان آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ میم صاحب اُس شخص کی دھنائی کر رہی ہیں۔ ایسی مار پیٹ اس فیکٹری میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ کئی دفعہ ایسا ہوا تھا کہ پرتھی پال صاحب کسی بندے کو پکڑ کر یہاں

لے آئے اور اس کی خوب مرمت بنائی۔ اُن کا ایک پارٹی سے کاروباری جھگڑا چل رہا ہے اور اس جھگڑے میں کئی بار مار پیٹ تک نوبت آچکی ہے۔ میں نے سمجھا شاید یہ بھی کوئی ایسا ہی معاملہ ہے۔ چند نہیں کیا وقت تھا جب میم صاحبہ اور ان کی سہیلی گاڑی لے کر واپس چلی گئیں۔ جس شخص کو مارا پیٹا جا رہا تھا وہ مجھے گاڑی میں نظر نہیں آیا۔ ہوسکتا ہے وہ میم صاحب کے جانے سے پہلے ہی فیکٹری سے نکل گیا ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ پچھلی سیٹ پر لمبا پڑا ہوا اور مجھے نظر نہ آیا ہو"۔

اس بیان کے دوران جینی سکتے کی حالت میں بیٹھی رہی۔ اُس کا رنگ ہمیشہ سے زیادہ سفید نظر آرہا تھا۔ چند منٹ پہلے اُس کی آنکھوں میں ناچنے والی تمام تیزی طراری رخصت ہوچکی تھی...... میں نے کہا "مس جینی! اب تم سوچو گی کہ میں تم تک کیسے پہنچ گیا...... دراصل مجھے معلوم ہوا تھا کہ سترہ تاریخ کی صبح گلزار جس گاڑی میں بیٹھ کر گیا تھا وہ پرتھی پال کی ضرور تھی مگر اُسے پرتھی پال چلا نہیں رہا تھا۔ اُسے سونا نام کی کوئی لڑکی یا عورت چلا رہی تھی۔ اب مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ سونا نامی یہ لڑکی یا عورت کون ہے۔ اس سے پہلے کہ میں اس بارے میں معلومات حاصل کرتا تم تھانے پہنچ گئیں اور مجھ سے کیس کے بارے میں بات چیت کرنے لگیں۔ تمہیں یاد ہوگا صبح ہونے والی اس بات چیت کے دوران ہی پرتھی پال کا فون آیا تھا اور یہ فون سننے کے فوراً بعد میں نے تمہارے سامنے دعویٰ کیا تھا کہ شام تک میں یہ معمہ حل کرلوں گا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے "سونا" کا پتہ چل گیا تھا۔ سونا تمہارا ہی "نک نیم" ہے اور یہ "نک نیم" پرتھی پال نے رکھا ہوا ہے۔ وہ بے تکلفی سے تمہیں "سونا" کہتا اور لکھتا ہے۔ میرا خیال ہے اب پوری بات تمہاری سمجھ میں آگئی ہوگی"۔

جینی نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر ایک بہت گہری سانس لی اور بولی "تم جو کچھ کہہ رہا ہے اس کا قیمت تم کو بہت زیادہ ادا کرنا پڑے گا۔ واچ مین (چوکیدار) کے بیان سے یہ بات کیسے ثابت ہوتا ہے کہ ہم نے گلزار کو اغوا کیا یا مارا ہے"۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "اس میں اب شک شبے کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے مس جینی شبلد...... تمہیں پتہ چل چکا تھا کہ گلزار دو بار کوٹھی کے گیٹ پر آیا ہے اور اس نے تمہارا نام لے کر ہنگامہ کیا ہے۔ یہ صورت حال تمہارے لیے کسی طرح بھی خوشگوار نہیں تھی۔ اتفاقاً اگلے روز صبح دس بجے ہی تمہیں اپنے بے وقوف عاشق سے نمٹنے کا موقع مل گیا۔ تمہیں اپنی ایک دوست کو سی آف کرنے ہوائی اڈے پر جانا تھا۔ تم شرارت کے طور پر اپنے منگیتر پرتھی کی گاڑی لے گئیں۔ اس واقعے کا ذکر پرتھی نے اپنی ڈائری میں کیا ہے اور یہ ڈائری اس وقت بھی میرے پاس موجود ہے۔ تم گاڑی لے کر گیٹ سے باہر نکلیں تو گلزار نے آگے بڑھ کر تمہارا راستہ روک لیا اور تم سے باتیں کرنے لگا۔ وہ تمہارے عشق میں نیم دیوانہ ہو رہا تھا۔ اسے کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ کس پتھر سے سر پھوڑ رہا ہے۔ تم ایک ایسی عورت ہو جو مرد کے سینے پر اپنا حسین پاؤں رکھ کر گزر تی ہے اور پھر کبھی مڑ کر نہیں دیکھتی۔ بہرحال تمہیں گلزار کے والہانہ پن سے زبردست خطرہ محسوس ہوا۔ اُس کی بے وقوفی اور ہٹ دھری کی سزا دینے کے لیے تم نے اُسے گاڑی میں بٹھالیا اور اپنی سہیلی ریما کے فلیٹ میں لے گئیں۔ تم نے اُسے شام تک وہیں رکھا۔ شام کو ریما نے اور تم نے اُسے گاڑی میں بٹھایا اور کالا شاہ کاکو والی فیکٹری جا پہنچیں...... وہاں تم دونوں نے مل کر اُسے ظالمانہ تشدد کا نشانہ بنایا اور پھر مار کر زمین میں گاڑ دیا"۔

جینی نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھاما اور چیخ

پڑی "نہیں ...... نہیں ...... یو آر رانگ ...... یہ بالکل غلط ہے ہم نے ایسا کچھ نہیں کیا ...... کچھ بھی نہیں کیا، تم یہاں سے چلے جاؤ ...... آئی سے گیٹ آؤٹ ......"

اُس پر جیسے اچانک ہی ہسٹریا کا دورہ پڑ گیا تھا۔ چہرہ اپنے بازوؤں میں چھپا کر وہ ہچکیوں سے رونے لگی۔

میں نے کہا "مس جینی! تمہارے ماننے نہ ماننے سے اب کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم نے جرم کیا ہے اور یہ جرم عدالت میں ثابت ہو کر رہے گا ...... میں تمہیں اقبال جرم کا ایک موقع دے رہا ہوں۔ سارے معاملے پر ٹھنڈے دل سے غور کرو اور فیصلہ کرو کہ تمہیں اپنا جرم چھپانا چاہیے یا نہیں ...... خدا حافظ"۔ اس کے ساتھ ہی میں چوکیدار کیسر سنگھ کو لے کر ڈرائنگ روم سے باہر آ گیا۔

منظر تھانے کا تھا۔ میں انسپکٹر ناتھا سنگھ کے ساتھ اُسی کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ ناتھا سنگھ نے اپنی بھوری داڑھی کو کھجاتے ہوئے کہا "کیا واقعی مس جینی گلزار کو ٹھکانے لگا چکی ہے؟"

میں نے سگریٹ کا گہرا کش لیتے ہوئے کہا "یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ صرف ایک بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ سترہ مارچ کی صبح گلزار جس کے ساتھ گاڑی میں سوار ہو کر گیا تھا وہ مس جینی تھی۔ اب وہ اُسے کہاں لے گئی۔ اُس کا کیا کیا اور اب وہ کہاں ہے؟ یہ سب کچھ فی الحال تاریکی میں ہے"۔ ناتھا سنگھ بولا "لیکن تم نے تو بڑے دھڑلے کے ساتھ جینی پر قتل کا الزام لگا دیا ہے"۔

"صرف اُسے بھڑکانے کے لیے ...... تاکہ وہ سچ بول دے میں نے ......"۔

ابھی میری بات منہ میں ہی تھی کہ سنتری نے اندر آ کر کھٹاک سے سیلوٹ کیا اور اطلاع دی کہ میم صاحبہ مجھ سے ملنا چاہتی ہیں۔ چند لمحے بعد مس جینی اندر آئی۔ آج خوفناک صورت والا بلڈاگ کتا اس کے ساتھ نہیں تھا۔ وہ خود بھی بڑی خاموش اور آزردہ سی دکھائی دے رہی تھی۔ گردن جھکا کر میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ میں نے معنی خیز انداز میں ناتھا سنگھ کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ ناتھا سنگھ چلا گیا تو وہ گلوگیر آواز میں بولی "ہم تم سے اکیلے میں بات کرنا مانگتا"۔

میں نے کہا "تم جو کچھ کہنا چاہو، یہاں پوری تسلی سے کہہ سکتی ہو"۔

اُس نے اپنا خوبصورت رومال ناک پر رکھ کر سوں سوں کی آواز نکالی اور بولی "انسپکٹر! تم ٹھیک کہتا ہے کہ سترہ تاریخ کو گلزار ہمارے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر گیا تھا لیکن گاڈ جانتا ہے، ہم نے اُس کو کوئی تکلیف نہیں دیا۔ اُس کو انگلی تک نہیں لگایا وہ ...... وہ اس وقت زندہ سلامت ہمارے پاس موجود ہے ...... ہمارا مہمان ہے وہ"۔

گلزار کے زندہ ہونے کی اطلاع میرے لیے خوش کن تھی۔ اُس کی بوڑھی والدہ اور بہنوں کے چہرے میری نگاہوں میں گھوم گئے ...... اور یہ اُمید پیدا ہو گئی کہ میں ڈلہوزی واپس جا کر اُن کے سامنے سرخرو ہو سکوں گا۔ میں نے مس جینی سے پوچھا کہ وہ کہاں ہے؟ وہ بولی "پریما کے فلیٹ میں ہی ہے۔ پریما نے ایک کمرہ اس کو دے رکھا ہے اور وہاں وہ بڑے سکون سے رہ رہا ہے"۔

میں نے کہا "اگر میں تمہاری بات مان لوں تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ تم نے اُسے یوں منظر سے غائب کیوں کیا؟"

میرے اس سوال پر جینی کی حسین آنکھوں میں ایک دم آنسو اُمڈ آئے۔ وہ روتے ہوئے بولی "اس لیے کہ ہم اُس سے سچ سچ محبت کرنے لگا تھا ...... ہم بہت بُرا گرل ہے انسپکٹر ہم مرد کو کھلونا سمجھتا تھا۔ کسی اجنبی مرد کے ساتھ وقت گزارتا تھا۔ اسے سرپرائز

رہتا تھا اور حیران پریشان چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا تھا۔ پھر گاڈ نے ہمیں ہمارے کیے کا سزا دیا۔ ہمیں ایک ایسا مرد ملا جس نے اُلٹا ہم کو سرپرائز دیا اور ہمیں پریشان کر دیا...... وہ مرد گول زار (گلزار) ہے انسپکٹر۔ آج ہم تم کو سب کچھ سچ سچ بتائیں گا۔ گلزار ایک معمولی شخص تھا۔ مگر معلوم نہیں اُس میں کیا بات تھا ہم ایک بار اُسے مل کر پھر بھول نہ سکا۔ دن رات اُس کا خوبصورت فیس ہماری نگاہوں میں رہا۔ ڈلہوزی سے واپس آ کر ہم دن رات اُس سے ملنے کو ترستا رہا اور ساتھ ساتھ اپنے دل کو سمجھاتا رہا کہ وہ یہ نادانی نہ کرے...... ہم جانتا تھا کہ پرتھی پال جیسا کروڑ پتی شخص ہم سے شادی بنانا چاہتا ہے اور یہ شادی ضرور ہونی ہے...... پھر ہم کیوں ایک فولش لڑکی کی طرح سوچ رہا تھا۔ ہم اپنے دل کو سمجھانے کی بہت کوشش کرتا رہا اور اس میں بہت حد تک کامیاب بھی ہو گیا لیکن پھر ایک دن اچانک گلزار پھر ہمارے سامنے آن کھڑا ہوا۔ ہم کو معلوم ہوا کہ اس نے ہماری خاطر کوٹھی کے گیٹ پر جھگڑا کیا ہے اور چوکیدار مہابت خان نے اُسے بُری طرح مارا ہے اور ذلیل کر کے نکال دیا ہے۔ ہم کو فکر تھا کہ پرتھی پال کو معلوم ہوا تو وہ گلزار سے بہت بُری طرح پیش آئے گا اور یہ بھی کوئی بڑا بات نہیں کہ اُس کا دماغ ٹھکانے لگاتے لگاتے اُسے جان سے ہی مار ڈالے۔ وہ بہت ہی سخت آدمی ہے۔ ہمارا فکر مندی بڑھتا جا رہا تھا، پھر گاڈ نے ہمارا مدد کیا۔ ہم صبح ایئر پورٹ جانے کے لیے پرتھی پال کا گاڑی لے کر نکلا تو تھوڑا آگے جا کر گلزار نے ہمارا راستہ روک لیا۔ ہم نے اُسے اپنے ساتھ سوار کیا اور پریما کے فلیٹ پر لے گیا اور ہم نے اُسے فلیٹ پر ہی رکھا اور اب تک وہ وہیں ہے......"۔

مس جین کی روداد حیران کن تھی۔ وہ عجیب و غریب لڑکی تھی اور اُس نے عجیب و غریب کام کیا تھا۔ شاید وہ ٹھیک کہہ رہی تھی کہ قدرت نے اُسے سزا دی ہے اور وہ ایک ایسے شخص کی محبت میں گرفتار ہو گئی ہے جس سے محبت کرنے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

میں نے اُس سے پوچھا "اگر تمہاری یہ ساری باتیں درست ہیں تو پھر چوکیدار کیکر سنگھ کا بیان کس خانے میں فٹ ہوتا ہے؟ کیا تم اُس رات کسی شخص کے ساتھ فیکٹری میں نہیں گئی تھیں؟"

وہ بولی "ہاں...... ہم گیا تھا لیکن ہمارے ساتھ اُس وقت گلزار نہیں چوکیدار مہابت خاں تھا۔ وہی مہابت خاں جس نے ایک روز پہلے گلزار کو مارا پیٹا تھا اور ذلیل کیا تھا۔ یہ بڑا بدبخت چوکیدار ہے۔ اُس نے ڈلہوزی میں بھی ایک مزدور کو بہت مارا تھا اور اس کا کپڑا پھاڑ کر اس کو مرغا بنا دیا تھا۔ ہم کو اس بدبخت پر بہت غصہ تھا۔ ہم اور پریما اس کو گاڑی میں ڈال کر فیکٹری لے گیا۔ ہمارا ارادہ اُسے پرتھی پال کے حوالے کرنے کا تھا لیکن وہ فیکٹری میں نہیں تھا۔ ہم نے خود ہی مہابت خاں کا مرمت کیا اور جب اُس کا حالت بہت خراب ہو گیا تو اُسے ایک انڈر ویئر میں فیکٹری سے بھگا دیا...... ہم نے کسی کا مرڈر نہیں کیا انسپکٹر اور نہ ہی ایسا کر سکتا ہے"۔ وہ ایک بار پھر سسکنے لگی۔

مس جین کی نشاندہی پر گلزار کو پریما کے فلیٹ سے برآمد کر لیا گیا۔ وہ ہشاش بشاش اور صحت مند تھا۔ اس ڈیڑھ مہینے کے عرصے میں اُسے نہ صرف لباس پہننے کا سلیقہ آ گیا تھا بلکہ وہ اپنی گفتگو میں کہیں کہیں انگریزی کے لفظ بھی ٹھونک لیتا تھا۔ اُس نے تھانے میں آ کر اپنا طویل بیان قلمبند کرایا۔ اس میں واضح طور پر کہا کہ وہ کسی کی حبس بیجا میں نہیں تھا۔ اس نے علیحدگی میں مجھے جو باتیں بتائیں وہ خاصی اہم تھیں۔ اُس نے انکشاف کیا کہ میم صاحب اور ان کے

منگیتر پرتھی پال کے تعلقات کئی ماہ سے خراب تھے اور اب وہ مزید خراب ہو گئے ہیں۔ پرتھی پال کی نظر میم صاحب کی دولت و جائیداد پر ہے اور وہ ہر صورت یہ دونوں چیزیں حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اپنے اس لالچ میں کسی کی جان لے سکتا ہے اور اپنی جان دے بھی سکتا ہے۔ یہی خوف تھا جس کے سبب مس جین نے گلزار کو موقعے سے غائب کر دیا تھا اور بعد میں پرتھی پال سے جان چھڑانے کے لیے میری تفتیش کا رخ پرتھی کی طرف موڑنے کی کوشش کی تھی۔ میرے ساتھ اپنی بات چیت میں گلزار نے جو سب سے بڑا اور دھماکہ خیز انکشاف کیا وہ یہ تھا کہ مس جین اس سے شادی کرنا چاہتی ہے۔

میں فوری طور پر اس بات پر یقین نہیں کر سکا۔ کوئی ہوش مند بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کہاں ایکسٹرا ماڈرن جین اور کہاں دس جماعتیں پاس گلزار۔ کوئی جوڑ کوئی جواز ہی نہیں تھا لیکن ایک بات میں بھول رہا تھا اور ہم سب بھول رہے تھے یہ بات کسی عام لڑکی نے نہیں کہی تھی، مسٹر الفریڈ کی بیٹی نے کہی تھی۔ وہ بیٹی جس نے آج تک جو کام کیا تھا عجیب کیا تھا۔ شاید اس کی زندگی کا مقصد ہی دوسروں کو حیران اور ششدر کرنا تھا۔ وہ انوکھی تھی اور اُس کے ہر کام میں انوکھا پن تھا...... اور پھر ایک روز وہ اپنی زندگی کا سب سے انوکھا کام بھی کر گئی۔ وہ ''سبز پری'' جس کے لیے لکھ پتی نوجوانوں کے رشتے قطار باندھے کھڑے تھے۔ اس نے ڈلہوزی کے ایک مقامی نوجوان سے کورٹ میرج کی اور اُسی کالج میں جا کر آباد ہو گئی جہاں سے اُس کی انوکھی محبت کا آغاز ہوا تھا۔

میں اُسی کالج کے پچھواڑے میں رہتا تھا اور گلزار کی شادی کے بعد بھی قریباً ایک سال رہا لیکن شادی کے بعد میں نے مس جین کو کبھی نہیں دیکھا۔ وہ سات پردوں میں رہتی تھی۔ اُس نے ماضی سے ہر ناطہ توڑ لیا تھا۔ نہ کسی سے ملتی تھی نہ کوئی اُس سے ملنے آتا تھا۔ صرف مسٹر الفریڈ کی ''جوگر'' لمبی کار کبھی کبھی کالج کے دروازے پر کھڑی نظر آتی تھی۔ وہ بھی جس طرح خاموشی سے آتے تھے اسی طرح خاموشی سے چلے جاتے تھے۔ مس جین نے اپنا مذہب تبدیل نہیں کیا تھا لیکن مذہبی طور پر وہ بالکل بدل چکی تھی اور گلزار بتاتا تھا کہ اتوار کو اپنی عبادت کرنے کی بجائے وہ نماز پڑھتی ہے۔ گلزار اُس سے بہت خوش تھا اور اُسے پختہ یقین تھا کہ ایک روز وہ اپنی رضا و رغبت سے کلمہ بھی پڑھ لے گی۔

مجھے ڈر تھا کہ کہیں گلزار کی یہ خوشیاں عارضی ثابت نہ ہوں...... یہ نہ ہو کہ امیرزادی کی آنکھوں سے وقتی محبت کی پٹی ہٹے اور وہ چیخ مار کر اپنی دنیا میں لوٹ جائے۔ مگر میرے یہ تمام اندیشے اور اندازے اُلٹ ثابت ہوئے۔ گزرنے والے وقت کے ساتھ جین خود کو نئے ماحول میں ڈھالتی چلی گئی۔ پہلے وہ گلزار کے گھر والوں سے علیحدہ رہنا چاہتی تھی پھر اُس نے انہیں بھی ڈلہوزی میں بلوا لیا۔ گلزار نے بتایا کہ اُس نے مغربی لباس بالکل چھوڑ دیا ہے اور مقامی رواج کے کپڑے پہنتی ہے۔ پھر گلزار کا پہلا بچہ پیدا ہوا۔ اس کا نام جینی نے اپنی مرضی سے رحمان رکھا۔ یہ درحقیقت اسلام کی طرف اُس کا سفر تھا۔ آخر ایک ایک روز یہ سفر مکمل ہوا۔ شام کا وقت تھا...... گلزار بھاگتا ہوا تھانے میں داخل ہوا۔ اُس نے مجھے بے تکلفی سے بازوؤں میں بھینچ لیا اور لرزتی سرگوشی میں بولا ''لالہ...... لالہ جین مسلمان ہو گئی ہے''۔

بدلا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

سچ کہا ہے کسی نے کہ بُرا شخص جب دل کی گہرائی سے اچھا بنتا ہے اچھوں اچھوں کو پیچھے چھوڑ دیتا ہے۔

ہائی بلڈ پریشر سے بچاؤ کی تدابیر

حکیم راحت نسیم سوہدروی



ہائی بلڈ پریشر (بلند فشارخون) ایک عام مرض ہے۔ اندازہ ہے کہ ایک ہزار افراد میں سے 200 افراد اس کا شکار ہوتے ہیں۔ ہائی بلڈ پریشر کو چور مرض یا خفیہ دشمن بھی کہا جاتا ہے کیونکہ مرض کی موجودگی کے باوجود اکثر لوگ بے خبر رہتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ گاہے بگاہے اپنے بلڈ پریشر کا معائنہ کراتے رہیے اور بڑھنے کی صورت میں باقاعدہ علاج کیا جائے۔ دگرنہ یہ عارضہ حملہ قلب

(ہارٹ اٹیک)، دماغی فالج (اسٹروک) کا باعث بن سکتا ہے۔ دیکھا یہ گیا ہے کہ بلڈ پریشر بڑھنے کی صورت میں بمشکل نصف لوگ علاج کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ حالاں کہ اس کی تشخیص و علاج آسان ہے۔ بلڈ پریشر کی تشخیص ایک آلے کی مدد سے کی جاتی ہے۔ صرف ایک بار کی ریڈنگ کافی نہیں بلکہ کم از کم تین بار ریڈنگ کے بعد فیصلہ کرنا چاہیے۔

معمول کے مطابق درست بلڈ پریشر ایک بالغ فرد میں 120/80 اور 130/85 کے درمیان ہونا چاہیے۔ اگر ان حدود سے تجاوز کر جائے تو ہائی بلڈ پریشر کہلاتا ہے۔ جسے مناسب تدابیر' احتیاط اور پرہیز سے معمول پر لانا چاہیے تاکہ اس عارضہ سے پیدا ہونے کے عوامل سے محفوظ رہا جاسکے۔ ہائی بلڈ پریشر کی صورت میں سر چکراتا ہے۔ کنپٹی اور گردن کے پیچھے کی شریانیں تڑپتی محسوس ہوتی ہیں۔ چہرے کی رنگت سرخ' نبض تیز اور پسینے کی زیادتی ہوتی ہے۔ ان علامتوں کی صورت میں آلے کی مدد سے بلڈ پریشر کا معائنہ کرنے پر درست تشخیص ہو جاتی ہے۔

فشارِ خون (بلڈ پریشر) وہ طبعی دباؤ ہے جو تمام جسم کو خون ترسیل کرنے والی سرخ رگوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ دباؤ بہت ضروری ہے اور یہ دباؤ طاقت سے ہوتا ہے تاکہ خون کی رگوں میں باقاعدگی سے دوڑ سکے۔ اس باقاعدگی کی وجہ سے دل کے ذریعے خون جسم کے تمام اعضاء تک پہنچتا ہے۔ اس طرح تمام اعضاء اپنے افعال درست طور پر سرانجام دیتے ہیں۔ جب بلڈ پریشر کا معائنہ کیا جاتا ہے تو اوپر کا ہندسہ اس وقت کے دباؤ کو ظاہر کرتا ہے۔ جب قلب سکڑتا ہے اس کو انقباضی (سسٹولک پریشر) کہتے ہیں۔ جبکہ نیچے کا ہندسہ دھڑکنوں کے درمیان کا دباؤ (ڈائسٹولک دباؤ) کہلاتا ہے یعنی انبساطی دباؤ۔ بلڈ پریشر کام کی نوعیت سے بھی بدلتا رہتا ہے۔ اگر تبدیلی کے بغیر قائم رہے تو یہ مرض ہے۔ عمر کے مختلف حصوں میں بھی یہ دباؤ مختلف ہوتا ہے۔

جن لوگوں کے والدین کو یہ عارضہ ہو۔ ان میں اس کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ خون میں کولیسٹرول کا بڑھ جانا' مانع حمل ادویات کا استعمال' امراض گردہ' سنگ گردہ' موٹاپا اور ڈپریشن' ذیابیطس اور عارضہ رگ دل میں مبتلا لوگ زیادہ شکار ہوتے ہیں۔ نیز یہ ہر عمر کے لوگوں میں ہوسکتا ہے۔ اس

خواتین ڈرائیور

"کیا تمہیں ابھی تک یہی نہیں معلوم کہ خواتین ڈرائیوروں کے لئے ہمیشہ آدھی سڑک چھوڑ دینا چاہیے۔" "معلوم ہے! لیکن یہ علم نہیں کہ کس طرف کی آدھی سڑک وہ پسند کرتی ہیں۔"

"فائل"

محبوبہ کی مسلسل خاموشی سے بے قرار ہوکر عاشق نے اسے خط لکھا کہ اگر تمہارا رویہ آئندہ یہی رہتا ہے تو مہربانی سے میرے تمام خطوط واپس کردو۔ محبوبہ کی طرف سے جواب ملا۔ "آپ کی فائل مل ہی نہیں رہی۔ براہ کرم آئندہ خط لکھتے وقت حوالہ نمبر ضرور تحریر کیجئے۔"

فکر مند

"اگر تم کام چھوڑ کر جا رہی ہو تو میرے شوہر کے لئے کھانا کون پکائے گا؟ تم بھول گئیں کہ وہ تمہارے ہاتھ کے پکائے کھانے کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ پلیز مجھے مصیبت میں ڈال کر مت جاؤ، میں انہیں کیسے راضی رکھ سکوں گی۔" مالکن نے منت آمیز لہجے میں گھریلو خوبصورت ملازمہ سے کہا۔ "بیگم صاحبہ! آپ شوہر کی تو بالکل فکر نہ کریں کیونکہ وہ میرے ساتھ ہی جا رہے ہیں۔" نوکرانی نے مسکرا کر جواب دیا۔

(مرسلہ: نعمان سلیم۔ حیدرآباد)

کے علاوہ زیادہ نمک خوری، نشہ آور اشیاء کا استعمال بھی سبب بن سکتا ہے۔ خواتین میں حمل اور خصوصاً حمل کی آخری سہ ماہی میں ہوسکتا ہے۔ چنانچہ قیامِ حمل کے بعد بلڈ پریشر پر نظر رکھنی چاہیے۔ اگر زیادہ ہو تو ضروری تدابیر اختیار کی جائیں ورنہ ماں اور حمل (پیٹ کا بچہ) دونوں کو نقصان ہوسکتا ہے۔

بچاؤ کی تدابیر

ورزش: روزانہ باقاعدہ ورزش کریں تاکہ جسم میں آکسیجن جذب ہو۔ روزانہ سیر بھی مفید ہے۔

نمک خوری سے بچیں: نمک سے خون کا دباؤ بڑھ جاتا ہے اسی لیے اس کا استعمال کم سے کم کریں۔

وزن کم رکھیں: بڑھا ہوا وزن خون کے دباؤ کو بڑھاتا ہے اس لیے وزن کم رکھنے کے اقدامات کریں۔

کولیسٹرول کنٹرول رکھیں: چکنائی سے کولیسٹرول بڑھ کر خون کا دباؤ بڑھ جاتا ہے۔ اس لیے چکنائی والی غذائیں کم سے کم استعمال کریں۔

ملیحہ کا استعمال بڑھا دیں: غذا میں سبزی خوری زیادہ رکھیں تاکہ ملیحہ زیادہ ہو اس طرح بڑی آنت درست رہتی ہے۔ قبض نہیں ہوتی سبزیوں کے علاوہ پھلوں میں ملیحہ ہوتا ہے۔

ڈپریشن سے بچیں: عہد حاضر میں خون کا دباؤ بڑھنے کی بڑی وجہ ڈپریشن ہے۔ اعصابی تناؤ اور ذہنی دباؤ سے محفوظ رہنے کے لیے خوش و خرم رہیں۔ کسی کی دل آزاری نہ کریں۔ غم و غصہ سے دور رہیں۔

عبادات: نماز روزہ سے روحانی سکون ملتا ہے۔ اس لیے بلڈ پریشر سے بچنے کے لیے خشوع و خضوع سے عبادات کریں۔ اس طرح خون کا دباؤ نارمل رہتا ہے۔

کیلشیم والی غذائیں: کیلشیم اور پوٹاشیم والی غذاؤں کے استعمال سے خون کا دباؤ نہیں بڑھتا۔ اس لیے کیلشیم کے لیے دودھ سے بنی اشیاء، بے ملائی دودھ، دہی اور پھل استعمال کریں اور پوٹاشیم کے لیے لیموئی پھل (نارنگی، سنگترہ، مالٹا) کھائے جائیں۔

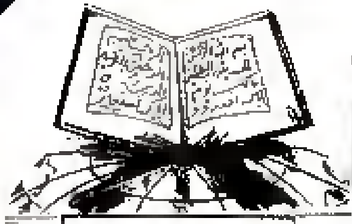
منشیات سے دور رہیں: منشیات سے بلڈ پریشر بڑھ جاتا ہے۔ اس لیے تمباکو نوشی سے احتیاط کریں۔ شراب نوشی سے دور رہیں۔

گوشت کا استعمال کم رکھیں: گوشت سے چکنائی حاصل ہوتی ہے۔ جو کولیسٹرول کا سبب بنتی ہے۔ لہٰذا زیادہ گوشت نہ کھائیں بلکہ تھوڑی مقدار میں ضرورت کے مطابق کھائیں۔

وٹامن سی والی غذائیں: وٹامن سی والی غذائیں ایچ ڈی ایل کی سطح بڑھا دیتی ہیں۔ غذا میں بند گوبھی، نارنگی استعمال کریں تو غذا میں ملیحہ کے فوائد ملیں گے اور ایچ ڈی ایل کی سطح کم ہوگی۔ وٹامن سی کا استعمال ایچ ای ایل کی سطح بڑھاتا ہے مگر بعض غذاؤں میں وٹامن سی ہوتی ہے ان میں اسٹرابری، کنول، مالٹا، نارنگی، تازہ آلو، ٹماٹر شامل ہیں۔ یہ خون کے تھکے بننے کو روکتی ہے۔

پانی زیادہ پئیں: پانی پیاس سے زیادہ پئیں تاکہ گردے پتھریوں سے محفوظ رہیں۔ گردے کی پتھریاں بھی بلڈ پریشر بڑھنے کا سبب بن جاتی ہیں۔

بلڈ پریشر کے بڑھنے کا درست اندازہ صرف اس کی پیمائش سے ہوسکتا ہے۔ خود کو اچھا محسوس کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ بلڈ پریشر بڑھا ہوا نہیں ہے۔ بعض لوگ ادویہ کے استعمال سے بلڈ پریشر کنٹرول ہونے پر یہ خیال کرتے ہیں کہ نارمل ہوگیا ہے اگرچہ یہ نارمل احتیاط اور ادویات کے سبب ہے۔ ایسے لوگوں کو باقاعدہ طبی مشورہ کرتے رہنا چاہیے اور احتیاطیں ضروری رکھیں۔ ورنہ اس عارضے کے سبب اعضاء امراض میں مبتلا ہونے سے فالج، حملہ قلب، ناکارہ گردہ اور بینائی جانے کا امکان ہوتا ہے۔ مندرجہ بالا تدابیر اختیار کرکے آپ بلڈ پریشر کو بڑھنے سے روک سکتے ہیں۔



"دعا تقدیر بدل دیتی ہے" (حدیثِ رسولؐ)

سیارہ ڈائجسٹ کی ایک اور ایمان افروز پیشکش



دعا نمبر

شائع ہو گیا ہے

- قرآنی دعائیں۔
- عظیم پیغمبرانِ خدا کی وہ دعائیں جو نسلِ انسانی کے لیے نجات اور ہدایت کا باعث بنیں۔
- خالقِ کائنات کے آخری نبی محمد رسول اللہؐ کی تمام مسنونہ دعائیں جو رحمت اللعالمینؐ کی ذاتِ برکات کا مقدس پرتو ہیں۔
- صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین کی دعائیں۔
- آئمہ اکرام اور اسلام کے عظیم اور باکمال صوفیائے عظیم کی بابرکات دعائیں۔

جدید دنیا کے گھمبیر اور اعصاب شکن مسائل میں گھرے
پریشان حال انسان کے تمام مسائل کا تشفی آمیز
روحانی اور ایمانی علاج

قیمت: 175 روپے

سیارہ ڈائجسٹ: 240 مین مارکیٹ ریواز گارڈن لاہور۔ فون: 37245412

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہے کہ متوسط طبقہ کی لڑکی ہے؟ کیا نیلو نے اپنی دوستی کا حق یہ کہہ کر ادا کیا ہے کہ کون اس دو ٹکے کی پچھلی لڑکی کو جیون ساتھی بنا کر روگ مول لے گا؟

ہوں! تو وہ خشک اس لیے ہے کہ نیلو کی طرح اُس کا اپنا بنگلہ نہیں شوہر نہیں بچے نہیں...... جن کی وہ مالک بنکر نگرانی کرے۔ کیا ایک عورت کی زندگی کی کل کائنات کے یہی وہ مادی عناصر ہیں جن کے حصول پر وہ خوشی سے سرشار ہو جاتی ہے؟ لیکن نہیں! باجی تو اپنی زندگی سے مطمئن نہیں ہیں اور ہوں بھی تو کیوں؟ دولہا بھائی کے ساتھ انہیں نہ صرف معاشی کفالت کرنی پڑتی ہے بلکہ ان کی جھک جھک بھی سننی پڑتی ہے۔ زندگی کی وہ سادی لطافتیں مسکراہٹیں اور وارفتگیاں ایک خواب بن چکی تھیں جسے باجی جیتی جاگتی دنیا میں دیکھنے کی خواہش مند تھیں لیکن اس کے باوجود بھی ان کی محرومیاں لبوں پر گلے شکوے بن کر نہ آئیں حالانکہ دیکھنے والی آنکھیں انہیں دیکھ کر نتوقتیں تو وہ مسکرا کر نگاہیں موند لیتیں جیسے اپنے غموں کو آنکھوں کے پیمانوں میں سمیٹنے کی ناکام کوشش کر رہی ہوں۔

کالج کی تعطیلات میں جب وہ گھر لوٹی تو اپنی شادی کی باقاعدہ تیاریوں میں مسرور ہونے کی بجائے گم سم سی رہ گئی۔ وہ چاہتے ہوئے بھی باجی سے اپنے حق کے لیے لڑ نہ سکی۔ اتنا بھی تو نہ کہہ پائی کہ باجی کیا آپ نے مجھے جانور سمجھ رکھا ہے کہ جس کے پلے باندھ دیا...... لیکن نہیں...... غلطی اس کی اپنی تھی۔ باجی نے تو بارہا خط کے ذریعے اس کی پسند اور رائے معلوم کرنا چاہی تھی مگر وہ ہر بار بے نیازی سے ٹال دیتی تھی جیسے وہ ابھی بچی تھی اور اس گراں ذمہ داری کو قبول کرنے سے قاصر۔

وقت گزاری کے لیے اس نے ڈھیروں افسانے پڑھ ڈالے تھے۔ تقریباً ہر افسانہ رومان کے کیف و سرور میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہیروئن ہے کہ لذت انتظار کی چاشنی میں کھوئی ہوئی ہے۔ ہیرو ہے کہ ہیروئن کے لیے بے تاب و بے قرار جان تک کی بازی لگا دینے کو تیار اور ولن بے چارہ یا تو اپنے انتقام کی آگ بجھانے کے لیے ہیروئن کو تباہ و برباد کر دے گا یا پھر دنیا سے منہ موڑ کر محبت کا بھرم رکھ لے گا۔ جانے کیوں اُسے ان سادے افسانہ نگاروں کی اوٹ پٹانگ لفاظیوں سے زندگی میں پہلی بار نفرت سی محسوس ہوئی۔ وہ جو تخیلات کی اونچی پرواز میں حقیقت سے آنکھیں چرا لیتے ہیں جانے اپنے احساسات کی جھوٹی تسکین کے لیے قاری کے زخموں پر تازیانے لگا کر انہیں کیا ملتا ہے؟ افسانے اور حقیقت کی تلخیوں کا موازنہ کرتے ہوئے وہ ابھی کسی نتیجے پر بھی نہ پہنچ پائی تھی کہ سکوٹر سٹارٹ کرنے کی آواز پر اُس کی نگاہیں بے ساختہ سامنے بنگلے کے لکشنوں پر جا پڑیں۔ نیلی ساڑھی میں ملبوس ایک پیاری سی لڑکی اپنی گود میں گول مٹول خوبصورت بچہ سنبھالے اپنے شوہر کو الوداع کہہ رہی تھی۔ جواباً اس کے شوہر نے اسے پیار بھری نظروں سے دیکھا اور بچے کو پیار کرتا ہوا آفس روانہ ہو گیا۔ تو کیا ازدواجی زندگی اتنی پر بہار ہو سکتی ہے؟ کیوں نہیں؟ زندگی تو اس سے بھی زیادہ حسین ہے۔ کسی اجنبی سرگوشی نے اُسے گدگدایا تو وہ بھی اپنی جذباتی دنیا میں ایسے پیکر کو ڈھونڈنے لگی جسے صرف اس سے والہانہ پیار ہو۔

اب تو ہر لمحہ اُس کا دل چاہنے لگا تھا کہ وہ اپنے فلیٹ کی بالکنی میں بیٹھی اُس پیاری سی لڑکی کی دن بھر کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیا کرے جبھی تو وہ بڑے غور سے اُسے چلتے پھرتے دیکھتی۔ بچے کو پیار کرتے دیکھتی، رنگ برنگے کپڑے پہنانے دیکھتی۔ لان میں بیٹھے سویٹر بنتے دیکھتی اور کچھ نہیں تو اُسے مطالعہ کرتے دیکھ اُس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ ان کتابوں کا نام جان لے جنہیں وہ بغور

پڑھا کرتی ہے۔ پھر شام کے جھٹپٹے میں تو اس کی نگاہیں غیر ارادی طور پر صاف، شفاف سڑک پر پھسلنے لگتیں۔ سکوٹر کی آواز کے ساتھ ساتھ اس کے دل کی دھڑکنیں بھی تیز ہو جاتیں۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے لگتے اور جسم میں چیونٹیاں سی رینگنے لگتیں۔ بمشکل اپنے آپ پر قابو پا کر وہ اس دلفریب منظر میں کھو جاتی کہ کیسے وہ پیاری سی لڑکی آفس فائل اپنے شوہر سے لے کر دل میں اتر جانے والی مسکراہٹ سے اس کا استقبال کرتی ہے اور بچہ باپ کی ٹانگوں سے لپٹ کر اپنے پیار کا اظہار کرتا تو وہ جھپٹ کر اُسے گود میں لے کر چومنے لگتا...... اور ...... اور جب رات کے سائے لہرانے لگتے دونوں میاں بیوی گھومنے نکلتے تو اُس کے جذبات میں ہلچل سی مچ جاتی۔ پھر وہ گھنٹوں آنکھیں موندے مستقبل کے حسین تانے بانے میں اُلجھی نیند کی پرسکون وادی میں چلی جاتی۔

شادی کی ہنگامہ آرائی میں وہ خود کو بھلا بیٹھی تھی۔ اُس نے صرف اور صرف ایک بار اپنے گلفام کو دیکھا تھا۔ گلفام تو اس کے تصور سے بھی کہیں حسین تھا۔ کاش اُس کا دل بھی اتنا ہی حسین ہو۔ ایک انجانا خوف جب بھی اُسے ڈراتا تو اُس کی نظریں اُس بنگلے کا طواف کرنے لگتیں جس سے اُسے بے حد اُنسیت ہو چکی تھی۔

دل! جانے یہ کیسی شادی تھی کہ گلفام نے اُسے پکچر، پارٹی، پکنک یا چھوٹی موٹی تفریح میں سے کسی ایک کی بھی پیشکش نہ کی تھی۔ شادی کے ابتدائی دنوں کی رنگین بہاروں کا تصور تو خیر خزاؤں کا روپ دھار ہی چکا تھا۔ پر اب تو وہ اپنی خشک زندگی کی تلخیوں سے بھی اکتا چکی تھی۔ جانے زمانے بھر کی بدنصیبی اُسی کا مقدر کیوں بن گئی تھی۔ اُسے اپنے شوہر سے ذرا بھر بھی تو ہمدردی نہ تھی اور ہوتی بھی کیوں؟ بھلا وہ شخص جو دولت سمیٹنے کے چکر میں پتھر دل بن چکا تھا۔ ایک عورت کے حسین و نازک احساسات کا قدرداں کیوں ہو سکتا تھا؟ اُس نے تو کبھی بھول کر بھی یہ نہ پوچھا کہ تمہارے چہرے پر تلخی اور ناگواری کے احساسات کیوں ہیں؟ تم کن مصائب سے دوچار ہو؟ بے وقت کھانا کھا کر تم اپنی صحت کیوں برباد کر رہی ہو؟ کیوں لباس میں تساہل پسندی تمہاری عادت بن رہی ہے۔ اُس کی بلا سے وہ جیئے مرے یا جہنم میں جائے۔ سماج کے جس بندھن میں گرفتار ہو کر وہ نامعلوم اذیتوں سے دوچار تھی اُس کا مداوا تو دور کی بات باجی اور بھیا تک کو اُس کی خبر نہ تھی۔

اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ جب اُس کی باجی نے اُسے گلے لگاتے ہوئے پوچھا؟ کیوں رباب تجھے ملازمت کی کیا پڑی جب گلفام کی ماہانہ آمدنی ہزاروں میں ہے۔ ہاں باجی اُن کی آمدنی ہزاروں میں ہے...... پھر بھی چند سو کی رقم کے لیے انہوں نے مجھے کہہ دیا کہ میں گھر میں فالتو بیٹھ کر زندگی ضائع نہ کروں۔ ٹھیک ہی تو کہا ہے باجی انہوں نے، میرا دل بھی لگ جاتا ہے اور خرچ بھی نکل آتا ہے...... وہ طنزیہ مسکرائی۔ خرچ اور تیرا...... وہ بھی گنی چنی رقم میں...... یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ رباب؟ کیا وہ تیرا کفیل نہیں؟ اگر نہیں تو پھر اُس سے شادی کیوں کی تھی؟ میں آج ہی گلفام سے بات کروں گی، نہیں باجی نہیں...... کوئی ضرورت نہیں کچھ کہنے سننے کی۔ آپ کے کہنے سے ان کی فطرت بدل نہیں سکتی۔ عادت چھوٹ نہیں سکتی...... انہیں اگر میری پروا نہیں تو مجھے بھی گلہ کرنے کا کوئی حق نہیں۔ لیکن رباب تم یہ بھول رہی ہو کہ وہ تمہارا شوہر ہے۔ باجی نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔ آپ بھی یہ بھول رہی ہیں کہ خوشیاں زبردستی خریدی نہیں جا سکتیں۔ میرا مقدر جن

مشہور لوگوں ، مختصر زندگی

شہرت اور دُنیا میں نام بنانا ہر شخص کا مقصد ہوتا ہے تاہم ایک نئی تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ مشہور لوگوں کی زندگی طویل نہیں ہوتی۔ آسٹریلیا میں نیو ساؤتھ ویلز اور کوئنز لینڈ یونیورسٹی کی مشترکہ تحقیق میں کہا گیا ہے کہ معروف فنکاروں اور کھلاڑیوں کی اوسط عمر 77 سال جبکہ اس کے مقابلے میں معلم، ڈاکٹرز اور دیگر ایسے افراد جو زیادہ مشہور نہیں ہوتے ان کی اوسط عمر 82 سال ہوتی ہے۔

(خالد وذف۔ کراچی)

لالٹین میلہ

تائیوان میں سالانہ لالٹین میلہ منایا گیا، اس موقع پر عوام نے جوش و خروش کا مظاہرہ کیا۔ یہ میلہ نئے قمری سال کے پہلے مہینے کے 15 ویں روز منایا جاتا ہے جس میں ہزاروں لوگ شرکت کرتے ہیں۔ میلے کے دوران لالٹینیں روشن کی جاتی ہیں اور آتش بازی کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے۔ رواں برس میلے کی خاص بات دیو قامت گھوڑے کی لالٹین تھی جو نئے چینی سال کی علامت ہے۔

(مرسلہ: سونیا طارق۔ فیصل آباد)

انعام

نئی نویلی دلہن پہلی بار اپنے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا شوہر کو کھلانے کے بعد بڑے ناز سے کہنے لگی۔ "ڈارلنگ! اگر تمہاری ناچیز کنیز اسی طرح تمہارے لیے کھانا پکاتی رہے تو اسے انعام میں کیا ملے گا؟" شوہر نے جواب دیا۔ "میرے بیمہ کی رقم اور وہ بھی بہت جلد......"

(مرسلہ: ڈاکٹر ندیم چودھری۔ حیدر آباد)

تاریکیوں میں ڈوب گیا ہے۔ اُسے نہ تو آپ روشنیوں سے ہمکنار کر سکتی ہیں اور نہ میں...... بے

بسی کے عالم میں وہ بچے کی ٹھنڈی سلاخوں سے اپنا چہرہ رگڑتے ہوئے وہ احساسات کی اس بغاوت کو روکنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی جو اُسے راہ فرار پر اُکسا رہے تھے۔

"کہہ تو رہا ہے وہاب کہ مجھے تم سے کوئی انسیت نہیں...... لگاؤ نہیں...... دلچسپی نہیں"۔ تو پھر مسٹر گلفام آپ نے شادی کیوں کی تھی؟ اس کا دل چاہا کہ جواب میں وہ یہ سب کچھ کہتے ہوئے اُس کا منہ نوچ لے، اُس کا گریبان پھاڑ ڈالے اور اُسے دھکے دے کر گھر سے نکال دے...... لیکن...... لیکن وہ کچھ بھی نہ کر سکی۔ سوائے آنسو بہانے کے۔ شاید اس لیے کہ وہ جانتی تھی کہ دنیا کی ظاہری آنکھیں اُسے ہی مورد الزام ٹھہرائیں گی۔ باوجود اس کے کہ احساس کی عدالت میں ازدواجی تلخیوں کا ذمہ دار صرف اور صرف اُس کا اپنا شوہر ہے جو اپنا ہو کر بھی اپنا نہیں۔

حالات نے وہاب کے احساسات کو اس قدر مجروح کر دیا تھا کہ اسے اپنے ہونے والے بچے سے محبت تو بڑی بات ہلکی سی انسیت بھی نہ تھی۔ اس پر گلفام کے رویے کی تبدیلی نے تو اُسے اور بھی مشتعل کر دیا تھا۔ ہوں! تو گلفام کو بچے سے ابھی سے والہانہ پیار ہے۔ جبھی تو ہر اگلے قدم پر پیچھے مڑ کر وہ اسے سہارا دینے کی کوشش کرتا جیسے وہ اوّل سے اُس کا تمنائی تھا۔ خودغرض، کمینہ فطرت انسان، میں نے تجھے اچھی طرح پرکھ لیا ہے۔ تُو مجھے اب فریب نہیں دے سکتا میں تجھے کبھی وہ خوشی نہیں دوں گی جس کا تو خواہش مند ہے۔ تو یہ سمجھ رہا ہے کہ بچہ تیری ملکیت ہے لیکن...... لیکن اگر میں چاہوں تو دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اسے جیتے جی موت کے گھاٹ اُتار دوں...... اس لیے کہ وہ تیرا ہی نہیں میرا بھی بچہ ہے۔ اُس پر پہلا حق میرا اور بعد کو تیرا ہے۔ دنیا بھی یہ نہیں کہے گی کہ میں اپنے بچے کی قاتل

ہوں۔ بھلا کوئی ماں اپنے بچے کی قاتل ہوسکتی ہے؟ لیکن...... لیکن مجھے ایسا کرنا ہوگا۔ میں ایسا کروں گی اور ضرور کروں گی ...... تجھے تڑپانے کے لیے ......اذیت دینے کے لیے......زندہ درگور کرنے کے لیے......!

''رباب بچے کے کپڑے وغیرہ سب تیار کرلیے تم نے؟'' گلفام نے گھر لوٹتے ہی ڈھیر سے کھلونے اور بے بی سیٹ اُس کے آگے ڈال دیے''جی ہاں بالکل'' بظاہر مسکراتے ہوئے اور حقیقتاً نفرت سے منہ سکوڑتے ہوئے وہ تلخی سے بولی۔ ''کتنی کمزور ہوگئی ہو رباب، ڈاکٹرز سے انجکشن اور ٹانک کیوں نہیں لکھواتیں؟ گھر میں پڑی پڑی بور ہو جاتی ہو، میں تمہیں بار بار کہہ چکا ہوں کہ جہاں دل چاہے چلی جایا کرو۔ چلو باجی کے گھر چلیں بہت دن ہوگئے ان سے ملے ہوئے'' اخبار اپنے سامنے پھیلائے ہو وہ گنگنانے لگا۔ ''گلفام! یہ تم کہہ رہے ہو گلفام...... زندگی میں پہلی بار اتنی ہمدردی اور خلوص سے......'' اُسے اپنی سماعت پر یقین نہ آیا...... نہیں نہیں...... تمہیں مجھ سے کوئی ہمدردی نہیں...... لگاؤ نہیں...... دلچسپی نہیں...... تمہیں تو صرف اپنے ہونے والے بچے سے پیار ہے۔ اس بچے کی خاطر تم مجھے دھوکا دے رہے ہو تسلی دے رہے ہو۔ زندگی سے پیار کرنا سکھا رہے ہو...... تو کیا میری اپنی حیثیت محض ثانوی ہے اور بچے کی حیثیت کلی ہے؟ نہیں...... نہیں...... ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔ کبھی نہیں، کبھی نہیں! میرے جیتے جی تم مجھے نظر انداز کرو اور بچے کو سینے سے لگا لو...... میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گی۔ غصے سے اُس کی مٹھیاں بھینچ گئیں تو اُس کا بدن شدت جذبات اور احساس شکست سے کانپنے لگا...... لیکن اپنی کیفیت کی پروا نہ کرتے ہوئے وہ تیزی سے غسل خانے کی طرف بھاگی اس سے قبل کہ آنسوؤں کی آگ کو ٹھنڈے پانی سے بجھا سکے دھڑام سے چکرا کر گر پڑی اور ......اور جب اُسے ہوش آیا تو شدت تکلیف کے باوجود اُس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ ہسپتال کی اجنبی فضا میں نرس کو اپنے اوپر جھکا ہوا دیکھ کر بے اختیار اُس کے لبوں سے نکلا۔ ''سسٹر میرا بچہ کہاں ہے؟'' ''بچے کو نہلایا جارہا ہے بی بی۔ آپ یہ گولی کھالیں'' گولی کھاتے ہی اُس پر غنودگی کی سی کیفیت طاری ہوگئی وہ حقیقت کی دنیا سے دُور خوابوں کی حسین دنیا میں کھوگئی۔

نیند سے بیدار ہوتے ہی اُس نے اپنے پلنگ کو ٹٹولا لیکن وہ تو خالی تھا...... بالکل خالی......اور جھولا...... جھولا بھی تو خاموش پڑا تھا...... نہ کسی کے رونے کی آواز...... نہ چلانے کی...... نہ کسی کا کلبلاتا وجود...... پھر اس کا بچہ کہاں ہے؟ کہاں ہے اُس کا بچہ؟ اس کی متلاشی نگاہیں دروازے پر مرکوز تھیں۔ شاید کہ نرس بچے کو بنا سنوار کر لا رہی ہو۔ اُس نے دل کو تسلی دی ''رباب کیسی طبیعت ہے'' اب گلفام کی گمبھیر سی آواز نے اسے بے چین کردیا۔ کروٹ بدل کر اُس نے گلفام کو دیکھا۔ گلفام کی سرخ اور متورم آنکھیں اُس کے دلی کرب کی غماز تھیں ''گلفام میرا بچہ کہاں ہے گلفام؟'' اُس نے سوالیہ نظریں اس کے چہرے پر گاڑ دیں۔ اپنے آنسو روکتے ہوئے وہ صرف اتنا کہہ پایا'' وہ دُور چلا گیا ہے رباب! دُور...... بہت دُور ارے میں تو اُس کا نام ''شاداب'' رکھنے والا تھا، لیکن لیکن زندگی کی شادابی اُس کا مقدر نہیں تھی! اور......

اور اس لمحے رباب کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ بچے ہی کی نہیں اپنے شوہر کی بھی قاتل ہے۔ وہ قاتل ہے...... وہ قاتل ہے...... خوشیوں کی قاتل...... آرزوؤں کی قاتل...... اور وفاؤں کی قاتل...... بیشمار انجانی سرگوشیوں کی بوچھاڑ نے اُسے تڑپا تڑپا دیا۔ تو تکیے میں منہ چھپا کر رو پڑی۔


سب کہہ دو سیفٹی
پھر کہہ دو
کوٹلہ سیفٹی شوز
SAFETY BOOTS & SAFETY SHOES WITH STEEL TOP CAPS,
SHOE COVERS & GUM BOOTS (MADE OF PAK, CHINA, ITALY, U.K)
KOTLAA
SAFETY HALMET
& SAFETY SHOES
FIRST FLOOR, ASLAM ARCADE, 16-McLEOD ROAD, LAHORE. Ph: 731-4787-88

جذبہ محسوس کیا ہو۔ کہتے ہیں ناں زبردستی مسلط کیے جانے والے فیصلے دیرپا ثابت نہیں ہوتے۔ تب سے میں اس فیصلے کے ختم ہونے کا انتظار کر رہا ہوں۔ مجھے والدین یاد نہیں آتے شاید اسی وجہ سے اتنے سال گزرنے کے بعد بھی میں نے پلٹ کر ان کی خبر نہ لی۔ میں سمندر میں پڑ جانے والے جزیرے کے خونی حصار میں ہوں۔ مگر کسی کو بھولا نہیں...... کیا واقعی؟؟

مگر میں شاید گھر کے ساتھ ساتھ کتنوں کو بھی بھولتا جا رہا ہوں۔ اپنی پوری فوجی کمپنی میں، میں، رضا اور عمر کے ساتھ خوشی محسوس کرتا ہوں جبکہ کیف علی سے مجھے نفرت ہے شاید اس لیے کہ اس میں وطن کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔

کیف علی کہتا ہے "وطن کے لیے جی کر دیکھا تو زندگی کا مقصد سمجھ میں آیا وہ زندگی بندھن روشنی میں سونا جاگنا کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اس دھرتی کی زمین پر قدم رکھتے ہی انگ انگ سرشاری محسوس کرتا ہے۔ آسمان سر پر ہونے کی اہمیت اتنی نہیں جتنی کہ وطن کی مٹی کا قدموں کے نیچے ہوتا ہے۔ زندگی کے دوڑنے بھاگتے قدموں کے ساتھ چلنے کو فوجی زندگی ہمیں تربیت دیتی ہے۔ اگر آپ محب وطن نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ کبھی بھی دل کو حب الوطنی کے جذبے سے خالی مت رکھیں"۔ یہ کیف بھی ناں، اس کو ایسی افسانوی باتیں کرنے کی عادت ہے۔ بہرحال ایسی باتیں کر کے میرا دل کبھی نہیں جیت سکتا۔ کیا باتوں سے دل جیتے جا سکتے ہیں؟؟ مگر میں اب کیف سے خوف محسوس کر رہا ہوں اگر اس نے میرے دل میں حب الوطنی کا جذبہ جگا دیا تو مجھے جان کی قربانی دینی پڑے گی۔ مگر نہیں میں مرنے سے بہت ڈرتا ہوں۔ میں اور رضا اونچی پہاڑی پر بیٹھے تھے۔ ہلکی ہلکی ہوا سے رات کا یہ خاموش پہر کافی سکون بخش تھا اور سفید روشنی میں ایسا لگ رہا تھا جیسے ہزاروں کی تعداد میں ان گنت چاندنی کے ورق رضا کے گول مٹول چہرے سے چمٹ گئے ہوں۔ رضا کھجور کھا رہا تھا اور گٹھلیاں میری جیب میں ڈال رہا تھا۔ وہ ایسا ہی ہے ہنسانے والا۔ شگفتہ، شگفتہ۔

"میجر عبداللہ! ایک بات پوچھوں......؟؟" وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا، میں جانے کس موڈ میں تھا میں نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

"بھائی! آپ اپنے ماں، باپ سے ناراض کیوں ہیں۔ وہ آپ کی جدائی میں تڑپ رہے ہوں گے۔ آپ انہیں کس بات کی سزا دے رہے ہیں؟؟" وہ مجھ پر الزام ڈال رہا تھا۔ وہ مجھ سے گزری ہوئی کہانیوں کی روداد دریافت کر رہا تھا

"رضا صاحب! تمہیں ان کی تڑپ نظر آ گئی اور جو انہوں نے میرے ساتھ کیا وہ کیوں نظر نہیں آیا۔ وہ اوّل روز سے جانتے تھے کہ میری دلچسپی میڈیکل میں ہے پھر بھی...... کیا وطن کے لیے جو خدمت یہاں ہو رہی ہے کیا وہ میں ڈاکٹر بن کر نہیں کر سکتا تھا؟" میں اسے لاجواب کرنا چاہتا تھا مگر شاید وہ مجھ سے زیادہ اس فن میں طاق تھا۔

"میرے بھائی! ڈاکٹری میں سب سے اوّل چیز مفاد ہے اور یہ خدمت گزاری کا وقت آخر میں آتا ہے۔ والدین کبھی غلط نہیں ہو سکتے"۔ میں چپ بیٹھا رہا۔ وہ مجھے دیکھ رہا تھا میں نے نظریں چرا لیں۔ میں نے اپنے کندھے پر اس کا ہاتھ محسوس کیا۔ میں جانتا تھا اگر میں نے مڑ کے دیکھا تو وہ میرا راز جان جائے گا۔ اور راز تو ہوتے ہی چھپانے کے لیے ہیں۔ رضا شاید مسکرا رہا تھا میں رات کی چادر پر سجے چاند کو دیکھنے لگا۔ رضا نے پیچھے سے کہا "عبداللہ! میں جانتا ہوں کہ تم رو رہے ہو۔ وہ تمہیں یاد آتے ہیں مگر تمہاری انا تمہیں روک رہی ہے تم انہیں یاد کرتے ہو، اب رونا بند کرو۔ رات کے آخری پہر نہیں

روتے"۔

مجھے راز چھپانا نہیں آتا تھا اور اسے راز جاننا آتا تھا۔ وہ جا رہا تھا میں نے دودھیا روشنی میں اس کی پیٹھ دیکھی اور چلایا "احمد رضا! تم بہت برے ہو"۔

اس نے پلٹے بغیر جواب دیا" ہاں...... ہاں مگر میں میجر عبداللہ سے بہت کم برا ہوں"۔

وہ ہنستا ہوا جا رہا تھا۔ میں نے دیکھا چاند بھی ہنس رہا تھا، صبح ہو چکی تھی۔ ابھی بھی اندھیرا پوری طرح گیا نہیں تھا۔ ہلکے اندھیرے میں ہر چیز کا نیلا نیلا تاثر ابھر رہا تھا۔ میں قالین پر بیٹھا چائے پی رہا تھا جبکہ رضا قالین کے آخری سرے پر آدھا قالین اور آدھا زمین پر لیٹا بانسری بجا رہا تھا۔ میرے اور عمر کے خیال کے مطابق وہ ہر فن مولا شخص تھا۔ مگر اسی قدر بے ڈھنگا اور بے ترتیب۔ ابھی چائے کا گھونٹ میرے منہ میں ہی تھا جب میں نے عمر کو آتے دیکھا۔ وہ بھاگتا ہوا آ رہا تھا اسی وجہ سے اس کا سانس بھی پھولا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں خاکی لفافہ دبا ہوا تھا۔ ہم سب جانتے تھے کہ اس میں کیا تھا۔ ہمیں اس کا شدت سے انتظار رہتا تھا۔ "عبداللہ یار! جلدی سے پڑھ دے تاکہ دل کو ٹھنڈک ملے" وہ میرے سامنے قالین پر ہی آلتی پالتی مارے بیٹھ گیا۔ جوش سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ وہ اس کی بیٹی "لاڈو" اور ہم سب کی بھتیجی کی چٹھی تھی۔ ہر نئے مہینے وہ ہمیں چٹھیاں ارسال کرتی تھی۔ وہ دس سال کی تھی۔ بلا کی ذہین اور تیز طرار وہ ہمیں اکثر چیزیں بنا کر بھی بھیجتی تھی۔ اس کے ننھے ہاتھوں سے بنے "چھوٹے چھوٹے لڈو" ہمیں دنوں تک سرشار رکھتے۔ سارے سامعین اکٹھے ہو چکے تھے۔ میں نے چٹھی کھول کر شگفتگی سے پڑھنی شروع کی۔ ہر طرف خاموشی تھی، سناٹا۔ میرے لفظ بول رہے تھے:۔

"محترم ابا جان اور چاچا صاحبان!

السلام علیکم!

ہم خیریت سے ہیں آپ کی خیریت نیک مطلوب ہے۔ عبداللہ چچا آپ اس بار میرے لیے گڑیا ضرور بھیجنا۔ اور گول مٹول چچا (رضا) آپ بھی کنجوسی کی روایت چھوڑتے ہوئے کچھ بھیج دینا۔ اور کیف چچا آپ نے جو ڈائری ارسال کی وہ مجھے بہت پسند آئی۔ شکریہ۔

میرا چوزہ مر گیا ہے ابو آپ آئیے گا تو ضرور لے کر آنا۔ امی بھی سلام کہہ رہی ہے۔ ابو اس عید پر ضرور آئیے گا ہم انتظار کریں گے۔ ہم اداس ہیں آپ کے بغیر۔ اب آئندہ ماہ لکھوں گی۔ رب راکھا۔

ہمارے دل سرشار ہو چکے تھے۔ عمر نے چٹھی میرے ہاتھ سے لے کر چوم لی۔ ہم خاموش بیٹھے تھے۔ مجھے لگا جیسے کوئی شدت سے مجھے یاد آ رہا ہو۔ نہیں، نہیں یہ میرا وہم تھا۔

مگر میں ناواقف تھا کہ وہم یقین کی پہلی سیڑھی ہیں۔ ابھی ہم ڈیوٹی سے فارغ ہو کر آرام کی غرض سے بیٹھے ہی تھے کہ کرنل آفریدی چلے آئے۔ ہم سب کو مشترکہ سلام کر کے وہ ہمارے درمیان بیٹھ گئے۔ اُن کے چہرے پر چٹانوں کی سی سختی چھائی ہوئی تھی۔ وہ ہم سے مخاطب ہوئے۔ "نوجوانو! ایک غیر مصدقہ اطلاع ملی ہے کہ شاید کل دشمن ہم پر حملہ کرے۔ ہمیں ہر حال میں چاق و چوبند رہنا ہوگا۔ ذرا سی لغزش ہمارے لیے زہر قاتل ثابت ہو سکتی ہے۔ ملک کے دفاع کے لیے حوصلے ابھارو۔ ورنہ میر جعفروں کی اس ملک میں کوئی کمی نہیں" وہ بات کر کے رکے اور میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگے" اور تم عبداللہ اپنی فکروں کو اپنے تک محدود رکھو۔ یہ تمہارے ساتھ ساتھ اس دھرتی کے لیے بھی باعث نقصان ہیں"۔

میں خاموش بیٹھا رہ گیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا

اسے زمین میں زندہ دفن ہونا کہتے ہیں؟؟

اس رات میں لرزتا رہا۔ بہت دیر بعد مجھے نیند آئی۔ مجھے رات کے اندھیرے میں اک عجب سا لمس محسوس ہوا۔ پھر میں نے خواب دیکھا۔ روح کھینچ دینے والا۔ مجھے خوف محسوس ہوا۔ موت کا خوف......

کیا زندگی ماتم میں ڈھلنے والی تھی؟؟ ہاں ...... یا شاید نہیں۔ وہ کپڑے کے تین تھان سے تھے جو آسمان سے پرواز کر کے زمین کی طرف آ رہے تھے۔ سفید کپڑا، یعنی امن، سکون اور آخر میں کفن یعنی کہ موت۔

پھر میں نے ان کفنوں کو رضا اور عمر کے ساتھ ساتھ کیف کے وجود کے گرد لپٹے دیکھا۔ حیرت تھی کہ کفن میں مقید چہروں کی آنکھیں کھلی تھیں۔ ہونٹوں کے ساتھ ساتھ آنکھیں بھی مسکرا رہی تھیں وہ زندہ تھے۔

پھر میں نے تیسرا چہرہ دیکھا، وہ کیف تھا۔ پھر چوتھا چہرہ جس میں کوئی اور وجود تھا میں نے قریب جا کر دیکھا، دھند میں لپٹا ہوا تھا اور دھند میں لپٹی چیزیں آسانی سے کہاں نظر آتی ہیں؟؟

میں بھی نہ دیکھ سکا۔ صبح میں نے سب سے پہلے رضا اور عمر کو دیکھا، وہ آرام سے سو رہے تھے۔ مجھے اطمینان ہوا۔

وہ کہتے ہیں ناں کہ اطمینان بہت جلد رخصت ہو جاتے ہیں اور آنے والے دنوں میں مشاہدات، تجربات کی شکل اختیار کرنے والے تھے۔ اسی رات ایک دھماکے نے ہمیں ساکت کر دیا۔ تو کیا کرنل آفریدی کی بات سچ ثابت ہونے والی تھی؟؟

اسی وقت دھواں دھار روشنی میں میں نے عمر اور رضا کو بندوقیں لے کر بھاگتے دیکھا۔ مگر میرے قدموں نے جنبش نہ کی مجھے خوف آ رہا تھا کہ کہیں موت کی چادر میرا وجود نہ ڈھانپ لے۔ رائفلیں بم چلتے رہے، میں بیٹھا رہا مگر کب تک۔

رضا اور کیف خون میں لتھڑے عمر کو لے کر آ رہے تھے۔ اس کے جسم سے خون لپٹا ہوا تھا۔ سرخ، گاڑھا خون۔

میں دیوانہ وار اس کے وجود کے گرد لپٹا...... زندگی رخصت ہو چکی تھی۔ پھر میں نے اپنے ہر ساتھی کو مرتے دیکھا۔ ہر انسان کے وجود میں "ضمیر" نامی حس ہوتی ہے شاید مجھ میں بھی تھی۔ مجھے موت سے خوف آتا تھا مگر اب مجھے زندگی سے خوف کیوں آ رہا ہے؟

مجھے لگا میرے ماں باپ کی دی ہوئی دعائیں سفید کبوتر بن کر میرے گرد پھڑپھڑا رہی ہیں۔ میں رائفل اٹھا کر اپنے محاذ پر جم چکا تھا۔ وطن کی سوئی ہوئی محبت بیدار ہو چکی تھی۔ آہ ...... ایک انگارہ میرے وجود میں بھر گیا ہے۔ میں رفتہ رفتہ حواس کھو رہا ہوں۔ میری سانس اکھڑ رہی ہے۔

میری آنکھوں سے آنسوؤں کی بجائے خون پانی بن کر بہہ رہا ہے۔ مجھے اپنے ماں باپ یاد آ رہے ہیں۔ ساری خاک خون آلود ہو چکی ہے۔ مجھے ماں کے الفاظ یاد آ رہے ہیں "شہید کبھی مرتے نہیں میں وعدہ کرتی ہوں میں تمہاری شہادت پر ماتم نہیں کروں گی کیونکہ مجھے پتا ہے میرا بیٹا میرے پروردگار کے پاس امن و سکون سے ہو گا"۔ میں نے ڈھلتی رات کے کنارے پر زندگی کی جنگ لڑتے ہوئے اپنے ماں باپ سے معافی مانگی ہے۔ چاند، ستارے اور یہ رات میری گواہی دیں گے۔ میری آنکھیں بند ہو رہی ہیں۔ آنکھوں کی بصارت کی اوٹ میں نور کے قمقمے جل بجھ رہے ہیں۔

سنہری تتلیاں میرے گرد رقصاں ہیں۔ ہاں یہ زندگی اس زندگی سے بہتر ہے۔ اک فرض تھا جو ادا ہو گیا۔

اور اک قضا کی تکمیل ہوگئی اور خاک کی چادر اوڑھ کے بسر کرنے والی زندگی کتنی آسان ہے...... ہے ناں؟؟

کسی کی ڈفلی میرا راگ

نوشابہ اختر

خاتون خانہ جن کی شوہر کی وفات ہوئی تھی میرے قریب ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک بیس سالہ بچی اچھی خوبصورت سی ان سے ملنے کے لیے آگے بڑھی۔ یقین جانیں میرے بدن کے تو رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ سلیولیس شرٹ اور ٹائٹس کچھ سکن کلر اور پھر آدھی پنڈلیوں تک باقی آپ خود سوچ لیں۔



معاشرے کی جھلک دکھاتے حقیقی واقعات جن میں عقل والوں کیلئے عبرت کا سامان ہے

کہتے ہیں کسی زمانے میں ایک بادشاہ تھا اس نے اپنے عقل مند وزیر باتدبیر کو بلایا اور اس کے سامنے تین سوال رکھ کر فرمایا کہ ان تینوں کے صحیح جواب بتاؤ ورنہ مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ سوال کچھ اس طرح تھے۔ کائنات کا سب سے بڑا سچ کیا ہے؟ کائنات کا سب سے بڑا جھوٹ کیا ہے؟ اور وہ کون سا وقت ہے جب ہم اللہ تعالیٰ کو اپنے سے دور کر کے فیصلہ کر لیتے ہیں؟

الفاظ کے اُلٹ پھیر کے ساتھ سوالات بھی تھے۔ بہرحال وزیر باتدبیر سخت پریشان ہوئے کیونکہ میری طرح انہیں بھی ان میں سے کسی کا جواب معلوم نہیں تھا۔ بادشاہ سلامت نے فرمایا جاؤ اور سات روز میں صحیح جوابات کے ساتھ واپس آؤ۔ ورنہ کولھو بچہ کروا دوں گا۔

وزیر صاحب حیران و پریشان جنگل میں چلے گئے۔ روتے جاتے اور کہتے بے موت مرنے کی تیاری کرلو، وہیں کسی اللہ والے کی کٹیا تھی۔ جس میں سے ایک بزرگ باہر آئے۔ اور وزیر کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولے کیا بات ہے؟ تم پر شاید کوئی بہت بڑی آفت آن پڑی ہے۔ کچھ بتاؤ شاید میں اللہ کے کرم سے تمہارے کچھ کام آسکوں۔ وزیر صاحب نے روتے روتے ساری داستان اُن کے گوش گزار کی اور بولے "باباجی! میں تو ناامید ہو کر بے موت مرنے کے لیے تیار ہوں، مگر میرے بیوی بچے؟ باباجی کچھ دیر کچھ سوچتے رہے اور بولے کہ بیٹا دنیا کا سب سے بڑا سچ موت ہے۔ جو ہر حالت میں وقت مقررہ پر آجائے گی۔ اور دنیا کا سب سے بڑا جھوٹ "میں اور میرا ہے" میرا مال' میرے بیٹے' میری جائیداد' میری وراثت' یہ سب جھوٹ ہے کیونکہ موت کے آتے ہی سب کچھ پرایا ہوجائے گا۔

وزیر کی آنکھوں میں اُمید کی جھلک نمودار ہوئی اور بولے باباجی آپ نے مجھے مرنے سے بچالیا۔ اب تیسرے سوال کا جواب بھی دے دیں۔ انہوں نے کہا "ہاں چلو میری کٹیا میں بیٹھتے ہیں اور تیسرے سوال کا جواب بھی تلاش کرتے ہیں۔"

وہ دونوں کٹیا میں داخل ہوئے سامنے ایک مریل کتا زبان باہر نکالے سانس لے رہا تھا۔ باباجی نے کوئی آواز دی تو ایک لڑکا آگیا۔ باباجی نے پوچھا "اس کو کچھ کھلایا ہے" وہ بولا "ابھی نہیں۔" کہنے لگے "جا گائے کا دودھ نکال کر ڈولی میں ڈال کے ادھر ہی لے آ۔" وہ بھاگتا گیا اور تھوڑی دیر میں دودھ کا بھرا ڈول لیے آگیا۔ اب باباجی نے کتے کی طرف اشارہ کیا "جا اس کو بھی لے آ" وہ کتے کو کھول کے لے آیا تو باباجی نے کتے کو مخاطب کرکے فرمایا "بھوکا ہے پی لے" اور کتا دودھ پر پل پڑا۔ جب اس کا پیٹ بھر گیا تو وہ واپس اپنی جگہ پر جاکے بیٹھ گیا۔

وزیر کو جواب لینے کی جلدی تھی۔ اس ساری خرافات کو اس کی عقل سمجھنے سے قاصر تھی۔ اس نے تیسرے سوال کا جواب طلب کیا تو باباجی نے ایک کٹورا دودھ کا بھر کر (کتے والے دودھ کا) وزیر کی طرف بڑھایا اور بولے یہ پی لو۔ پھر تیسرے سوال کا جواب دیتا ہوں۔ وزیر حیران کہ کتے کا جھوٹا انسان پی لے۔ بولا "باباجی یہ تو کتے کا جھوٹا ہے۔ میں کیسے پیوں؟" وہ بولے "اسی میں تیسرے سوال کا جواب پوشیدہ ہے۔" وزیر صاحب کو موت کا پھندہ نظر آیا تو سب کچھ بھول کر پیالہ پکڑا اور منہ سے لگانے ہی لگے تھے کہ باباجی نے کہا "بس بس پیالہ رکھ دے۔ یہی تیرے سوال کا جواب ہے۔ جب تو نے اللہ کو اپنی زندگی سے نکال کر فانی حیات کی ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی اور سوچ لیا کہ یہ گندے دودھ کا پیالہ ہی مجھے مرنے سے بچاسکتا ہے' تو تو نے اللہ سے تعلق توڑ لیا۔"

کہیں کسی محفل میں سنی ہوئی یہ حکایت ہر وقت میرے اردگرد گھومتی رہتی ہے۔ شاید اس حکایت کی کوئی بھی بات ہمارے لیے حقیقت نہیں رہی۔ ہم ہر وقت کہتے ہیں "موت تو برحق ہے" لیکن اس کے لیے کوئی تیاری نہیں کرتے۔ موت جو ہمارے چاروں طرف ناچ رہی ہے۔ ٹی وی پر بریکنگ نیوز آئی ہے" ایک اور خودکش دھماکہ تیس افراد لقمہ

اجل بن گئے۔ دس زخمیوں کی حالت تشویشناک ہے' اور اس کے ساتھ ہی کوئی زبردست قسم کا اشتہار گانے اور ڈانس کے ساتھ لگا دیا جاتا ہے کیونکہ مرنے والے کوئی اور تھے میں تو نہیں تھا۔ مجھے یاد ہے 1963ء میں مری جاتے ہوئے ایک بس حادثے کا شکار ہو گئی۔ جس میں تیس لوگ تھے جو سب فوت ہو گئے یقین کریں مری کی ساری مال روڈ دو روز تک سسکیاں لیتی رہی۔ ہر شخص سر جھکائے کھڑا تھا ہر ایک کی چشم گیر نم تھی۔ یوں جیسے مرنے والا کسی کا عزیز تھا۔ آج ہم بے حسی کی اس حد تک پہنچ چکے ہیں جب بندہ اپنی ذات کے دائرے سے باہر ہی نہیں نکلتا۔ میں' میری اولاد' میرا مال و دولت سب محفوظ ہے' تو بس سب اچھا ہے۔ ہم ہر فیصلہ کرتے وقت اللہ کی ذات کو بھلا کر اپنی مرضی کا فیصلہ کرتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ اصل فیصلے کرنے والی ذات تو وہی رب کائنات ہے۔

ہاں تو بات چل رہی تھی یوم آزادی کی' وہ دن جو رب کائنات نے اپنے فضل و کرم سے قائداعظمؒ کی محنت کے ذریعہ مسلمانوں کو ایک نعرے" پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ کی خوشی میں عطا فرمایا۔ لیکن یہ خوشی' یہ آزادی کی نعمت حاصل کرنے کے لیے کتنی قربانیاں دی گئیں۔ آج بار بار یاد دلانے کے باوجود کسی کی سمجھ میں نہیں آتا۔ آج کا پاکستان وہ تو نہیں ہے جس کا خواب اقبالؒ نے دیکھا تھا۔

مجھے یاد ہے حالانکہ اس وقت میری عمر چھ سال ہی ہوگی۔ گاؤں سے بھائی لوگ شہر جاتے تو نانی دادی اماں سبھی فکر مند بھی ہوتی تھیں اور اللہ سے ناطہ جوڑتے ہوئے آزادی کی دعائیں بھی کرتی تھیں۔ فسادات جہلم میں بھی ہو رہے تھے لیکن گاؤں کی فضا میں کچھ سکون تھا۔

لیکن اُس روز اس سکون کے سمندر میں ایک

بازیابی

امیر گھرانوں میں عجیب عجیب نسل کے کتے پالنے کا رواج ہے۔ ایک امیر خاتون کا لمبے بالوں والا چھوٹا سا گول مٹول کتا گم ہو گیا ہے۔ جو انہیں جان سے زیادہ عزیز تھا۔ انہوں نے اسے بہت تلاش کیا' انعام بھی رکھا مگر نہ ملا۔ آخر انہوں نے بھاری معاوضے پر ایک سراغ رساں کی خدمات حاصل کیں۔

سراغ رساں نے کتے کو تلاش کر لیا مگر اس کی حالت اچھی نہیں تھی وہ گیلا تھا اور مٹی میں لتھڑا ہوا تھا۔

"یہ تمہیں کہاں سے ملا؟ خاتون نے کتے کو گود میں لیتے ہوئے پوچھا۔

"قریبی مارکیٹ سے" سراغ رساں نے جواب دیا۔

"ایک بلڈنگ کے چوکیدار نے اسے لمبے سے ڈنڈے کے سرے سے باندھا ہوا تھا اور وہ اس سے کھڑکیاں اور روشن دان صاف کر رہا تھا۔"

(مرسلہ: حیدر ناظم۔ لاہور)

پھر آن گرا گاؤں کا ایک جوان شہید ہو گیا تھا۔ اونچا لمبا' جلال الدین تین سکھوں کو جہنم میں دھکیل کر خود جنت کی راہوں پر چل پڑا اور اس کا جنازہ گاؤں میں لایا جا رہا تھا۔ یہ سب تحریر کرتے ہوئے میرے بدن کے رونگٹے بار بار کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس چھوٹی سی عمر میں دیکھا جانے والا پہلا شہید کا جنازہ کس شان سے آ رہا تھا۔ ایک جم غفیر تھا۔ ہر کوئی کندھا دینے کے لیے بے تاب' بھائی نے مجھے گھر چلے جانے کے لیے کہا تو میں چپ کے کھڑی ہو گئی۔ جنازہ ایک دالان میں رکھا گیا۔ بڑے بڑے اور اونچے لوگوں کے درمیان سے گزرتی میں نہ جانے کیسے شہید کے پاؤں کے قریب جا پہنچی۔ ایک پاؤں جس پر پاک خون کی مہندی لگی تھی۔ وہ حنائی پاؤں آج بھی مجھے اپنے

چاروں طرف نظر آتا ہے۔ تو میں سوچتی ہوں کیا یہ لوگ اُن شہیدوں کے خون کی لاج بھی نہیں رکھ سکتے۔ یہاں ویلنٹائن ڈے منایا جاتا ہے۔ اتنی بے ہودگی اتنی بے حیائی کے ساتھ، یہ کیسا اظہارِ محبت ہے جو گلیوں میں آوارہ پھر رہا ہے۔ کتنی مقدس محبتیں تھیں جن کا جنازہ نکل چکا ہے۔ مادر پدر آزادی کی کا یہ حال ہے کہ ایک لڑکے نے عبایہ میں چھپی ایک لڑکی کو گلاب کا پھول پیش کیا اور ذرا سا جھک کر مسکرایا، تو ایک زوردار تھپڑ نے اس کی تواضع کر دی۔ کیونکہ عبایہ کے اندر اس کی اپنی بہن تھی اور یہ المیہ گلی گلی میں دہرایا جاتا ہے۔

سکولوں میں ہیلووین ڈے منایا جاتا ہے اور بچوں کو اُس روز ڈراؤنے لباس اور ماسک پہننے کو کہا جاتا ہے۔ یہ دن امریکہ میں اس سوچ کے ساتھ منایا جاتا ہے کہ بدروحیں ایک بار نکل کر چلی جاتی ہیں اور پھر سال بعد لوٹتی ہیں۔ کیا ہمارے ملک میں بدروحیں بھی سال بھر چھپی رہتی ہیں۔ ایک بار میں ایک سکول کی پرنسپل کے پاس خاص طور پر یہ پوچھنے گئی تھی کہ اس دن کے منانے کا مقصد کیا ہے تو انہوں نے ازراہِ کرم فرمایا ہمارے بچوں کو دنیا میں منائی جانے والی ہر تقریب کا علم ہونا چاہیے۔ کیا کوئی بھی قاری مجھے اس سوال کا مطمئن کرنے والا جواب دے سکتا ہے؟ ہمارے ملک کے بہت سے لوگ امریکہ میں مقیم ہیں کیا عیدالفطر یا عیدالاضحیٰ پر وہاں سارے ملک میں چھٹی ہوتی ہے۔ کیا وہ لوگ ہمارا یوم عاشور' یوم عید میلادالنبیؐ مناتے ہیں۔ ہمیں ہی کیوں ہر بے ہودہ رسم کو اپنے بچوں کے معصوم ذہنوں میں منتقل کرنا ضروری خیال کرتے ہیں۔

ہاں تو بات بہت دور جانکلی۔ ہمارے بچپن میں یوم آزادی' عید کی طرح منایا جاتا تھا۔ صبح کی نماز میں ملک کی سلامتی کی باقاعدہ دعائیں ہوتی تھیں۔ اس کلمے پر کاربند رہنے کی جسے بلند کر کے ہم نے اللہ سے یہ ملک لیا تھا۔ اس کے بعد پشاور کی پریڈ گراؤنڈ میں سارے لوگ پریڈ دیکھنے کے لیے چل پڑتے تھے۔ ہم چونکہ فوجی کے بچے تھے اس لیے ہم صبح صبح جا کر اپنی سیٹوں پر بیٹھ جاتے۔ ایک ولولہ' ایک جوش ہم سب بہن بھائیوں کے دلوں میں ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ رات بھر جاگنے کے باوجود تھکن نہیں ہوتی تھی اور یہ جاگنا گڈی کاغذ کی جھنڈیاں بنا بنا کر سوتر پر آٹے کی لئی سے لگانے اور گھر سجانے کے لیے ہوتا تھا۔ پریڈ گراؤنڈ پھر تھوڑی دیر بعد اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھتی تھی اور یقین جانیں یہ جذبہ آج بھی میرے دل میں موجود ہے۔

اب آج کا یوم آزادی ملاحظہ فرمائیں، سائیلنسر نکلی موٹرسائیکلوں کی قطاریں، ہر موٹرسائیکل پر تین تین سوار اونچی آواز میں گانوں کی گونج اور تیز رفتاری کا یہ عالم کہ الامان الحفیظ۔ چند سال قبل ہمیں ڈاکٹرز ہسپتال لاہور جانا تھا۔ سوچا صبح نماز کے فوراً بعد نکل چلیں، پھر مشکل ہو جائے گا یقین جانیں ساری نہر پر وہ طوفان بدتمیزی تھا کہ گاڑی چلانا مشکل ہو گیا۔

اس سے پہلے مال روڈ پر بھی یہی طوفان بدتمیزی بپا رہا۔ موٹرسائیکل سوار نہر سے ریگل چوک تک جاتے اور اسی شور کے ساتھ واپس لوٹتے۔ اگلے روز کے اخبار میں ایک کالم تھا۔ " کہتے ہیں گدھا جب اپنے جوش میں ہوتا ہے تو وہ بھاگتا ہوا تھوڑی دور جاتا ہے اور بھاگتا ہوا واپس آتا ہے اور گھنٹوں اس کا یہ عمل جاری رہتا ہے اور ان لڑکوں پر یہ مثال پوری اتر رہی تھی۔ میں نے لکھنے والے کی سوچ کی شاباش دی تھی۔

جب ہم چھوٹے تھے تو پاکستان کا جھنڈا بڑی عمارتوں پر صبح لہرایا جاتا اور مغرب کے وقت اتار لیا

جاتا۔ گھر گھر جھنڈے نہیں ہوتے تھے۔ آج کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں پاکستان کا صرف چاند ستارے والا خوبصورت پرچم ملتا ہی نہیں۔ جہاں کی خرافات ہیں کہ کہیں جھنڈے پر کوئی کارٹون بنا ہے اور کہیں کوئی اور...... اپنے عظیم پرچم کو اس بے حرمتی سے بچالیں اور پھر ستم بالائے ستم یہ ہے کہ پرچم لہرا تو دیا جاتا ہے۔ اسے اُتارنا کسی کو یاد نہیں ہوتا۔ گھروں پر لہرانے والا یہ عظیم پرچم ہوا کے تھپیڑوں اور سرگرم دھوپ کی تپش سے بے رنگ ہو کر اور بعض اوقات پھٹ کر مجھے خون کے آنسو رلاتا ہے۔ کوئی تو انہیں آداب پرچم آزادی سکھا دے۔

حضرت معاذؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:۔ اُمت مسلمہ شریعت پر اُس وقت تک ثابت قدم رہے گی جب تک تین چیزیں غالب نہ آجائیں۔ 1۔ علم اٹھالیا جائے۔ 2۔ ناجائز بچوں کی پیدائش کثرت سے ہونے لگے۔ 3۔ صقارون کا غلبہ جائے"۔ لوگوں نے پوچھا" یارسول اللہ ﷺ یہ صقارون کیا ہے اس سے کیا مراد ہے؟" نبی کریمؐ نے فرمایا" وہ لوگ جو آخری زمانے میں ہوں گے اور اُن کی باہمی ملاقات سلام کی بجائے ایک دوسرے کو لعنت ملامت کرکے ہوگی"۔

اس حدیث کی روشنی میں آج ہم اپنا جائزہ لیں کہ کہیں ہم ہی تو اس زمرہ میں نہیں آجاتے۔ فون کی گھنٹی بجتی ہے تو ہم اٹھا کر کہتے ہیں کہ "ہیلو" اس کا مطلب خود ہی اپنے ذہن میں تلاش کرلیجئے۔ السلام علیکم کا مطلب بھی ذہن میں لے آئیں۔ ہم ایک دوسرے سے ملتے ہیں دور سے ہاتھ ہلاتے ہیں اور ہائے کر دیتے ہیں۔ کیا ہائے درد اور افسوس کی گہرائیوں سے نکلا ہوا لفظ نہیں ہے۔ ہم سنتے ہیں رہا کہ ہوگیا اور منہ سے نکلتا ہے "ہائے میرے اللہ یہ کیا ہوا جبکہ یہاں اناللہ وانا الیہ راجعون کہنا چاہیے۔

جو پیغام ہم السلام علیکم کے ساتھ دوسرے کو پہنچاتے ہیں۔ اس کا اجر وثواب تو رب نے عطا فرمانا ہے لیکن وعلیکم السلام کہنے والا بھی ہمیں نیکیاں اور سلامتی لوٹاتا ہے۔

دراصل ہم نے لباس کی خوبصورتی، حیاداری اور عظمت کو چند "چیتھڑوں" میں بند کرکے اپنے آپ کو اس ٹولے کا روپ دے دیا ہے جو ہنس کی چال چلتے چلتے اپنی چال بھی بھول گیا۔ آج ہم آدھا تیتر آدھا بٹیر بنے اپنے آپ کو بہت اعلیٰ سمجھ رہے ہیں۔ بچوں کے ایک سکول میں، میں نے تین فیشن ایبل خواتین کو دیکھا۔ ایک نے لمبی سی قمیص کے نیچے بڑا سا ٹائٹس پلازو پہن رکھا تھا اور وہ اس فیشن میں بھی خاصی معتبر لگ رہی تھی۔ دوسری نے لمبی فراک نما قمیص شلوار کے اوپر پہن رکھی تھی اور دوپٹہ بھی چہرے کو خوبصورت بنارہا تھا۔ یہ ذرا منفرد سی لگی۔

آئیے اب آپ کو تیسری خاتون سے ملاتی ہوں۔ اچھی خاصی گوری چٹی موٹی تازی ایک خاتون مٹکتی چلی آرہی تھی۔ کالے رنگ کی شیفون کی عجیب تراش کی قمیص سلیولیس ہی تھی اور جب ہم نے نیچے نظر کی تو یقین جانیں میں ہی نہیں وہاں انتظار میں بیٹھی سبھی خواتین کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں کیونکہ سکن کلر کی مختصر سی ٹائٹس جو گھٹنوں سے ذرا برابر نیچے تھی اور ان کی پنڈلیاں بالکل ننگی تھیں۔ خدا کی قسم میرا جی چاہا اور کچھ نہیں تو کم از کم منہ سے ہی کچھ کہہ دوں۔ لیکن دستور زبان بندی بہت جگہوں پر کچھ بولنے نہیں دیتا۔ کیا ہمارے علمائے دین کوئی فتویٰ صادر نہیں کرسکتے۔ کیا اس بڑھتی ہوئی عریانی اور بے حیائی پر کوئی بندش نہیں لگائی جاسکتی، یقین جانیے اتنی بے حیائی میں نے کہیں اور نہیں دیکھی اور باہر کے ملکوں میں رہنے

انوکھی شرط

یمن کے شہری نے بیٹی کی شادی کیلئے اپنے ہونے والے داماد سے ایک منفرد شرط رکھتے ہوئے فیس بک پوسٹ پر 10 لاکھ لائکس کروانے کا مطالبہ کیا ہے۔ یمن کے شہر تعز میں سلیم اباش نامی شخص نے اپنی بیٹی کے لیے انوکھا حق مہر مقرر کیا ہے۔ اس نے اسامہ نامی اپنے ہونے والے داماد سے فیس بک پر کی گئی پوسٹ پر 10 لاکھ افراد سے لائکس کرانے کی شرط رکھی ہے۔ سلیم کا کہنا ہے کہ اگر اسامہ ایک ماہ میں 10 لاکھ لائکس کرانے میں کامیاب ہوگیا تو میں اپنی بیٹی کی شادی اس سے کردوں گا اور اگر ایسا نہ ہوسکا تو پھر میں اس کے لائکس کو دیکھ کر مزید وقت دوں گا یا اس رشتے کو ختم کرنے کا فیصلہ کروں گا۔ یمنی شہری سلیم اباش خود بھی سوشل میڈیا پر متحرک ہے اور اس کا کہنا ہے کہ وہ اس طرح اپنے ہونے والے داماد کی کارکردگی دیکھ سکے گا۔

(مرسلہ: عابد رحیم۔ کراچی)

چائے کا زیادہ استعمال ہڈیوں کے لئے نقصان دہ

حالیہ تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ چائے کا زیادہ استعمال انسانی جسم کی ہڈیوں کے لیے نقصان دہ ہے۔ امریکی محققین نے ایک تحقیق میں کہا ہے کہ چائے میں موجود فلورین کی زیادہ مقدار ہڈیوں اور دانتوں کو کمزور کرتی ہے اور زیادہ چائے پینے والے افراد ہڈیوں کی کمزوری کا شکار ہو سکتے ہیں۔ تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ چائے میں پانی کی نسبت ستر فیصد زیادہ فلورین موجود ہوتا ہے جو انسانی صحت کے لیے نقصان دہ ہے۔

(مرسلہ: خالد عمران۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ)

والی ہماری بچیاں تو بہت ہی محتاط ہیں۔ اُن کا لباس چاہے ٹراؤزر اور ٹی شرٹ ہی ہو۔ ڈھیلا ڈھالا اور باعزت ہوتا ہے۔

ایک اور واقعہ یاد آیا۔ ہم کسی قرآن خوانی میں بیٹھے تھے۔ خاتونِ خانہ جن کی شوہر کی وفات ہوئی تھی میرے قریب ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک جواں سالہ بچی اچھی خوبصورت سی اُن سے ملنے کے لیے آگے بڑھی۔ یقین جانیں میرے بدن کے تو رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ سلیولیس شرٹ اور ٹائٹس بچہ سکن کلر اور پھر آدھی پنڈلیوں تک باقی آپ خود سوچ لیں۔ کچھ موقعہ محل بھی ہوتا ہے یا نہیں وہاں بھی ہم چند مجبور عورتوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر سر جھکائے حالانکہ میں جانتی ہوں کہ سمجھ بوجھ کا یہ سب سے کم تر طریقہ ہے کہ برائی کو دیکھو اور آنکھیں بند کرلو۔ اللہ کا شکر ادا کرتی رہتی ہوں کہ اب بھی ہماری بہت سی بچیاں اپنے ملک اور اپنے مذہب کی روایات سے ہم آہنگ ہیں۔

یہ دیکھیں یہ بچے کچھ لکھنے رہنے ہیں؛ ادھر قلم کاغذ سنبھالو اُدھر اُن کی کوئی فرمائش آجاتی ہے۔ "نانو نانو پلیز میری بات سنیں۔ ننھا محمد چراغ ہاتھ میں پکڑنے کی کوشش کررہا تھا۔ سات سالہ یہ بچہ اکثر کوئی نہ کوئی سوال داغ کر میرا امتحان لیتا رہتا ہے۔ "ذرا جلدی سے مجھے یہ بتادیں کیا پاکستان بیٹری سے چلتا ہے؟" میں نے گھور کر اس کی طرف دیکھا تو اس نے انگلی ٹی وی کی طرف اٹھا دی" انکل وسیم روز کہتے ہیں" اب چلے گا پاکستان اور ساتھ وولٹا بیٹری دکھاتے ہیں کیا پاکستان کوئی بوپی ایسی ہے نانو" اور میں اس وقت سے سر پکڑ کر بیٹھی ہوں کہ ہم اپنی ایجادات کو متعارف کروانے کے لیے کتنے بے تکے نعرے بنالیتے ہیں۔ اگر ایک معصوم ذہن کے اندر یہ سوال ابھرا ہے تو ہم بڑے کیوں نہیں سوچتے کہ پاکستان کے نام کے ساتھ اپنی بے تکی اشیاء کے لیبل چسپاں نہ کریں۔

ایک نعرہ ہے صاف ہوگا پاکستان پاک ہوگا پاکستان۔ خدا کے بندو پاکستان تو ہے پاک وصاف۔ اپنے من اُجلے کرو، اپنی نیتوں کو پاک و صاف کرو۔ جن میں بے ایمانی، رشوت، سفارش، حرام خوری، ہر برائی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے، اُجلا پن ہمارے من کو چاہیے۔ پاکستان تو کلمہ لاالہ الا اللہ کے نعروں کے درمیان وجود میں آیا تھا۔ اس کی بنیادوں میں تو معصوم اور پاکیزہ لوگوں کا خون، جذبہ اور قربان ڈالی گئی تھیں۔ اس کی ہجرت تو مکہ سے مدینہ جانے والی عظیم ہجرت کی دوسری مثال تھی۔ جو اسلام کے نام پر وجود میں آئی۔ اسے کسی صابن سے گورا ہونے کی ضرورت نہیں ہے اگر گورا ہوتا ہے تو ہمارے گندے وجود کو اُجلا اور گورا ہوتا ہے۔ ہمارے اُن احساسات کو اُجلے پن کی ضرورت ہے جو گندی چیلوں کی طرح نہر کنارے پھینکے جانے والے چھچھڑوں پر اسنڈ اسنڈ کر آجاتی ہیں۔ ملک کو نہیں ہمیں دولتا بہتری کی ضرورت ہے تاکہ اپنے نفس کو بہتری اور انسانیت کے جھنڈے تلے لا سکیں۔ اس ملک کو رب العزت نے ہر طرح سے مالا مال کر رکھا ہے۔ آئیں ہم اپنے اذہان کو نیک نیتی کی طرف لانے کا وعدہ کر کے اس ملک کی فلاح و بہبود کے لیے تن من دھن سے کوشش شروع کر دیں تاکہ کوئی بچہ وہ سوال نہ کرے جس نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیے ہیں۔ اور میں سوچ رہی ہوں کہ ہم اپنی نئی نسل کو کیا دیے جا رہے ہیں۔

دعا کیا ہے؟ ایک عبادت، ہم کتنی ادھوری دعائیں کرتے ہیں، آج کل ٹی وی پر ایک دعا کی جاتی رہی۔ "دعا ہے اس رمضان سلامت رہے پاکستان"۔ یہی دعا اگر یوں ہوتی تو مکمل ہو سکتی تھی۔

دعا ہے اس رمضان ہمیشہ سلامت رہے پاکستان

پھر ذرا اس وقت کا تصور کریں جب ستائیسویں رمضان کی شب جو لیلۃ القدر ہے۔ ہمارا ملک آزاد ہوتا ہے، لوگ کن کن مراحل سے گزرتے ہوئے یہاں آتے ہیں۔ ہم آج بھی حالت جنگ میں ہیں۔ ہمیں سب کچھ کرنا ہے لیکن حدود میں رہ کر، اسراف سے منع کرنے والے سردار دو عالم کا حکم مان کر اور یہ سوچ کر کہ ہمیں ابھی بہت دور جانا ہے۔ اس ملک کی ترقی کے لیے۔ اس کو دنیا میں اونچا مقام دلانے کے لیے۔

میں تو پاگل ہوں، عنقریب چلی جاؤں گی۔ اس دعا کے ساتھ اجازت چاہتی ہوں کہ، اور وطن سدا سلامت رہے۔ ہماری آنے والی نسلوں کے لیے اتنی شان و شوکت کے ساتھ کہ ہم ہر جگہ ہر گھڑی سر اٹھا کے چلیں، ہمیں اپنے پاکستانی ہونے پر فخر ہو، امریکہ کے کسی ایئرپورٹ پر ہم جیسے بڑی عمر کے لوگوں کو جس بے جا میں دو دو گھنٹے اس لیے نہ روکا جائے کہ یہ پاکستان سے آئے ہیں اور بے جواز تلاشی لے لے کر ہراساں نہ کیا جائے۔ میں رہوں نہ رہوں۔ میرا وطن میری ارض پاک سلامت رہے۔ اللہ کے کرم سے پوری آن بان اور شان کے ساتھ اللہ سب کا نگہبان ہو۔ اپنی آنے والی نسلوں کو ایک ایسا پاکستان منتقل کریں جس میں کوئی گند نہ ہو۔ کوئی برائی نہ ہو۔ رشوت اور سفارش نہ ہو۔ ملاوٹ اور چور بازاری نہ ہو۔ جھوٹ اور غیبت نہ ہو۔ وہی پاکستان جس کا خواب علامہ اقبالؒ نے دیکھا اور ایک کمزور بیمار مگر مضبوط اعصاب والے قائداعظم محمد علی جناحؒ نے روز و شب محنت کر کے جس کو ہمارے لیے حاصل کیا اور خود چلے گئے۔ وہ ایسا ملک دیکھنے کے خواہاں نہیں تھے اللہ انہیں اپنے جوار رحمت میں رکھے اور ان کے مراتب بلند ہوتے رہیں۔ (آمین)

نیم شب ....!

ایس۔ امتیاز احمد کراچی

(سمندر پار سے)

ٹائمز اخبار، جس نے پہلی واردات کی خبر آخری صفحے پر دی تھی اس نے دوسرے قتل کی خبر سرخی کے ساتھ پہلے صفحے پر شائع کی۔ "گلا کاٹنے والے قاتل کی واپسی" یہ سرخی ٹریکر کے لیے بہت اہم ثابت ہوئی کیونکہ ٹی وی کے لیے بہرحال یہ ایک سرکاری حوالہ تھا۔ قاتل کی خبر اب وقت کی اہم ترین خبر بن گئی تھی۔

ایک موذی کردار کی کہانی جو رات کے اندھیرے میں قتل کے مناظر فلماتا تھا......!

ٹریکر خون آشام چمگادڑ کی مانند ہو گیا تھا۔ اس نے واقعتاً خون نہیں پیا تھا بلکہ اس بھیانک منظر کی فلم بندی کی تھی۔ سورج غروب ہوتے ہی وہ مردہ جسموں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا تھا۔ پولیس نے اسے شہر میں ہر طرح کی مصروفیت برقرار رکھنے کی اجازت دے دی تھی۔ وہ ایک ماہر کیمرہ مین تھا۔ اسے توقع تھی کہ ایک دن اس کی کہانی نہ صرف اسے شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دے گی بلکہ اس کے



ذریعے وہ خوش حال اور دولت مند آدمی بھی بن جائے گا۔

اس کی کہانی کا آغاز نصف شب کے بعد سے صبح چھ بجے تک ہونا ضروری تھا۔ اس وقت تمام ٹی وی اسٹیشنوں کے نیوز روم بند ہو جاتے تھے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو ٹی وی والوں کو اس کی کیا ضرورت تھی۔ ظاہر ہے وہ ایسے ہی مناظر خود بھی فلمبند کر سکتے تھے۔

وہ ہر رات اُنگلیاں اُلجھا کر دُعا کرتا کہ ٹی وی اسٹیشن سے متعلق ہر آدمی خواب خرگوش میں کھو جائے تاکہ وہ جو کچھ منظر عام پر لانا چاہتا ہے اس کی بھنک بھی کسی کے کان میں نہ پڑ سکے۔ وہ اس کام میں مسلسل جدوجہد کر رہا تھا اور اب اُسے اپنے کام کے تمام نشیب و فراز کا علم ہو گیا تھا۔

زیکر اپنی یادداشت پر ہنستا اور خوفناک مناظر اس کے دماغ میں رقص کرتے رہتے تھے۔ ابھی یہ کل ہی کی بات تھی کہ وہ اپنی چادر کے نیچے دبکا چیخ رہا تھا۔ رول کرو...... رول کرو، کیمرہ سے متعلق افراد اس منظر پر بروقت نہیں پہنچے تھے ایک حادثے کا منظر تھا اور اسے دوبارہ حقیقی انداز میں سامنے لانا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔

اس قسم کے حادثات کی اس کے ذہن میں کمی نہیں تھی۔ وہ بچپن میں بہت سے مناظر خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک مکمل کہانی تھی۔ یہ کہانی ہر لحاظ سے اس کی اپنی تھی اور اس سے وہ منافع کمانے کی فکر میں تھا۔ وہ پوری قوت سے قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ اس کام میں مہارت کی قطعاً ضرورت نہیں تھی۔

وہ بے ثمر رات گزارنے کے بعد گھر جا رہا تھا کہ پولیس ریڈیو سے اُسے ایک لاش کے متعلق معلوم ہوا۔ لاشوں کی کوئی زیادہ اہمیت نہیں تھی کیونکہ ان کی فلمبندی میں صرف چند فٹ فلم کا زیاں ہوتا تھا لیکن وہ اس حادثے کے مقام سے ایک میل دور تھا۔ اس لیے وہ یہ کہے بغیر نہ رہ سکا۔ ''کیا مصیبت ہے!''۔

وہ پچھلی پٹرول کار سے پہلے اس مقام پر پہنچ گیا تھا۔ اب وہ خوش دلی سے سیٹی بجاتا ہوا ہائی وڈ کی طرف جا رہا تھا۔ جب اس نے چینل کے سامنے گاڑی روکی تو مارے جوش کے اس کی بُری حالت تھی۔ اس نے اپنی پک اپ کی کھڑکی سے منہ باہر نکالا اور گاڑی کی طرف دیکھ کر زندہ دلی سے چیخ پڑا لیکن گارڈ کو شاید اس کے انداز سے کوئی دلچسپی نہیں تھی وہ اس کی طرف سخت نگاہ سے گھورتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں شناسائی کی ہلکی سی جھلک بھی نمودار نہیں ہوئی تھی حالانکہ وہ اس سے پہلے بارہا مل چکے تھے اور اس طریق کار سے بھی وہ کئی بار گزر چکے تھے۔

''تمہیں کیا کام ہے؟'' گارڈ نے سخت لہجے میں دریافت کیا۔

''نیوز روم کے لیے فلم لایا ہوں'' زیکر ہمیشہ کی جواب دیتا تھا۔

''کس سے ملنا چاہتے ہو؟ مجھے اپنے رجسٹر میں نام درج کرنا پڑتا ہے۔''

''وائن گوسٹ۔ انچارج نیوز ایڈیٹر''۔

''وہ چھ بجے سے پہلے کسی سے نہیں ملتا''۔

''بہر حال میں اس سے ابھی اور اسی وقت ملنا چاہتا ہوں''۔ زیکر نے کہا۔

زیادہ باز پرس کیے بغیر گارڈ نے بڑی سرد مہری کے ساتھ اُسے انگوٹھے سے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ اس نے گاڑی بڑھائی اور سیدھا نیوز بلڈنگ کے اس حصے میں پہنچ گیا جہاں پارکنگ ممنوع تھی۔ اس نے بڑی کاہلی سے اسٹیئرنگ کے نیچے دبا ہوا سیٹ نکالا اور گوسٹ سے ملاقات کے لیے دروازے کی طرف بڑھا۔

انچارج نیوز ایڈیٹر اُسے ایک نوعمر لڑکا دکھائی دیتا تھا۔ اس کی عمر چھبیس سے کسی طرح زیادہ نہیں تھی۔ جیسے ہی اُس نے زیکر کو دیکھا وہ اپنے سامنے رکھے ہوئے ایک ٹیلی فون پر کسی سے گفتگو میں مصروف ہوگیا۔ وہ زیکر جیسے آدمی کو انتظار کی زحمت دیکر بہت خوش ہوتا تھا۔ اس لیے یہ بات اس کی عادت میں شامل ہوگئی تھی۔

زیکر نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لگایا اور دھوئیں کا بادل سا اُڑا دیا۔ وہ جانتا تھا کہ نیوز ایڈیٹر تقریباً سبھی ایک ہی قسم کے ہوتے ہیں۔ جب سے زیکر نے فلمبندی کا کام شروع کیا تھا۔ اس نے ان طویل برسوں میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں دیکھی تھی۔ وہ ہر فلم خریدنے کو ایک ایسا مسئلہ بنا دیتے تھے کہ زیکر کو کسی خطرناک جنگ کا گمان ہوتا تھا۔

"جلدی کرو......" زیکر غرایا "میرے پاس ایک اہم فلم ہے"۔

کوسٹ نے اشارہ کیا اور پھر زیکر کی طرف پشت کر کے فون کی طرف متوجہ ہوگیا۔

زیکر تلملا کر رہ گیا۔ پرانے وقتوں میں ایسا نہیں ہوتا تھا اس جیسے آزاد رہ کر کام کرنے والوں کی بہت مانگ تھی۔ ان دنوں رات کے وقت حادثات کی فلمبندی کرنے والوں کی کمی تھی اس لیے زیکر کو کبھی نظرانداز نہیں کیا گیا تھا۔ اب اس کے پاس ذاتی عملہ تھا جن میں ساؤنڈ مین سے لیکر باقی ضروری آدمیوں تک سب ہی موجود تھے۔

پہلے تو لوگوں نے کبھی ٹی وی نیوز کے متعلق سنا بھی نہیں تھا۔ سولہ ملی میٹر کیمرے کی کارکردگی کے بارے میں بہت کم لوگوں کو معلوم تھا۔ ان دنوں زیکر کی مانگ تھی۔ رپورٹر اسے نام کے پہلے حصے سے پکارتے تھے۔ اس کے لیے دوپہر کا کھانا خرید کر لانا اُن کے معمول میں شامل تھا۔ وہ اس کی ہر بات پر عمل کر کے سمجھتے تھے جیسے صرف اسی طرح اس کی خوشنودی حاصل ہوسکتی تھی۔ نہ معلوم کب ان کا مستقبل زیکر کی فلم سے وابستہ ہو جائے۔

زیکر زیر لب بڑبڑایا......اور اُس یونین کو کوسنے لگا جس کی وجہ سے ٹی۔ وی کے محکمے میں اس قدر انقلاب آگیا تھا۔ آج کل تو وہ بہ مشکل پیٹ بھرنے کی حد تک کما رہا تھا۔ بیوی کی ضرورتوں کو پورا کرنا تو محض خیال ہو کر رہ گیا تھا۔ اسی لیے وہ بالکل تنہا تھا کوئی اسے ایک عام آدمی سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا جس کا نام زیکر تھا۔ نیوز روم میں اُسے برداشت کرنے کی صرف ایک وجہ تھی اور یہ کہ زیکر رات کے ان لمحات میں حادثات کی فلمبندی کرتا تھا جب ساری کائنات میٹھی نیند کھوئی ہوتی ہے۔

وہ اس زندگی سے مطمئن نہیں تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح ماضی واپس آجائے۔ وہ اپنی کھوئی ہوئی زندگی کو دوبارہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی زندگی روشنی کے ہنگاموں سے ہمکنار ہو جائے۔

کوسٹ نے فون بند کیا اور زیکر کی طرف متوجہ ہوا۔ مجھے آج دن بھر کے لیے جن فلموں کی ضرورت تھی انہیں پہلے سے خرید چکا ہوں"۔

زیکر نے ایک نگاہ گلاس کی طرف ڈالی جہاں نصف درجن خبروں کے نشانات موجود تھے۔ وہ جانتا تھا کہ اس تعداد سے دوگنا زیادہ خبریں بھی آجائیں تو صرف ایک گھنٹے کا پروگرام مکمل ہوسکتا ہے۔ "اس وقت میں جو کچھ لے کر آیا ہوں تمھیں اس کی ضرورت محسوس ہوگی"۔ اس نے کہا۔

"تمام لوگ یہی کہتے ہیں، پھر بھی بتاؤ کیا خاص بات ہے؟"

"یہ ایک قتل کی واردات ہے"۔ زیکر نے کہا۔

کوسٹ کی آنکھیں سکڑ گئیں لیکن اس نے

قبولیت کی چمک ظاہر نہیں ہونے دی!

''گلا ایک کان سے دوسرے کان تک کاٹ دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ دوسری خوفناک باتیں بھی موجود ہیں۔'' ژیکر نے کہا۔

گوسٹ نے ایک دراز جھٹکے سے کھولی اور فلم خریدنے کا فارم نکالا، ژیکر کا نام پُر کرنے کے بعد اس نے دریافت کیا۔

''اس کے علاوہ تم نے کیا کچھ معلوم کیا ہے؟''

''شکار ایک ساٹھ سال کا بوڑھا آدمی تھا۔ مین اسٹریٹ پر واقع ایک کیفے کی عقبی گلی میں اس کی لاش دریافت کی گئی ہے۔''

''مین سٹریٹ'' گوسٹ نے مداخلت کی۔ ''آخر وہ کون تھا؟ کیا کوئی بدمعاش؟''۔

''شرابی......!'' ژیکر نے کہا۔

ایڈیٹر زیرلب بڑبڑایا ''اس دور میں ایک یا دو پیگ شراب پینا عام بات ہے۔ اس میں انسانی زندگی کی دلچسپی کی کیا بات ہے؟''

''میں وہ واحد آدمی ہوں جس کے پاس لاش کی فلم موجود ہے''۔

گوسٹ نے غیر دلچسپی کا اظہار کرنے کے لیے انکار میں گردن ہلائی۔ ''کیا تمہیں یقین ہے کہ ایسا ہی ہوا ہے''۔

''حادثے کے بعد میں واحد کیمرہ مین تھا جو اس جگہ موجود تھا۔ میرا کام ختم ہوا تو پولیس نے لاش اٹھوا دی تھی۔ اس وقت کارونر لاش پر کام کر رہا ہے۔ میرا خیال ہے اس طرح کسی اور فلم کا ہر امکان از خود ختم ہو جاتا ہے''۔

''ٹھیک ہے۔ ہم تمہاری فلم کو دیکھیں گے''۔

ژیکر نے اثبات میں سر ہلا دیا وہ جانتا تھا کہ آدھی جنگ ختم ہو گئی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ جب فلم کو تکنیکی مراحل سے گزارنے کے لیے منظور کرلیا جاتا ہے تو عموماً وہ فلم خرید لی جاتی ہے ورنہ اس قدر درد سر مول لینے سے کیا فائدہ؟

''ادائیگی کیا ہوگی......؟'' ژیکر نے سوال کیا۔

''اگر ہم نے اسے قابل استعمال سمجھا تو حسب معمول پچھتر ڈالر کی ادائیگی ممکن ہے''۔

''یہ ایک اہم فلم ہے۔ اس کی قیمت بھی زیادہ ہونی چاہیے''۔

''رات بھر کے کام کا معاوضہ اس سے زیادہ کیا ہوسکتا ہے میرا خیال ہے میں نے پہلے ہی زیادہ پیش کش کردی ہے......'' ایڈیٹر نے رکھائی سے کہا۔

''گویا اگر میں ایک ہفتے میں ایسی فلم حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں تو میری ضرورتوں کے لیے کافی ہوگی''۔ ژیکر نے تلخ لہجے میں کہا۔

گوسٹ نے لاپرواہی سے کندھے جھٹک دیے۔ قتل کی وارداتوں کا صاف مطلب ہے ڈھیر سارا خون۔ رات کے کھانے پر دکھائے جانے والے پروگرام میں ہمیں بہت محتاط رہنا پڑتا ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ کوئی ایسا منظر دیکھ کر ہمارا پروگرام دیکھنے والے اپنی بھوک ہی کھو بیٹھیں''۔

''میں اپنے کام میں محتاط ہوں'' ژیکر نے کہا۔ ''میں نے ان زاویوں سے فلم بندی کی ہے کہ ایسا نہیں ہوگا''۔

''ٹھیک ہے ہم ابھی دیکھ لیتے ہیں۔ گوسٹ نے ڈرامائی انداز میں اپنے ڈیسک اسپیکر پر ہاتھ مارا تاکہ ژیکر بھی صورتحال سے آگاہ رہے۔ ایڈیٹر کا یہ دوسرا حربہ تھا۔ جس سے وہ ژیکر جیسے کیمرہ مینوں پر قابو پالیتا تھا۔ بعض اوقات پولیس والے اس واردات کی کہانی کو انتہائی بیزار کن بنا دیتے تھے اس لیے فلم کا تاثر بھی کم ہو جاتا تھا۔

لیکن اس بار جاسوس غیر متوقع طور پر باتونی ثابت ہوا۔ ''یہ ژیکر تو خون آشام ہے۔ اس نے

لاش کے معاملے میں ہم سے بھی اولیت حاصل کرلی۔ کیا ہم اس وقت سپیکر پر ہیں؟"

"ہاں......" ایڈ بٹر نے کہا۔

"غالباً زیگر بھی تمہارے پاس ہی موجود ہے؟"

ایڈ بٹر کے حلق سے بے حد عجیب آواز نکلی جو غراہٹ سے مشابہ تھی۔

"اس سے کہو کہ فلم کا بغور مشاہدہ کرے۔ اس بار ایک عجیب قاتل سے پالا پڑا ہے۔ اس نے لاش پر کچھ اس قدر کام دکھایا ہے کہ ہم تفصیلات کو زیادہ پھیلانا نہیں چاہتے ورنہ تم جانتے ہی ہو کہ ہم لوگوں پر ان باتوں کا کیا اثر ہوتا ہے۔" جاسوس کی آواز سنائی دی۔

"ہم اسے احتیاط سے پیش کریں گے۔" گوسٹ نے وعدہ کیا۔ "کیا تم اس واردات کے بارے میں کوئی سرکاری بات بتا سکتے ہو؟"

"ابھی وقت نہیں آیا۔ فی الحال شناخت بھی عمل میں نہیں آئی۔ ہمارا خیال ہے کہ آلہ قتل ایک ریزر تھا لیکن تمہیں کارونرز کی رپورٹ کا انتظار کرنا پڑے گا اس سے پہلے کوئی بات نشر نہ کرنا۔"

گوسٹ نے سلسلہ منقطع کردیا اور زیگر کی طرف متوجہ ہوا۔

"چونکہ ہم اس واردات کے بارے میں کوئی خیالی بات نہیں کہہ سکتے اس لیے فلم کی قیمت کچھ زیادہ ہونی چاہیے۔" زیگر نے شکایت کی۔ "اب پرانے وقتوں جیسی بات نہیں ہے۔ کیا تمہیں کینیڈی کی وہ کہانی یاد ہے جس نے مجھلی بیو میں جنم لیا تھا؟"

"وہ بات دوبارہ منظر عام پر نہیں آسکتی۔"

زیگر کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "یہ 2006ء کا واقعہ ہے، ممکن ہے 2007ء میں پیش آیا ہو۔ ان دنوں کینیڈی ساحل کے ساتھ ساتھ گاڑی چلا رہا تھا کہ اچانک اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ چند لمحے سمندر کی جھاگ میں چہل قدمی کر کے لطف اندوز ہولے۔ اس وقت صرف ایک کیمرہ مین وہاں اتفاق سے موجود تھا۔ اس نے فلم بندی کی اور بعد میں اس فلم کا اُسے ایک ہزار ڈالر معاوضہ ملا تھا۔"

"وہ ایک اتفاق تھا" گوسٹ نے کہا۔ "اب ایسا اتفاق دوبارہ کبھی پیش نہیں آسکتا۔ اب سٹیشن بہت بڑے ہوگئے ہیں اور فلم کا عملہ بھی بہت بڑھ چکا ہے۔"

"نہیں۔" زیگر نے احتجاج کیا۔ "اب بھی میرے پیشے کے لوگ کوئی اہم کہانی منظر عام پر لاسکتے ہیں۔" گوسٹ قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

ایک ہفتے بعد ایک اور لاش پائی گئی۔ اس لاش کا گلا بھی بُری طرح کاٹ دیا گیا تھا اور اس منظر کی فلم بندی میں بھی زیگر سب پر سبقت لے گیا تھا۔ چینل نے اسے اس فلم کی ایک سو ڈالر ادائیگی کی تھی۔

ٹائمز اخبار، جس نے پہلی واردات کی خبر آخری صفحے پر دی تھی اس نے دوسرے قتل کی خبر سرخی کے ساتھ پہلے صفحے پر شائع کی۔ "گلا کاٹنے والے قاتل کی واپسی" یہ سرخی زیگر کے لیے بہت اہم ثابت ہوئی کیونکہ ٹی وی کے لیے بہرحال یہ ایک سرکاری حوالہ تھا۔ قاتل کی خبر اب وقت کی اہم ترین خبر بن گئی تھی۔

جب تیسری لاش دریافت ہوئی تو زیگر نے ایک ہم پیشہ کیمرہ مین کو ساتھ ملالیا۔ اس بار اگرچہ فلم زیادہ اہم نہیں تھی لیکن ایڈ بٹر ڈیڑھ سو ڈالر دینے پر آمادہ ہوگیا۔ وہ جانتا تھا کہ دوسرے چینل سودے بازی پر آمادہ ہیں۔

زیگر اب ایک اہم کیمرہ مین بن چکا تھا۔ اس نے مقابلے کی بھی پروا نہیں کی تھی۔ وہ اس پیشے

کے ساتھ ایک طویل عرصے سے وابستہ تھا۔ اب اُسے یقین ہو رہا تھا کہ قتل کی اگلی واردات اس کے لیے جادوئی نمبر کی حامل ہوگی۔ ایک ایسا جادوئی عدد جو اس کے لیے خوش قسمتی کا مظہر ہوگا۔ ایک ایسی واردات جس کے ذریعے وہ بہت زیادہ کمائے گا۔ ممکن ہے اس واردات کی فلم کینیڈی کی کہانی سے بھی سبقت لے جائے۔ اس نے یہ بات دل کی گہرائیوں سے محسوس کی تھی۔

خلاف توقع صورت حال بگڑ گئی۔ ٹی وی اسٹیشن نے پولیس سے ساز باز کرلی۔ ان کے درمیان ایک معاہدے نے جنم لیا۔ پولیس اس معاہدے کے مطابق براہ راست ٹی وی کے عملے کو ترجیح دے گی۔

"بہرحال......" کوسٹ نے زیکر سے کہا" دیوانے قاتل روزانہ تو وارداتیں نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ تم آزادہ کیمرہ مین ہمیں لوگوں کے تاثرات فراہم نہیں کرسکتے۔ اس حادثے کے دوران بعد میں تماشائیوں کی آوازیں بھی فلم کے ساتھ موجود ہوں تو فلمی مناظر میں حقیقت کا عنصر بڑھ جاتا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ زیکر تم نے سودے بازی کا جو بازار گرم کر رکھا تھا وہ اب ٹھنڈا ہوگیا ہے"۔

"تمہیں اپنے یہ الفاظ واپس لینے پڑیں گے" زیکر نے دل میں سوچا اور پیشانی پر سلوٹیں ڈال کر ایڈیٹر کو گھورنے لگا۔ اس بات سے بھی اُسے سکون حاصل نہ ہوسکا۔ وہ پچپن برس کا ایک پیشہ ور رپورٹر تھا اس عمر میں عموماً دوسرے لوگ ریٹائرڈ ہونے کا منصوبہ بناتے ہیں جبکہ وہ ایک دیوانے قاتل اور اس کے شکار کا متلاشی رہتا تھا۔

"مجھے مددگار رپورٹر بنانے کے بارے میں کیا خیال ہے؟" زیکر نے مؤدبانہ لہجے میں کہا۔" تم جانتے ہو کہ کبھی نہ کبھی تمہارا عملہ بھی ناکام ہوسکتا ہے"۔

کشادہ آنکھوں سے ایڈیٹر نے اُسے گھورا" تم......؟ نہیں زیکر...... اگر میرا ایک عملہ ناکام رہتا ہے تو میرے پاس ان کی مدد کے لیے دوسرے آدمیوں کی کمی نہیں ہے اور پھر تم یونین کے ساتھ وابستہ بھی نہیں ہو......"۔

جب وہ نیوز روم سے باہر نکلا تو اس کا دماغ غصے سے کھول رہا تھا اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ٹی وی کے عملے کو ہر حال میں نیچا دکھائے گا۔

وہ تھکا تھکا سا اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر سوچ کی گہری سلوٹیں تھیں۔ اور وہ غور کر رہا تھا کہ رات شروع ہونے میں ابھی کتنی دیر باقی ہے۔ کئی بیزار کن گھنٹے گزارنے کے بعد کہیں کام کا وقت شروع ہوگا۔ ایسے میں گھر جانے سے کیا فائدہ؟ صورت حال اس حد تک بگڑ گئی تھی کہ پیشہ ور رپورٹروں کا کام تقریباً ختم ہوگیا تھا۔ زیکر کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے اندر کوئی چیز ریزہ ریزہ ہوگئی ہو۔

"میں بھی ان شرابیوں کی طرح آوارہ گرد ہوگیا ہوں" وہ زیر لب بڑبڑایا۔

"بہرحال اب مجھے کسی نئے انداز سے کام شروع کرنا پڑے گا" اس نے شہر کی طرف اپنی گاڑی پوری رفتار سے اُڑانی شروع کردی۔

اگلے روز صبح چار بجکر تیس منٹ پر اس نے کوسٹ کے گھر فون کیا۔

"تمہیں میرے گھر کا نمبر کہاں سے ملا ہے؟" ایڈیٹر غرایا۔

"اس بات کو چھوڑو"۔ زیکر نے کہا" میں ایک فیصلہ چاہتا ہوں ابھی اور اسی وقت"۔

"کیا کوئی نئی واردات ہوگئی ہے؟"

"تم ایک دہرے قتل کی فلم کا کیا معاوضہ

دو گے۔ وہ مقتول جن کے گلے کٹے ہوئے ہیں؟؟"
"تم جانتے ہو کہ میرا عملہ کام کر رہا ہے"۔
"وہ ہراکلف اور قاتل سے مخصوص انٹرویو؟"
"ہیں..... کیا کہا انٹرویو..... کیا تمہیں یقین ہے؟"
"میں دو ہزار معاوضہ چاہتا ہوں" زبکر نے کہا "کینیڈی کی فلم کا دوگنا معاوضہ....."
گوسٹ کی طرف سے جواباً ایک غراہٹ سنائی دی۔
"میں اتنا بڑا فیصلہ ذاتی طور پر نہیں کر سکتا" گوسٹ نے کہا۔" مجھے انتظامیہ سے رابطہ قائم کرنا پڑے گا"۔
"میں صرف پانچ منٹ انتظار کر سکتا ہوں"۔
"تمہارا نمبر کیا ہے؟"
زبکر نے پے فون کا نمبر دیکھا اور گوسٹ کو بتادیا۔
ٹھیک چار منٹ بعد ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور گوسٹ کی آواز سنائی دی۔ ایک ہزار بہت بڑی قیمت ہے ہم اس سے زیادہ نہیں دے سکتے......"۔
"میں اس سے زیادہ کما سکتا ہوں"۔
ان کے درمیان سودے بازی شروع ہوگئی۔ بالآخر ایڈیٹر نے کہا" بارہ سو سے زیادہ نہیں یہ انتہائی معاوضہ ہے"۔
زبکر مسکرایا۔ بارہ سو کا معاوضہ اُسے وقت کا سب سے مہنگا رپورٹر بنادے گا۔ وہ جانتا تھا کہ ٹی وی نے اس سے پہلے کبھی اتنی رقم ادا نہیں کی۔ اس نے گوسٹ کو ایڈریس دیا اور کہا تمہارا عملہ وہاں کتنی دیر میں پہنچ جائے گا؟"
"پندرہ منٹ۔ زیادہ دیر نہیں لگے گی"۔
"ٹھیک ہے۔ مجھے منظور ہے"۔ زبکر نے کہا اور سلسلہ منقطع کردیا ٹیلی فون بوتھ سے باہر نکلا اور تیزی سے اپنی گاڑی کی طرف بڑھا۔ اس نے دروازہ کھولا تاکہ کار کی روشنی میں وقت دیکھ سکے۔ اس دوران وہ سگریٹ کے گہرے کش لگا رہا تھا اور اس کے ہونٹوں پر پراسرار مسکراہٹ تھی۔
نیند کی کمی کے باعث اس کا سر چکرا رہا تھا۔ اس نے سستی سی شراب بھی پی رکھی تھی جس کے اثرات اس کی کھوپڑی میں طوفان اٹھا رہے تھے۔
اس نے گاڑی کا دروازہ مقفل کیا اور فقفھ سٹریٹ برج کی طرف لڑکھڑاتا ہوا چل دیا۔ دونوں آوارہ گرد شرابی اس جگہ موجود تھے جہاں وہ انہیں چھوڑ کر گیا تھا۔ وہ اس وقت بے ہوشی کے عالم میں تھے۔
زبکر کا دل شدت سے دھڑک رہا تھا اور ان دونوں پر کیمرہ فوکس کرنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ میں چاہتا ہوں کہ مجھے ہمیشہ یاد رکھا جائے۔ وہ زیرلب بڑبڑایا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے چہرے پر شہرت کی روشنی صاف محسوس کی۔ اس نے آنکھوں سے پسینہ صاف کیا تاکہ وہ کیمرہ ٹھیک سے سیٹ کر سکے۔ اس لمحے زبکر نے محسوس کیا کہ چینل کی تھیم نیوز ویگن آرہی ہیں۔
اب اس کے پاس قطعاً وقت نہیں تھا۔ اس کا قہقہہ پل کے نیچے محدود جگہ میں گونج اٹھا۔ پولیس کو اصل قاتل کا سراغ لگانے لگاتے ایک عرصہ گزر جائے گا وہ تمام چالبازیوں سے آگاہ تھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ اس کے ارادے کیا ہیں؟
چند لمحے وہ کھڑا موزوں ترین زاویے کا انتخاب کرتا رہا پھر اُس نے جیب سے ایک تیز دھار ریزر نکالا۔ وہ آگے بڑھا دونوں آوارہ گرد بے ہوشی کی وجہ سے مداخلت کے قابل نہیں تھے۔ اس کے سامنے چند ہی لمحوں کے بعد دو لاشیں تھیں جن کے گلے کٹے ہوئے تھے اور وہ فلمبندی میں مصروف تھا۔

......❁......❁......



قانونی جرم

یوسف جمال

اُس کی سنجیدگی اور اطمینان دیکھ مسٹر رچرڈسن اور بھی خوف زدہ ہو گئے۔ ایسے لوگ عام مجرموں سے کہیں زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔ مسٹر رچرڈسن تنخواہ جبری کا تصور کرنے ہی بُری طرح گھبرا گئے۔ انہوں نے نہایت سعادت مندی سے چالیس ہزار پونڈ کی گڈیاں جانسن کے سامنے میز پر رکھ دیں۔

ایک وکیل کی زندگی کا انقلابی واقعہ، اُس نے کامیابی کا راز جان لیا تھا

وہ ضرور ایک کامیاب وکیل ہوتا مگر کامیابی کے لیے کئی باتیں لازمی تھیں مثلاً اُس کا دفتر فیشن ایبل علاقوں کی کسی جدید ترین بلڈنگ میں ہوتا اور نیلی نیلی آنکھوں اور گلابی رخساروں والی کوئی نوجوان ساحرہ اُس کی سیکرٹری ہوتی۔ نیز کچہری کے احاطے میں اُس کے کم از کم دو اسسٹنٹ ہوتے جو اس کے لیے کام کرتے۔ ان لوازم کی موجودگی میں

اُس نے زبردست جدوجہد اور تگ و دو سے وکالت کا امتحان پاس کیا تھا۔ اس لیے اسے ہوٹلوں دکانوں اور پرائیویٹ فرموں میں دن رات کام کرنا پڑا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ وکالت کی سند ملتے ہی اُس کے نام بلند و بالا ہو جائیں گے اور اس کے دروازے

پر مقدمات کی لمبی قطار لگ جائے گی اور اس کے قدموں میں دولت کے ڈھیر پڑے ہوں گے لیکن اس کا دفتر شہر کے ایک پس ماندہ علاقے میں تھا اور اس کے وسائل اُسے اس سے زیادہ اہتمام کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ اس لیے اس کا سہانا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوا۔

ابتدائی تین مہینے تک وہ تجربہ حاصل کرنے کے لیے روزانہ عدالت جاتا رہا۔ اس مدت میں اُسے تجربے کی دولت کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا۔ یہ نکتہ اُسے بہت مدت بعد معلوم ہوا کہ کامیاب وکیل بننے کے لیے صرف علم اور تجربہ کافی نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے کچھ اور طریقے بھی اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ ایک خوبصورت دفتر، ایک حسین وجمیل سیکرٹری جس کا بدن سڈول ہو اور جس کے ہونٹوں پر ہر وقت ایک دل آویز مسکراہٹ تیرتی رہتی ہو، دو تیز و طرار اسسٹنٹ ہوں جن کی چرب زبانی وکیل کی لیاقت سے زیادہ اہم ہوتی ہے۔ اُس نے دیکھا تھا کہ ان خوبیوں نے بعض نااہل وکلاء کی نااہلی پر پردہ ڈال دیا ہے اور احمقوں کی ایک کثیر تعداد اُن کی موکل بنی ہوئی ہے۔

اب اُس کے سامنے ایک ہی مسئلہ تھا اور اُس کے سر پر ایک ہی دھن سوار تھی۔ اُسے پیسہ چاہیے تھا تاکہ وہ اپنی وکالت چمکانے کے لیے ضروری انتظامات کر سکے۔ وہ سوچتا کہ کیا اس کے لیے اُسے مزدوری کرنی ہوگی؟ یا دوبارہ کسی نجی تجارتی ادارے میں ملازم ہونا پڑے گا؟ ملازمت اور مزدوری کا خیال اُس کے ضمیر نے گوارا نہیں کیا۔ سوچتے سوچتے آخر اُس نے ایک فیصلہ کیا اور مسلسل غور وفکر کے بعد پیسے کے حصول کا ایک جامع منصوبہ بنایا۔ اُس نے اپنا منصوبہ ایک غیر جانب دار وکیل کی نظر سے ہر پہلو سے دیکھا۔ اُسے اس میں کوئی خامی نظر نہیں آئی۔

وہ چند روز تک شہر کے ایک امیر ترین فربہ اندام اور بزدل شخص کے متعلق معلومات جمع کرتا رہا۔ وہ شخص اونی کپڑے کے ایک کارخانے کا مالک تھا۔ اُس کے پاس بے حساب دولت تھی۔ اس کے علاوہ وہ ایک انتہائی حسین وجمیل بیوی کا شوہر تھا اور اُس سے بے حد خائف رہتا تھا۔ اُس کا ایک بچہ بھی تھا جس کا نام جیری تھا۔ جیری سے اُسے بے حد محبت تھی کیونکہ وہی اس کی جائیداد کا واحد وارث تھا اور اُسی سے اُس کی نسل پروان چڑھتی تھی۔ اُس نے سوچا کہ جب اُس نے غریبوں کا خون چوس چوس کے دولت جمع کی ہے اُس سے صرف اُس کی اولاد ہی کیوں فائدہ اٹھائے؟ ویسے بھی جیری ابھی بچہ ہے، وہ نہ معلوم کب اس قابل ہو کہ اپنے باپ کی دولت کا مالک بنے۔ اس دوران میں اگر میں اپنا کچھ حق وصول کرلوں تو کیا حرج ہے؟

اُس نے دوبارہ اپنے منصوبے پر غور کیا اور چڑیا گھر کا ٹکٹ جیب میں ڈال کر کھڑکی سے ہٹا اور سیدھا جیری کے سکول جا پہنچا۔ اُسے سکول کے باہر وقفے کے وقت تک جیری کا انتظار کرنا پڑا اور جب تفریح کی وقفے کی گھنٹی بجی تو اُس نے اپنی جیب تھپتھپا کر ٹافیوں کے پیکٹ اور چڑیا گھر کے ٹکٹ کی موجودگی کا یقین کیا، پھر سکول کے احاطے میں داخل ہو گیا۔ جیری جلد ہی اُسے چند بچوں کے ساتھ کھیلتا ہوا نظر آ گیا۔ وہ ایک مسکراہٹ کے ساتھ اُس کی طرف بڑھا۔ جیری بھی شاید وقفے کے لمحات پوری خوش طبعی سے گزارتا تھا چنانچہ وہ بھی اُس کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگا۔ اُس نے جیری کے پاس پہنچ کے گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے کہا "بیٹے تمہارا نام......"۔

جیری نے ہنستے ہوئے جلدی سے کہا "جیری ہے جناب"۔

"بڑا پیارا نام ہے تمہارا اور میرا نام جانسن ہے۔ بتاؤ کیسا ہے میرا نام؟" یہ کہتے ہوئے اُس نے ٹافیوں کا

پیکٹ جیری کی طرف بڑھا دیا۔ جیری نے چند لمحوں کی ہچکچاہٹ کے بعد پیکٹ لے لیا۔ جانسن نے تیر نشانے پر بیٹھتے دیکھ کر کہا "میرا بیٹا بھی بالکل تمہاری عمر کا تھا بیٹے! وہ موٹر کے حادثے میں ہلاک ہوگیا آہ۔ آج تمہیں دیکھ کر وہ اچانک یاد آ گیا"۔

جانسن کی خودساختہ کہانی سُن کر جیری کا دل بھر آیا اور جانسن نے اُس کے چہرے سے یہ تاثرات فوراً بھانپ لیے۔ اس نے کہا "بیٹے میرے پاس چڑیا گھر کا ایک فالتو ٹکٹ موجود ہے۔ چڑیا گھر تین بجے تک کھلا رہتا ہے۔ تم چاہو تو ٹکٹ لے لو اور چڑیا گھر چلے جاؤ"۔

چڑیا گھر کا نام سُن کر جیری کا معصوم چہرہ خوشی سے دمک اُٹھا۔ اُس نے کہا "لیکن سکول سے چھٹی کیسے ملے گی؟"

جانسن نے کہا "یہ تم خود سوچو چھٹی حاصل کرنا تمہارا کام ہے ویسے تم چاہو تو چھٹی کے بغیر بھی جاسکتے ہو"۔

یہ تجویز جیری کو بہت پسند آئی۔ جانسن نے اُسے ٹکٹ دے دیا۔ جیری نے جلدی سے ٹکٹ لے کر اپنی جیب میں چھپا لیا۔ پھر جانسن نے اُس کی طرف ایک نوٹ بڑھاتے ہوئے کہا "لو یہ رکھ لو خوب تفریح کرنا اور خوب اچھی اچھی چیزیں کھانا؟"

جیری کی ساری ضروریات خودبخود پوری ہوتی جارہی تھیں۔ وہ بے حد خوش تھا۔ جانسن نے پیٹھ تھپک کر اُسے شاباشی دی اور وہاں سے اُٹھ کر باہر آ گیا۔ تھوڑی دیر بعد جیری بھی کتابیں چھپائے باہر نکلا اور جانسن کے ساتھ روانہ ہوگیا۔

جیری کا باپ رچرڈسن اپنے دفتر میں بیٹھا تھا اور مختلف کاروباری کاغذات میں منہمک تھا۔ اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اُس نے ریسیور اُٹھایا۔ دوسری طرف ایک رُعب دار اور سنجیدہ آواز نے اُسے مخاطب کیا "مسٹر رچرڈسن! مجھے یہ اطلاع دیتے ہوئے افسوس ہے کہ اس وقت آپ کے اکلوتے بیٹے کی زندگی سخت خطرے میں ہے۔ اگر آپ اس کی زندگی بچانا چاہتے ہیں تو آپ کو چالیس ہزار پونڈ ادا کرنے ہوں گے۔ دوسری صورت میں اُس کی حفاظت اور سلامتی کی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔ رقم ادا کرنے کے لیے آپ کے پاس صرف دس منٹ کا وقت ہے۔ میں فوراً آرہا ہوں اگر آپ چاہیں تو اس سلسلے میں پولیس وغیرہ کی مدد شوق سے حاصل کرسکتے ہیں مگر میں آپ کو دس منٹ سے زیادہ وقت نہیں دوں گا اگر آپ نے رقم کا مطالبہ پورا کردیا تو آپ کا ہونہار فرزند صحیح و سالم حالت میں حفاظت سے تین بجے تک آپ کو واپس کردیا جائے گا بیٹے کی خاطر یہ رقم آپ جیسے دولت مند کے لیے کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ میں رقم لینے آرہا ہوں"۔

رچرڈسن گھبرایا۔ سخت سردی کے باوجود اُس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے۔ بیٹے کی زندگی یا چالیس ہزار پونڈ؟ اُس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ تین بجنے میں صرف آٹھ منٹ باقی تھے۔ تصور میں اُسے اپنے بیٹے کی لاش دکھائی دی۔ وہ چیخ اُٹھا "جیری! جیری! مجھے ہر قیمت پر اپنا بیٹا واپس چاہیے ہے اور زندہ واپس چاہیے ہے" اُس نے اُسی وقت اپنی خوبصورت سیکرٹری کو بلایا اور حکم دیا "خزانچی سے کہو وہ چالیس ہزار پونڈ کے نوٹ ابھی اور اسی وقت مجھے پہنچادے"۔

رچرڈسن کی وحشت اور سراسیمگی دیکھ کر نوعمر سیکرٹری گھبرا گئی لیکن اُسے کچھ دریافت کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ وہ خاموشی سے چلی گئی۔

تین بجنے میں صرف پانچ منٹ باقی رہ گئے تھے۔ مسٹر رچرڈسن کا ہر ہر منٹ ایک ایک صدی کی طرح گزر رہا تھا۔ وہ شدید کرب سے دوچار تھے۔ انہوں نے سکول اور گھر ٹیلیفون کرکے جیری کے متعلق پوچھا۔ پتہ چلا کہ جیری کو معمول کے مطابق سکول سے ایک بجے تک آجانا چاہیے تھا لیکن وہ ابھی تک گھر نہیں پہنچا تھا۔ مسٹر رچرڈسن نے ریسیور رکھا ہی تھا کہ سیکرٹری نے ایک

سلطان الپ ارسلان سلجوقی

سلطان کھانا کھا رہا تھا کہ باورچی کے ہاتھ سے ذرا سا چھلک گیا اور گرم گرم شوربے نے سلطان کو جلا دیا۔ اس نے غضب ناک ہوکر باورچی کو دیکھا تو اُسے اپنی موت کا یقین ہوگیا۔ باورچی نے حالت مایوسی میں بقیہ شوربا بھی سلطان پر اُلٹ دیا۔ خادم شاہی نے اُسے گرفتار کرلیا۔

دوسرے دن صبح اُسے سلطان کے سامنے دربار میں پیش کیا گیا۔ الپ ارسلان نے تلخی سے کہا "باورچی! تمہارا پہلا جرم تو قابل معافی تھا کیونکہ وہ اتفاقی تھا لیکن تمہاری دوسری حرکت کا کوئی جواز نہیں ہے"۔

باورچی نے سر جھکا کر جواب دیا "ظل الٰہی مجھے اپنی پہلی لغزش پر ہی موت کا یقین ہوگیا تھا میں نے یہ سوچا کہ اگر معمولی اتفاقی غلطی پر حضور نے مجھے موت کی سزا دی تو سننے والے سلطان کو ظالم قرار دیں گے۔ یہ سوچ کر میں نے دوسری سنگین بالارادہ غلطی کا ارتکاب کیا تاکہ حضور کے صادر کردہ سزائے موت کے فیصلے کا کوئی معقول جواز موجود رہے اور آپ کے عدل وانصاف پر حرف نہ آنے پائے"۔

الپ ارسلان نے شرمندہ ہوکر سر جھکا لیا اور آہستہ سے حکم دیا "اس شریف اور معقول انسان کو رہا کردیا جائے اور اسے اس کے عہدے پر بحال کردیا جائے"۔

(انتخاب: یاد نور/ لاہور)

کارڈ لاکر ان کے سامنے رکھ دیا۔ مسٹر رچرڈسن نے کارڈ کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ انہوں نے بڑی عجلت سے کہا "اُسے فوراً اندر بھیج دو"۔

جانسن نپے تلے قدموں سے اندر داخل ہوا۔ مسٹر رچرڈسن اُسے دیکھتے ہی کرسی پر آگے کی طرف جھک آئے "آپ....." انہوں نے کچھ کہنا چاہا لیکن کہہ نہ سکے۔ جانسن نے اطمینان سے اُن کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا "مجھے جانسن کہتے ہیں آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے آپ کو ٹیلی فون کیا تھا"۔

رچرڈسن کو جانسن کے لہجے میں کوئی سفاکی محسوس نہیں ہوئی، شکل سے بھی وہ کوئی مجرم دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس کی سنجیدگی اور اطمینان دیکھ مسٹر رچرڈسن اور بھی خوف زدہ ہو گئے۔ ایسے لوگ عام مجرموں سے کہیں زیادہ خطرناک ثابت ہوسکتے ہیں۔ مسٹر رچرڈسن ننھے جیری کا تصور کرتے ہی بُری طرح گھبرا گئے۔ انہوں نے نہایت سعادت مندی سے چالیس ہزار پونڈ کی گڈیاں جانسن کے سامنے میز پر رکھ دیں۔ جانسن نے حواس پر قابو پاتے ہوئے بے حد متانت سے کہا "انہیں کسی لفافے میں رکھ کر دیجیے مسٹر رچرڈسن"۔

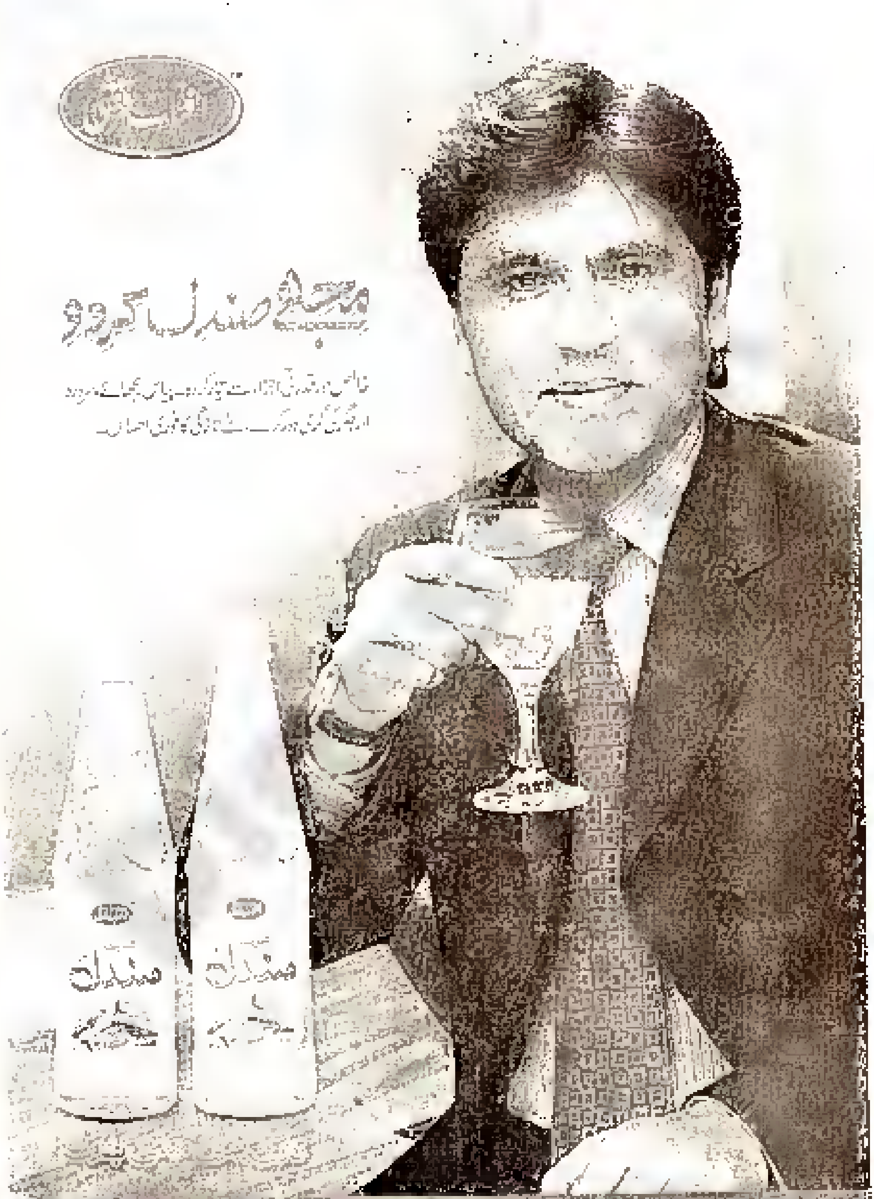
مسٹر رچرڈسن نے اضطراب کے عالم میں گھڑی پر نظر ڈالی۔ تین بجنے میں صرف دو منٹ رہ گئے تھے۔ انہوں نے جلدی جلدی نوٹوں کی گڈیاں ایک بڑے لفافے میں بھریں اور لفافہ جانسن کی طرف بڑھا دیا "شکریہ مسٹر رچرڈسن"۔

جانسن لفافہ اپنے بیگ میں رکھتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا "میرے کارڈ میں دفتر کا پتہ موجود ہے۔ میں نے آج ہی جدید طرز کی ایک شاندار عمارت میں یہ دفتر قائم کیا ہے آپ جب چاہیں مجھ سے مل سکتے ہیں آپ کی آمد میرے لیے مسرت اور عزت افزائی کا باعث ہوگی"۔

مسٹر رچرڈسن نے تقریباً چیختے ہوئے کہا "میرا بیٹا جیری؟"

"رچرڈسن! میں دھوکے باز آدمی نہیں ہوں۔ دیانت دار اور ایمان دار ہوں، یہی میرا پہلا اصول ہے۔ آپ کا بیٹا ساڑھے تین بجے تک ضرور گھر پہنچ جائے گا ورنہ میرا پتہ تو آپ کے پاس ہے ہی"۔

مسٹر رچرڈسن اپنی گاڑی میں ہوا میں اُڑنے


صندل
صندل

ہوئے گھر پہنچے۔ وہ سخت بے چین تھے۔ انہوں نے ٹیلیفون کر کے پولیس انسپکٹر کو بھی بلوالیا تھا۔ ٹھیک ساڑھے تین بجے گھر کے سامنے ایک ٹیکسی رُکی اور ننھا جیری ٹیکسی سے اُتر کر گھر کے احاطے میں داخل ہوا۔ مسٹر رچرڈسن نے دوڑ کر اسے سینے سے لپٹا لیا۔ رچرڈ کی بیوی اپنے بیٹے کے غم میں بُری طرح رو رہی تھی اور بار بار شوہر کو بُرا بھلا کہہ رہی تھی۔ جیری کو دوبارہ سامنے دیکھ کر وہ نیم دیوانی سی ہوگئی اور اُسے گود میں لے کر اُٹھا کر جلدی سے اندر لے آئی۔ حالات ذرا پُرسکون ہوئے تو مسٹر رچرڈسن نے ننھے جیری سے پوچھا "بیٹے اُن لوگوں نے تمھیں کوئی تکلیف تو نہیں پہنچائی؟"

جیری نے حیرانی سے کہا "آپ کن لوگوں کی بات کر رہے ہیں ڈیڈی؟ میں تو چڑیا گھر گیا تھا" پھر وہ مزے لے لے کر چڑیا گھر کے مشاہدات سنانے لگا۔ جانسن کا اُس نے کوئی ذکر نہیں کیا کیوں کہ ڈیڈی اور ممی اُسے تقریباً ہر روز سمجھاتے تھے کہ کسی اجنبی شخص سے کبھی ٹافی یا مٹھائی یا کوئی اور چیز نہ لینا۔ اجنبی لوگ بچوں کو مٹھائی کھلا کر بے ہوش کرتے ہیں اور ساتھ لے جاتے ہیں۔ اُس نے سوچا کہ میں نے جانسن کا ذکر کیا تو ممی اور ڈیڈی دونوں خفا ہو جائیں گے۔

مسٹر رچرڈسن اور پولیس انسپکٹر اس واقعے پر حیران تھے۔ مسٹر رچرڈسن نے کہا "انسپکٹر تمہاری کیا رائے ہے؟ اب کیا قدم اُٹھانا چاہیے؟"

انسپکٹر نے جواب دیا "اوّل تو ایسے لوگ عموماً واردات کے فوراً بعد غائب ہو جاتے ہیں پھر بھی اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ مجرم کارڈ میں لکھے ہوئے پتے پر موجود ہے تب بھی قانوناً ہم اُس پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے کیونکہ اُس کے خلاف اغوا کا مقدمہ نہیں بنایا جاسکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جیری خود اپنی مرضی سے چڑیا گھر گیا تھا"۔

مسٹر رچرڈسن نے کہا "فریب دہی اور جعل بازی کا مقدمہ تو قائم کیا جاسکتا ہے؟"

انسپکٹر نے کہا "ہاں ممکن تو ہے لیکن یہ ایک فضول کوشش ہوگی۔ ذرا مجھے اس کا کارڈ تو دکھائیے مسٹر رچرڈسن!" اُس نے کارڈ پر نظر ڈالی، لکھا تھا "جانسن بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ بیرسٹرایٹ لاء" انسپکٹر نے مسکرا کر مسٹر رچرڈسن کی طرف دیکھا۔ بدقسمتی سے وہ بیرسٹر بھی ہے..... اس لیے مجھے کامیابی کی بالکل اُمید نظر نہیں آتی"۔

مسٹر رچرڈسن نے پورے چالیس ہزار پونڈ گنوائے تھے۔ وہ بھلا کیسے مطمئن اور بے نیاز ہو جاتے؟ آخر کچھ تذبذب کے بعد دوسرے دن وہ کارڈ کے پتے پر پہنچ گئے۔ وہاں متناسب بدن کی ایک نوعمر اور دلکش سیکرٹری نے اُن کا استقبال کیا۔ مسٹر رچرڈسن اُس کے نظارے میں ایسا کھوئے کہ انہیں اپنی آمد کا مقصد بھی یاد نہیں رہا۔ وہ محویت سے سیکرٹری کے جاذب نظر خدو خال اور دل فریب قدوقامت کا جائزہ لینے لگے۔ اچانک بیرسٹر جانسن اندر داخل ہوئے۔ جانسن مسکرا کر اُن کی طرف بڑھا اور اُن سے مصافحے کے بعد مصروفیت کی معذرت چاہتا ہوا اندر چلا گیا۔ جانسن کے چرب زبان اسسٹنٹ نے مسٹر رچرڈسن کو شیشے میں اُتارنا شروع کیا اور تھوڑی دیر بعد انہیں اپنے ساتھ جانسن کے پُرشکوہ کمرے میں لے گیا۔ مسٹر رچرڈسن سیکرٹری کے حُسن سے غالباً اتنا مرعوب ہو چکے تھے کہ انہوں نے کل کے واقعے کا کوئی ذکر نہیں کیا اور اپنے ادارے کے لیے قانونی مشیر کی حیثیت سے جانسن کی خدمات حاصل کرنے کی درخواست کی جسے جانسن نے خندہ پیشانی سے قبول کرلیا۔ مسٹر رچرڈسن سیکرٹری کو گھورتے ہوئے واپس جانے لگے تو سیکرٹری نے انہیں ایک دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ رخصت کیا۔ جانسن اُن کے جاتے ہی قہقہہ لگا کے کرسی پر نیم دراز ہوگیا۔ اُس کے چہرے پر بلا کا اطمینان تھا۔

قصہ ایک شام کا

جاوید بسام

میں نے اپنے عظیم دوست کو حیرت سے دیکھا جس نے بڑی آسانی سے ایک اجنبی شخص کے بارے میں منطقی رائے دی تھی۔ بظاہر اس سے اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ میں ہومز کی دوستی پر جتنا فخر کرتا، اتنا کم تھا۔ پھر میں نے کہا "ہومز کیوں نہ ہم اس کے پاس جائیں اور اسے یہ باتیں بتا کر حیرت زدہ کردیں......"۔



شرلک ہومز کا دلچسپ واقعہ، اسے اپنی قیافہ شناسی کو جانچنے کا موقع ہاتھ آگیا تھا

اس دن موسم بہت خوشگوار تھا۔ میں اپنے دوست شرلک ہومز کے گھر پہنچا تو اسے تیار ہوتے ہوئے دیکھا۔ اس نے اپنا بہترین سوٹ پہن رکھا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہیں جانے کا ارادہ ہے۔ مجھے دیکھ کر وہ مسرت سے بولا "آؤ واٹسن! مجھے تمہارا ہی انتظار تھا"۔

"کیا ہم کسی سے ملنے جارہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں بس ذرا باہر چل رہے ہیں۔ چیرنگ

کر اس تک پہنچو اچھل قدمی ہو جائے گی"۔ وہ بولا۔

میں نے حیرت سے اسے دیکھا کیونکہ وہ بہت کم باہر نکلتا تھا زیادہ تر گھر میں بند مطالعے اور سوچ وبچار میں مصروف رہتا جلد ہی ہم روانہ ہو گئے۔ اُن دنوں اتفاق سے ہمارے پاس کوئی کیس نہیں تھا۔ سارے راستے ہومز چہکتا رہا۔ آج وہ ایک بدلا ہوا انسان نظر آ رہا تھا، ہم نے ایک اچھے سے ہوٹل میں کھانا کھایا اور وہائیڈ پارک کی طرف نکل گئے۔

پارک میں کئی لوگ مجمع لگائے گلہ پھاڑ پھاڑ کر اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔ ہم ان سے ہٹ کر ایک بنچ پر بیٹھ گئے۔ ہومز مجھے افریقہ کے ایک قبیلے "ڈھک ڈو" کے بارے میں بتانے لگا۔ اس نے کچھ دن پہلے ہی اس کے متعلق کوئی کتاب پڑھی تھی۔ مجھے اس موضوع سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ اس کی باتیں سنتے ہوئے میری نگاہیں ادھر اُدھر بھٹک رہی تھیں۔ اچانک مجھے سامنے کی بنچ پر ایک آدمی بیٹھا نظر آیا۔ اس کی شخصیت میں کوئی ایسی بات تھی کہ میں اس میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو گیا۔ میں نے ہومز کی توجہ اس کی طرف مبذول کرائی اور پوچھا کہ اس آدمی کے بارے میں اس کی کیا رائے ہے۔ ہومز کی ذہین آنکھیں اس پر مرکوز ہو گئیں، کچھ دیر وہ اسے غور سے دیکھتا رہا پھر بولا "میرے دوست واٹسن! سامنے بیٹھے اس شخص کی چوڑی پیشانی مجھے بتا رہی ہے کہ یہ ایک مستقل مزاج، ذہین اور مالدار شخص ہے"۔

ہومز کے تجزیے سے میں بہت مرعوب ہوا کیونکہ اس کی قیافہ شناسی کا دل سے قائل تھا۔ اس کے اندازے ہمیشہ درست ثابت ہوتے تھے۔ وہ سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے سوچ میں ڈوبے لہجے میں بولا "یہ شخص یا تو بدکار ہے یا ایک کامیاب وکیل...... اس پر میں بھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا"۔ میں نے گردن ہلائی اور کہا" اس کی کوئی جلدی بھی نہیں ہم

اب ٹائی ٹینک کبھی نہیں ڈوبے گا

چین میں کبھی نہ ڈوبنے والے ٹائی ٹینک کی تیاری کا آغاز ہو گیا ہے۔ سو سال قبل ڈوبنے والے عظیم الشان بحری جہاز ٹائی ٹینک کی نقل ساڑھے 16 کروڑ ڈالر کی لاگت سے تیار کی جائے گی۔ اصل ٹائی ٹینک کے برعکس یہ ٹائی ٹینک کبھی نہیں ڈوبے گا کیونکہ اسے سمندر میں نہیں اُتارا بلکہ وسطی چین کے ایک تارنجی تھیم پارک کی زینت بننا ہے۔ اس ٹائی ٹینک کی خاص بات یہ ہے کہ سیاح اس میں بیٹھ کر ٹائی ٹینک کے ساتھ پیش آنے والے حادثے کا عملی مشاہدہ کریں گے۔

(مرسلہ: شفقت طاہر وڑک۔ کراچی)

جلد ہی کسی نتیجے پر پہنچ جائیں گے لیکن تمہارا اس کے لباس کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

ہومز بولا "یہ لباس لندن کے بہترین درزی نے تیار کیا ہے۔ اگرچہ یہ پرانا ہے اور شانوں سے کچھ ڈھیلا ہے لیکن یہ اس کے لیے ہی سیا گیا تھا۔ میرا خیال ہے پچھلے دنوں یہ کچھ بیمار رہا ہے"۔

"اسے کیا بیماری ہو سکتی ہے؟" میں نے تشویش سے پوچھا۔

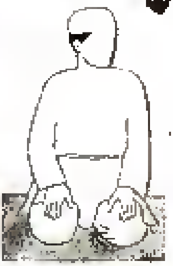
"کوئی خاص نہیں میرا اندازہ ہے معیادی بخار رہا ہوگا، گزشتہ دنوں اس کی وبا پھیلی تھی"۔

میں نے مرعوبیت سے سر ہلایا اور پوچھا "لیکن اس کے بھاری ہاتھ اور مضبوط جبڑے تو اسے بدکار یا وکیل ظاہر نہیں کرتے؟"

ہومز خوش دلی سے مسکرایا "میرے دوست واٹسن! بے شک اس کے ہاتھ بہت مضبوط ہیں لیکن میں نے ایک ایسا ڈاکٹر بھی دیکھا ہے جس کے ہاتھ اس سے بھی زیادہ بھاری تھے حالانکہ اس نے زندگی میں کبھی ایک کیل بھی نہیں ٹھونکی تھی"۔ میں نے کہا

سیارہ ڈائجسٹ کی ایک اور عظیم پیش کش

عباداتِ رمضان المبارک



شائع ہوگیا ہے

قیمت 175 روپے

رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جس نے رمضان المبارک کے آنے کی خوشی منائی اللہ تعالیٰ اسے ایک سال تک خوشیاں عطا فرماتا ہے

اور جس نے رمضان المبارک کے جانے کا غم منایا اس سے ایک سال غم دور ہٹا دیتا ہے۔

- رمضان کیا ہے۔
- رمضان اور روزہ
- رمضان اور قرآن
- رمضان اور شب قدر
- رمضان اور اعتکاف
- رمضان اور تراویح
- رمضان کی عبادات
- وظائف اور دعائیں
- رمضان اور نوافل
- رمضان کی عبادات کا اثر تمام سال کیسے رہتا ہے۔
- رمضان میں عورتوں کے مسائل اور ذمہ داریاں
- ایک مکمل اور جامع گائیڈ۔ گھر کے ہر فرد کیلئے۔ آپ کے دوست احباب کیلئے رمضان کا بہترین تحفہ!
- اپنے آرڈر سے جلد مطلع فرمائیں۔

خود پڑھیں اور دوسروں کو پڑھائیں

سیارہ ڈائجسٹ۔ 240 مین مارکیٹ ریواز گارڈن لاہور۔ فون: 37245412

"ضرور ایسا ہی رہا ہوگا، ہومز لیکن اس کے جوتے اس کی شخصیت سے میل نہیں کھاتے؟"

یہ سن کر شرلک ہومز سوچ میں پڑ گیا کیونکہ اس کے جوتے کافی پرانے لگ رہے تھے۔ دفعتاً اس نے چٹکی بجائی اور بولا "تم ٹھیک کہتے ہو ڈاکٹر واٹسن اس کے جوتے بہت پرانے ہیں لیکن یہ تو دیکھو پچھلے دنوں کاف لیدر (گائے کا چمڑا) کی قیمتیں آسمان پر جا پہنچی ہیں، جوتوں کے دام دوگنے ہوگئے ہیں اور ہاں (اس نے میرے شانے پر ہاتھ مارا) اب میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ایک بینکار ہے۔ جس کا واسطہ سارا دن ہندسوں سے پڑتا ہو اسے عملی طور پر کفایت شعار بھی ہونا چاہیے" وہ راحت افزا طمانیت سے مسکرا کر بولا۔

میں نے اپنے عظیم دوست کو حیرت سے دیکھا جس نے بڑی آسانی سے ایک اجنبی شخص کے بارے میں منطقی رائے دی تھی۔ بظاہر اس سے اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ میں ہومز کی دوستی پر جتنا فخر کرتا، اتنا کم تھا۔ پھر میں نے کہا "ہومز کیوں نہ ہم اس کے پاس جائیں اور اسے یہ باتیں بتا کر حیرت زدہ کر دیں، تھوڑا شغل رہے گا"۔

ہومز کی آنکھیں چمکنے لگیں وہ بولا "ہاں ضرور کوئی حرج نہیں ہے" ہم اُٹھے اور اس کی طرف بڑھ گئے۔ قریب جا کر ہم نے سلام کیا اور ہاتھ ملا کر اس کے دائیں بائیں بیٹھ گئے۔ اس نے چونک کر حیرت سے ہمیں دیکھا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار نظر آ رہے تھے۔ میں نے کہا "محترم! ہم آپ کا کچھ وقت لیں گے، میں ڈاکٹر واٹسن ہوں اور یہ میرے عظیم دوست مشہور سراغ رساں شرلک ہومز ہیں۔ (ہومز نے اپنی ٹوپی کو چھوا)۔ آپ نے ان کے بارے میں ضرور سنا ہوگا۔ انہوں نے بہت سے پیچیدہ کیس اپنی ذہانت سے حل کیے ہیں" وہ شخص اثبات میں سر ہلانے لگا۔

میں نے کہا کہ "میرے دوست نے آپ کی دلچسپ شخصیت پر ابھی ابھی ایک رائے دی ہے میرا خیال ہے آپ بھی اسے سننا پسند کریں گے"۔ پھر میں نے اسے ہومز کی تمام باتیں بتائیں۔ وہ جھینپ کر اپنے دونوں ہاتھوں کو رگڑ رہا تھا۔ میں نے کہا "مجھے یقین ہے یہ سب باتیں درست ہوں گی اس بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟"

اس آدمی نے بولنے کی کوشش کی لیکن اوںہہ.....آں جیسے مبہم الفاظ منہ سے نکلے اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور ہکلا کر بولا: "جناب آپ معزز لوگ ہیں آپ کے دوست یقیناً درست اندازہ لگاتے ہوں گے۔ دراصل غلطی میری ہے، میں نے آج ہی یہ سوٹ پرانے کپڑوں کے بازار سے خریدا ہے۔ میں ایک دہقان ہوں اور کل ہی لندن کام کی تلاش میں آیا ہوں۔ غلطی سو فیصد میری ہے مجھے کوئی عام سا سوٹ خریدنا چاہیے تھا، لیکن میرے ناپ کا بس یہی ایک سوٹ تھا"۔

وہ تاسف سے گردن ہلاتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا پارک کے گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

میں نے کن انکھیوں سے ہومز کی طرف دیکھا، اس کی فراخ پیشانی پر پسینے کے قطرے نظر آرہے تھے۔ اس نے اپنی ٹائی کی گرہ ڈھیلی کی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بڑبڑا رہا تھا "کیا واہیات دن ہے ایسے موسم میں گھر سے باہر نکلنا بے وقوفی تھی"۔ وہ اُٹھ کر چل دیا۔ گھبراہٹ میں وہ باہر جانے کی بجائے پارک کے اندرونی حصے کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے غیر محسوس انداز میں اس کا رخ گیٹ کی طرف کیا۔ جب ہم بگھی میں بیٹھے واپس آ رہے تھے تو میں نے سڑک کنارے اس آدمی کو جاتے دیکھا اس نے اپنا کوٹ اُتار کر بغل میں دبا لیا تھا۔



وہاں سب سے بے خبر اپنی
دھن میں مگن یخ بستہ سردی،
مریضوں کا فضلہ، نالی کی غلاظت اور
کانچ کے ٹکڑے سے لاتعلق صرف اس پریشانی میں ہے کہ وہ
رات کے آٹے کے لئے پیسے، چھ ماہ کے بچے جسے کھونا ہے
کے لئے روٹی اور لنڈے سے کپڑے لے کر جانے ہیں۔

کیپٹن (ر) لیاقت علی ملک



malik.psp33@gmail.com
http://www.facebook.com
/liaqatmalick7iraf#tbs

کیپٹن (ر) لیاقت علی ملک نے گورنمنٹ کالج لاہور سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد نومبر 1995ء میں افواج پاکستان میں کمیشن حاصل کیا۔ پاکستان آرمی کے دس سالہ دور میں مختلف عہدوں پر فائز رہنے کے علاوہ اپنی پیشہ ورانہ تربیت میں بھی نمایاں مقام حاصل کیا۔ نومبر 2005ء میں پولیس سروس کا حصہ بنے اور پریذیڈنٹ پولیس میڈل (PPM) اور وزیر اعلیٰ پنجاب سے "بہترین پولیس آفیسر" کا ایوارڈ ان کے کارہائے نمایاں ہیں۔ اپنی عسکری اور پولیس سروس کے دوران بھی انہوں نے علم و ادب سے اپنا تعلق اور واسطہ بالکل اسی طرح استوار رکھا جس طرح سپاہی اپنی بندوق سے رکھتا ہے۔ دو کتابوں کی تصنیف کے علاوہ ان کے مضامین مختلف اخبارات، رسائل اور جرائد کی زینت بنتے رہتے ہیں اور روز مرہ کے معاشرتی مسائل، معاشی ناہمواریوں، تیزی سے بدلتی ہوئی اخلاقی اقدار اور منفی رویوں پر طنز کے نشتر چلانا ان کے انداز تحریر کی انفرادیت اور خاصا ہے۔ (مدیر)

انسان کی بے مائیگی آشکار کرتی ایک پُر اثر تحریر

ننگے پاؤں دوسروں کو گھورتے چیخنے والا یہ شخص میرے دماغ میں سُول کی طرح اٹک گیا۔ شدید سردی میں جہاں پرندے منتار زیر پر لئے کونوں کھدروں میں پناہ لے رہے ہیں اور ایک دوسرے کے جسم کی گرمی حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے کے جسم کا حصہ بننے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ بزرگ ہمیشہ کی

طرح گرم بستر سے بیزاری کا ثبوت اور گھر کے باسیوں سے اکتاہٹ کا اظہار کرنے کے لئے گلی کے کونے والی دوکان میں، لکڑی کے کوئلے کو ہوا دینے اور اردگرد سے جھاڑ جھنکاڑ، خشک جھاڑیاں، پوتڑے اور لیروں کو بجھتی ہوئی آگ کو تیز کرنے کے لئے استعمال کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ چادر کی بکل میں آگ کے قریب ہونے کی کوشش کرتے ہوئے اس خوف میں مبتلا بھی کہ کہیں کوئی چنگاری (پھونک) مارنے سے اُڑ کے جنی چادر جو صدیوں سے اس جسم کا حصہ تھی یا پرانا تہبند (لاچا) نہ جلا دے۔ کیونکہ بابا جی کو پتہ ہے اس کے نتائج کتنے خوفناک ہونگے۔ جوانی میں رعب دار شخصیت اور گھر والی کو حقیر، کمتر اور ناقص عقل سمجھنے والا بابا اب بڑھاپے میں اتنا ہی بے بس، کمزور، لاچار اور مسکین صورت بن جاتا ہے۔ کیونکہ جوان اولاد کے سہارے بی بی جان اب اپنی سلطنت کی "شہنشاہ" ہو چکی ہوتی ہے۔ عمر کا نصف سے زائد حصہ حکومت کرنے والا بابا، جب کمزور پڑ جاتا ہے تو اولاد کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی محسوس کر کے اور اپنی بیکاری سے منسلک کر کے، اپنے آپ کو ان کے رحم وکرم کے تابع سمجھ کر، بے بسی کے عالم میں، جب بہو کی انگریزی اور پوتے پوتیوں کی اپنی اپنی ذات کے اندر بسنے والی انجمن کا حصہ نہیں بن پاتا۔ تو اس کو سکون گلی کے کونے میں جلنے والی لکڑی، کاٹھ کباڑ، لیروں اور تاکیوں سے جلنے والی آگ، جو اس کو شاید ہیٹر اور بستر کی گرمی اور نرمی تو نہیں دے سکتی۔ مگر اس ماحول سے وقتی فرار ضرور دے دیتی ہے۔ اور بابا بھی اپنے آپ کو ظلم کی فضاء سے نکل کر جبر کے آہنی پنجوں کی دسترس سے باہر، آزاد پنچھی محسوس کرتا ہے۔ جہاں ان کو کوئی مٹھائی کھانے سے یہ کہہ کر نہیں روکتا، کہ آپ کو شوگر ہے۔ اور ان پر جگہ جگہ تھوکنے پر پابندی نہیں لگاتا۔ نہ چائے کی دوسری پیالی پہ یہ کہتا ہے کہ ابھی آپ نے لی ہے۔ آپ کی صحت کے لئے ٹھیک نہ ہے۔ اور وہ پھیپھڑے بھر کر جب سانس باہر پھینکتا ہے تو اس میں ایک آزادی اور اظہار تشکر اور سکون کا عنصر بھی شامل ہوتا ہے۔

یہ شخص ننگے پاؤں لوگوں کو سردی سے محفوظ رکھنے کے لئے موزے بیچ رہا ہے۔ معاشرتی انصاف، تقسیم زر، معاشی ناہمواریوں اور عدم مساوات کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ مگر وہ ان سب سے بے خبر اپنی دھن میں مگن، یخ بستہ سردی، مرغیوں کا فضلہ، نالی کی غلاظت اور کانچ کے ٹکڑے سے لاتعلق صرف اس پریشانی میں ہے کہ وہ رات کے آنے کے لئے پیسے، چھ ماہ کے بچے جسے نمونیا ہے کے لئے دوائی اور لنڈے سے کپڑے لے کر جانے ہیں۔ راہ میں پڑی اینٹ کے روڑے سے جو اس کو ٹھوکر لگی ہے اس سے شاید اس کی سردی کی شدت سے سن پاؤں کو کچھ نہ ہوا ہو، مگر میرے دماغ میں شدید چوٹ ضرور لگی ہے۔۔۔!

انسان ہمیشہ اپنے حال پر ناخوش اور ماضی میں کھویا رہتا ہے۔ صرف وہ لوگ جو ماضی کی خامیوں کو مدنظر رکھ کر مستقبل کی ترجیحات طے کرتے ہیں، کامیابی ان کا مقدر بنتی ہے۔ انسان کے خمیر میں یہ چیز شاید روز ازل سے رکھ دی گئی ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے حال پر ناخوش رہے گا۔ اور ہمیشہ اپنی تقدیر کو کوستا رہے گا۔ اپنے خالق سے شکوہ کرتا رہے گا۔ اس بابے کی طرح جس کے پاس گھر میں ہر نعمت موجود ہے مگر پھر بھی وہ ناخوش ہے اور کوئی نئی منزل، کوئی نئی

سوچ، کوئی نئی راہ، کوئی نئی قوت اس کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور وہ سب کچھ چھوڑ کر نروان پانے کے لئے خود کو دیس نکالا دیتا ہے۔ اور جنگلوں کا باسی بن جاتا ہے۔ اضطراب، بے چینی اور بے یا سنگی کا یہ احساس ہمیشہ سے ہمیشہ تک انسان کی سرشت کا حصہ ہے اور رہے گا۔

میں گاڑی میں گرم کپڑوں میں ملبوس اس سوچ میں گم تھا کہ کیا میں بھی ہمیشہ اس اضطرار میں مبتلا رہوں گا۔ انسان کبھی بھی اپنے حال پر خوش نہیں ہوا۔ اور ماضی کی دلچسپیاں ہمیشہ اس کا پیچھا کرتی رہیں گی۔ تخلیقِ انسانیت کا بنیادی اصول قدرت نے تفاوت، امتیاز اور درجات کو بنایا۔ اس سسٹم میں برابری، یکسانیت اور مساوات کی کوئی جگہ نہیں۔ کیونکہ کارخانہ قدرت میں اگر تمام لوگ برابر پیدا ہوتے تو نظامِ کائنات درہم برہم ہو جاتا۔ اور اس کارخانہ حیات کو قائم رکھنے اور چلانے کے لئے کوئی اور نیا نظام بھی قدرت کو وضع کرنا پڑتا۔ کیونکہ اس طرح تو یا سب بادشاہ ہوتے یا سب گدا، یا سب محمود ہوتے، یا سب ایاز۔ بندے ہوتے تو نوازنے والا کوئی نہ ہوتا۔ آجر ہوتا تو اجیر نہ ہوتا۔ یا صرف تونگری ہوتی یا صرف یاس۔ مگر قدرت نے اشرف المخلوقات کی درجہ بندی نظامِ کائنات چلانے کے لئے خود بخود کر دی۔ کچھ لوگ پیدا ہوتے ہیں تو شادیانے بجتے ہیں اور جب راہیِ عدم ہوتے ہیں تو بھی نقارے اور شکرانے کے نفل پڑھے جاتے ہیں۔ کیونکہ ان کی آمد کا بگل بہت سارے غریبوں میں رزق کی تقسیم کا باعث بنتا ہے۔ اور مرنے کا لوگ اس لئے انتظار کرتے ہیں کہ زندگی میں وہ دوسروں پر زندگی تنگ کر دیتے ہیں۔ روزمرہ کی زندگی میں ہمارا ایسے بیسیوں لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ جو شریعت سے زیادہ شر کے پیروکار ہوتے ہیں۔ مگر ان کی خوبصورت دستار، قیمتی عبا، اور دل آویز ادا، کی بدولت جو مال و زر اور اطلس و کمخواب اور مخمل و مخمودگی کے بوجھ تلے اپنی پاک نفسی اور پاکیزگی کا یقین دلانے میں ضعیف العقیدہ مسلمانوں کو اس حد تک کامیاب ہو چکے ہوتے ہیں کہ لوگ اللہ سے زیادہ اپنی حاجت روائی ان سے وابستہ کر لیتے ہیں۔

چھوٹے تھے تو صبح مسجد جانے پر ناخوش، کہ کیوں صبح صبح نیند خراب کر دی۔ مسجد کا دور ختم ہوا تو صرف سکول جانا ہوتا تھا۔ پھر بھی ناخوش کہ کون سات بجے اُٹھے اور تیار ہو۔ اس دور کو بھی ماں باپ اور سکول کو بُرا بھلا کہتے گزارا۔ پھر کارِ سرکار کی باری آئی، تو دفتر جانے کے لئے آٹھ بجے نکلنے پر موت پڑنے لگی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اس نیند اور آرام کے لئے جس کے لئے ہمیشہ مسجد کے حافظ، سکول کے استاد، دفتر کے باس اور ماں باپ سب کو صلواتیں سناتے تھے وہ زندگی کے حساب کتاب اور کارستانیوں کی وجہ سے، آنکھوں سے کوسوں دور چلی گئی۔ اب وقت ہے تو نیند نہیں اور فرصت کے لمحات کو کوستے رہتے ہیں۔ واہ رے انسان، کیا بات ہے تیری، کاش تو نے اللہ کے نظام میں اللہ کے فرمان کے مطابق شب و روز بسر کرنے کا انتظام کیا ہوتا تو شاید تیرے اندر کا خلا، تیرے ذہن کی ہوا اور جسم کی روا تیرے لئے اضطراب، مایوسی، بے یاسنگی، بے دلچسپی کی بجائے سکون اور ابدی آرام پر منتج ہوتی۔

سیارہ کچن کارنر

جویریہ کامران

خواتین قارئین کی دلچسپی اور پسند کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم نے کھانوں کی تراکیب پر مبنی خصوصی سلسلہ شروع کیا ہے جس میں آسان مگر معیاری اور نئی تراکیب پیش کی جائیں گی۔ ان تراکیب پر عمل کرکے نہ صرف آپ اپنے گھر والوں کو نت نئے ذائقہ دار کھانے فراہم کرسکتی ہیں بلکہ روایتی ڈشز پکانے کی بوریت سے بھی نجات حاصل کرسکتی ہیں۔ ہماری کوشش ہوگی کہ آپ کو بہترین تراکیب فراہم کرسکیں۔ اس سلسلے میں آپ ہمیں اپنی تجاویز اور آراء سے آگاہ کرتے رہیے۔ نیز آپ ہمیں خود بھی نئی اور معیاری تراکیب لکھ کر بھیج سکتی ہیں جنہیں آپ کے نام کے ساتھ شائع کیا جائے گا اور بہترین ترکیب پر اعزازی شمارہ بھی آپ کو ارسال کیا جائے گا!

email: sayyaradigest@gmail.com

www.facebook.com/sayyaradigest

چاکلیٹ آئس کریم

اجزاء:

شکر	ساڑھے تین چھٹانک
انڈوں کی زردی	پانچ عدد
ونیلا ایسنس	ایک چمچہ
چیکی چاکلیٹ	دو چھٹانک
کریم	پچاس گرام



ترکیب:

کریم، شکر اور چاکلیٹ ملا کر جوش دے کر انڈوں کی زردی پھینٹ کر مرکب میں ملالیں اور ہلکی آنچ پر نہایت خفیف جوش دے کر اتارلیں۔ پھر چائے کی چھلنی میں چھان کر ٹھنڈا کریں۔ پھر ونیلا ایسنس ملا کر مشین سے جمالیں۔

آم کا اسکواش

اجزاء:

آم (چوسنے والے)	سات کلو
چینی	ایک کلو
ٹماٹرا ایسڈ	ایک اونس
خطا رنگ پیلا	ایک تولہ
پوٹاشیم میٹا بائی سلفائٹ	دس گرام
پانی	ایک کلو



ترکیب:

پہلے آموں کو اچھی طرح دھولیں اور ہاتھوں کو



ترکیب:

پہلے آموں کو اچھی طرح دھولیں اور ہاتھوں کو بھی اچھی طرح صابن سے دھوکر صاف ستھرا کر لیں۔ اب آموں کا رس نکالیں اور اس کو باریک کپڑے سے چھان کر ایک چینی کے تسلے میں ڈھانپ کر رکھ لیں۔ یہ رس وزن میں سوا کلو ہونا چاہیے۔ اب ایک تسلا لے کر اس میں پانی ڈالیں اور اس میں چینی ڈال کر بڑے چمچے سے حل کریں۔ خوب حل کریں پھر اس میں ٹماٹر کا ایسڈ ڈال دیں اور اس کو بھی خوب ملائیں۔ اگر ٹھیک طرح سے حل نہ ہو تو اس کو ہلکی آنچ پر ٹھنڈا ہونے دیں۔ جب یہ ٹھنڈا ہو جائے تو اس میں رس ملا دیں۔ ساتھ ہی پوٹاشیم میٹا بائی سلفائٹ ملا دیں اور رنگ کو پانی میں گھول کر ساتھ ہی شامل کر دیں۔ ان سب چیزوں کو بڑے چمچے سے اتنا ملائیں کہ یہ سب کچھ یکجا ہو جائے اب اس کو بوتلوں میں بھر لیں اور مالٹے کے اسکواش کی طرح بوتلیں تیار کر لیں۔ آم کا اسکواش تیار ہے۔

پستہ آئس کریم

اجزاء:

بالائی	ایک کلو
شکر	آدھا کلو
نارنگی کا چھلکا	ذرا سا
ونیلا ایسنس	کھانے کا ایک چمچہ
پستہ کی گری	ڈیڑھ چھٹانک
مغز بادام شیریں	ایک چھٹانک
انڈوں کی زردی	آٹھ عدد

ترکیب:

بادام کی گری کو گرم پانی سے بھگو کر چھیل لیں۔ بالائی کو جوش دے کر اور زردی کو مصری کے ساتھ پھینٹ کر بالائی میں ملا کر چھان لیں۔ پھر ہلکی آنچ پر مرکب کو بغیر جوش اس قدر پکائیں کہ سخت ہو جائے۔ پھر اُتار کر بادام کی قاشیں تھوڑی سی ٹھنڈی

بالائی کو جوش دے کر اور زردی کو مصری کے ساتھ پھینٹ کر بالائی میں ملا کر چھان لیں۔ پھر ہلکی آنچ پر مرکب کو بغیر جوش اس قدر پکائیں کہ سخت ہو جائے۔ پھر اُتار کر بادام کی قاشیں تھوڑی سی ٹھنڈی

بالائی میں ملا کر اس مرکب کو چند منٹ پکائیں، پھر



آنچ دیں۔ پھر چھان کر اتنا پھینٹیں کہ بالکل ٹھنڈا ہو جائے۔ بعد ازاں مشین کے ذریعے جمالیں۔

قلفی

اجزاء:

دودھ خالص	تین کلو
کھویا	ایک پاؤ
الائچی	دس بارہ
	ایک چھٹانک



کیوڑہ	چار بڑے چمچے
چینی	ایک پاؤ

ترکیب:

دودھ کو پکائیں اور اتنا خشک کریں کہ آدھا رہ جائے۔ اب اس میں چینی ڈال کر ملائیں اور نیچے اُتار لیں۔ ٹھنڈا ہونے پر اس میں کھویا ملادیں اور الائچی پیس کر ڈالیں۔ اب اگر قلفی میں جمانے کا خیال ہے تو اس میں بادام چھیل کر کاٹ کر ڈال دیں پھر یہ مرکب قلفی کے سانچے میں ڈالیں اور اس کے بعد اس پر پستہ باریک کاٹ کر چٹکی بھر ڈال دیں۔ قلفی کے اوپر ڈھکنا لگا کر سخت آٹے سے بند کردیں۔ اب ایک مٹکے میں برف کوٹ کر ڈالیں اور اس میں نمک اور قلفی ڈال دیں۔ بیچ میں قلفیاں رکھ دیں اور مٹکے کو ہلاتے رہیں۔ تقریباً گھنٹہ ڈیڑھ اسی طرح ہلانے سے قلفیاں جم کر تیار ہوجائیں گی۔ اگر مشین میں جمانا ہو تو دودھ میں کھویا ملا کر اس میں پستہ بادام کاٹ کر ڈال دیں اور الائچی پیس کر ڈالیں اور ساتھ ہی کیوڑہ ڈال کر مشین میں ڈال دیں۔ ایک گھنٹہ مشین چلانے کے بعد آپ کو معلوم ہوجائے گا کہ قلفہ تیار ہے۔ ایک گھنٹے میں بہت ہی مزیدار آئس کریم تیار ہوگی۔

بریڈ رول

اجزاء:

ایک عدد بڑی ڈبل روٹی سلائس لمبائی میں کٹے ہوئے۔

کنور کیوبز	دو عدد
میونیز	چار کھانے کے چمچ
کالی مرچ	ایک چمچ
کارن فلور	دو چمچ
انڈے اُبلے ہوئے	چار عدد

ترکیب:

ایک کپ پانی میں کیوبز گھول لیں دو چمچ کارن فلور تھوڑے سے پانی میں گھول کر یخنی میں ڈال دیں جب یخنی گاڑھی ہوجائے تو اُسے ٹھنڈا کرلیں اس میں چار عدد انڈے باریک کاٹ کر ڈالیں چار کھانے کے



چمچ میونیز ایک چمچ کالی مرچ دو چینی کے چمچ ڈال کر مکس کرلیں۔ ساتھ تھوڑا سا ریس کریں اس پر چمچ سے آمیزہ پھیلادیں اور رول کرلیں کپڑے میں لپیٹ کر فریج میں رکھ دیں آدھے گھنٹے کے بعد نکال کر تیز چھری سے گول سلائس کاٹ لیں۔

چکن کرارے

چکن	آدھا کلو (بون لیس)
ادرک کا پیسٹ	ایک کھانے کا چمچ
لیموں کا رس	ایک عدد
انڈے	دو عدد
لال مرچ	ایک کھانے کا چمچ
کالی مرچ	ایک چوتھائی پسی ہوئی



چاول کا آٹا	تین کھانے کے چمچ
سوجی	دو کھانے کے چمچ
میدہ	دو کھانے کے چمچ
کارن فلور	دو کھانے کے چمچ
تل	دو کھانے کے چمچ
تیل	تلنے کے لیے

ترکیب:

پہلے چکن بریسٹ کو لیئر میں دو کر لیں۔ پھر اس کے اسٹرپس کاٹ لیں۔ اب ایک پیالے میں ادرک کا پیسٹ، لیموں کا رس، انڈے، کٹی لال مرچ، پسی کالی مرچ اور نمک شامل کر کے مکس کر لیں۔ پھر اس میں چاول کا آٹا، سوجی، کارن فلور اور میدہ شامل کر کے اچھی طرح مکس کریں۔ آخر میں تل اور چکن شامل کر کے اچھی طرح مکس کریں۔ پھر تیل میں ڈیپ فرائی کر لیں۔ سنہرا رنگ آنے پر نکال کر سرو کریں۔

چکن وائٹ قورمہ

اجزاء:

چکن	ایک عدد
ہری مرچ	چھ عدد
پانی	ایک کپ
پیاز	ایک پاؤ (چھیل لیں)
ادرک لہسن کا پیسٹ	کھوپرا آدھا کپ
دہی	ایک کپ
بادام	ایک کپ (چھلے ہوئے)
ثابت کالی مرچ	آٹھ یا دس عدد
ثابت لال مرچ	چھ یا سات عدد
پسی سفید مرچ	دو کھانے کے چمچ
دار چینی	دو ٹکڑے
پلانٹا آئل	ایک کپ
سفید زیرہ	ایک چائے کا چمچ
نمک	حسب ذائقہ
لونگ	پانچ یا چھ عدد

(کھوپرا اور بادام پیس کر دہی میں ملا کر رکھ دیں)

(پیاز، ہری مرچیں اور ادرک اور لہسن پیس کر پانی کے ساتھ پیسٹ بنا لیں)

ترکیب:

دیچی میں آئل گرم کر کے ثابت مسالے ڈال کر براؤن کر لیں۔ پیاز کا مکسچر ڈال کر ہلکی آنچ پر تھوڑی دیر بھون لیں۔ خیال رہے کہ پیاز براؤن نہ ہونے پائے۔ پھر دہی کا مکسچر ڈال کر کچھ دیر بھون لیں۔ چکن، نمک اور سفید مرچ ڈال کر اتنی دیر بھون لیں کہ آئل



الگ نظر آنے لگے۔ جب خوشبو آنے لگے تو ایک کپ پانی ڈال دیں اور ثابت لال مرچ ڈال کر پندرہ منٹ دم رکھ دیں۔ مزیدار وائٹ قورمہ تیار ہے۔

بزمِ شاعری



نعت

جسے مل جائے پینے کو فقط پانی کا پیمانہ
پڑا رہتا ہے چوکھٹ پر محمد ﷺ کی وہ دیوانہ
فلسفی جوتشی دانشوروں سے پوچھتے کیا ہو
وہ عالم کی محمد ﷺ کا خبر رکھتا ہے مستانہ
شمع کی لو پہ پروانوں کو جلتے مرتے دیکھا ہے
مگر نورِ مبیں سے روشنی پاتا ہے پروانہ
کھنچے آتے ہیں لاکھوں رند بھی چاروں جانب سے
کھلا رہتا ہے آٹھوں ہی پہر مدنی ﷺ کا میخانہ
صحابہ رضی اللہ عنہ دیدار نبی ﷺ کے بھوکے پیاسے تھے
نہیں تھی جستجو ہر دم کہاں کا پینا اور کھانا
میسر شوق آجائے در مرسل ﷺ کا گر گوشہ
وہی ہے داخل جنت اُسی گوشے میں سو جانا

(شوق خانوانی/خانوا ہن سے)

غزل

وہ اُدھر پڑھتا رہا اور میں اِدھر لکھتا رہا
کچھ جواب خط نہ آیا میں مگر لکھتا رہا
اک اک حرف قلم کو تول کر لکھتا رہا
مختصر تھا خط مگر میں رات بھر لکھتا رہا
ہر نئی تحریر کا انداز رکھتا تھا جدا
سوچ کر انجام کو آغاز پر لکھتا رہا
تاکہ ممکن کر سکے مجھ کو نہ دریا کا سکوت
پھینک کر دریا میں کنکر آب پر لکھتا رہا
اک اسیرِ جاں کو یاد آشیاں آتی رہی
اور وہ اپنے آپ کو بے بال و پر لکھتا رہا
اشک میرے گر پڑے امتیاز سرِ قرطاس پر
حال سے اپنے میں ہو کر بے خبر لکھتا رہا

(ایس۔امتیاز احمد/کراچی)

غزل

وہ جو حسن و جمال رکھتا ہے
غم سے رشتہ بحال رکھتا ہے
مجھ کو اُس نے اُداسیاں بخشیں
کتنا میرا خیال رکھتا ہے
رونے دیتا نہیں جو رووں تو
وہ ہنر باکمال رکھتا ہے
گرنا چاہوں تو گرنے نہیں دیتا
کون مجھ کو سنبھال رکھتا ہے
مجھ کو اس کی تلاش ہے راتا
چہرہ جو بے مثال رکھتا ہے

(قدیر رانا۔راولپنڈی)

غزل

جب من میں دُکھ کی آگ جلے گی تو
اشکوں کی برسات اُسے بجھا دے گی
بچھڑ کر تم سے مر تو نا جاؤں گا
مگر مری زندگی کانٹوں پہ کٹے گی
ٹھکرائے گی ساری دنیا جسے حقارت سے
خدا کی ذات اُسے اپنائے گی
اللہ کی نافرمانی سے پہلے نا سوچا انسان نے
کہ بالآخر جنت اُس سے چھن جائے گی
جیون بھر انبار دولت کے لگاتا رہا قارون
نہیں جانتا تھا کہ یہ اُس کے منہ آئے گی
عشق یوسف نے دیوانہ کر دیا زلیخا کو

نہیں جانتی تھی کہ بدنام ہو جائے گی
جب کبھی غموں کی گھٹا چھائے گی تو
خوشیوں کی تیز ہوا اُسے اُڑا دے گی
ہر لمحہ پریشان سی رہتی ہے نینا
پتہ نہیں کب مصائب سے نجات پائے گی
(نسرین اختر نینا/لاہور)

غزل

میرا خنجر بھی میرے دشمن کو دیا ہو
یا جو وہ چاہے ویسے مجھ کو سزا ہو
ٹھوکر لگے رستے میں تو نفس کے اُلٹوں
سر میں اُترے تو معاف خون بہا ہو
خدایا اتنا بلند ظرف مجھ کو عطا ہو
معروف پکارا ہو کوئی تو میرے لب پہ دعا ہو
بھولے ہوئے مسافر کو یوں منزل دکھاؤں
انجان سی راہوں پہ جیسے جلتا دیا ہو
محبت حد معراج تک پہنچ جائے عبدل
ممکن اگر حریفوں سے بھی انساں کا بھلا ہو
(عبدالباسط عبدل)

غزل

لمحہ لمحہ مجھے سزا دے گا
دل یہ میرا مجھے مٹا دے گا
لوٹ آیا تو خود صدا دے گا
ساری باتیں مجھے بتا دے گا
آئے گا اب بھی جھوم کر ساون
تُو نہ آیا تو کیا مزہ دے گا
میں کبھی بھی جسے بھلا نہ سکوں
لوگ کہتے ہیں وہ بھلا دے گا
اس سے ملنے سے اس لیے ہے گریز
کوئی جذبہ نیا جگا دے گا
روک لو بڑھ کر ایسے طوفان کو
جو در و بام کو ہلا دے گا
آ رہا ہے وہ وقت تیزی سے
جو مجھے خواب سے جگا دے گا
وہ جو بوڑھا گلی میں رہتا ہے
حال پوچھو تو بس دُعا دے گا
مجھ کو عزم و یقین کی چاہت ہے
جانتی ہوں مجھے خدا دے گا
وہی ہوگا عظیم سب سے کنول
جو گرے شخص کو اُٹھا دے گا
(یاسمین کنول/پسرور)

غزل

دنیا کے جھمیلے میں اکثر ہم نے دیکھا ہے
غرضوں کے سب تعلق ہیں پیار محبت دھوکہ ہے
ہر سو نفسا نفسی ہے ہر سو خوف کا عالم ہے
دل خوشیوں سے خالی ہیں افسردہ ہر لمحہ ہے
گلشن میں کب پھول کھلے کب کوئل خاموش ہوئی
ہجر کے موسم نے ہم سے ہر امید کو چھینا ہے
بہتے آنسو کہتے ہیں شب بھر کس کو روتے ہو
پاگل ہو تم پاگل ہو سپنا کب سچ ہوتا ہے
ہائے مقدس ناز تمہیں ہر پل شکوہ ہے خود سے
قسمت میں جو لکھا ہو وہ تو ہو کر رہتا ہے
(مقدس ناز/لاہور)

جیب خالی ہو تو

گردش ایام زمانے کی رفتار بدل دیتی ہے
زندگی کا اسلوب بدل جاتا ہے، تقدیر بدل جاتی ہے
ملزموں کی صف میں جگہ پاتا ہے رد بھکاری کیلئے
قانون بدل جاتا ہے، بیگناہی کی تعبیر بدل جاتی ہے

برا وقت ہو تو سر راہ ملاقات میں شناسا چہرے
رُخ بدل لیتے ہیں چہروں کی تصویر بدل جاتی ہے
کہتے ہیں مقدر میں لکھا ہوا ٹل جاتا ہے بہرکیف
پھوٹی تقدیر ہو تو لوح ازل کی تحریر بدل جاتی ہے
آہوں میں ڈھل جاتے ہیں بلبل و مینا کے نغمے
آندھیوں کی لپیٹ میں فصل گل کی تفسیر بدل جاتی ہے
لاکھ لئے پھرتا رہے بیگناہی کا اشتہار
جب خالی ہو تو عدل کی تعبیر بدل جاتی ہے
خیر و شر یوم جزا ذرّے ذرّے کا حساب ہوتا ہے
شافع محشر کی نظر کرم ہو تو ہر تقدیر بدل جاتی ہے
ابھی وقت ہے گناہوں کا احاطہ کر لے
وقت مرگ تو چہرے کی تصویر بدل جاتی ہے
(قاضی محمد یوسف ۔ مسقط)

حالِ دل

فرقتوں کے موسم میں
یاد کے گھنے بادل
چرخ دل سے اٹھتے ہیں
اور وفا کے وعدوں کی

چنگیز ہلاکو ختم ہوئے

ہے دولت کی گرمی دل میں
ہاتھ سر پہ میرے یوں رکھتا ہے
قوموں کو دھوکے دے دے کر
لگاتا ہے یہ آگ باغوں میں
یہ چھری چھپا کے جھولی میں
یہ پیار کرے ہے ہم سب سے
کاغذ کے پھولوں کا یہ خالق
بیری ہے یہ پکا مزدوروں کا
جب ظلم رانجھوں پہ ہو جاتا ہے
فطرت ظاہر کر دیتی ہے پھر
چھپتا نہیں ہے یہ ظلم زمانے میں
آج ہماری باری ہے تو
رہ جائے گا نام اللہ کا
رہ جائے گا اِک پیار نشانی
یہ باتیں ہیں الہام کی
آگ کی طرح منہ جلتا ہے
جیسے میرا وہ چاچا لگتا ہے
کرتا ہے وہ باتیں پیار کی
پہ باتیں ہیں باغ و بہار کی
اللہ اللہ پڑھا کرتا ہے
پہ پیار یہ زہر سانپ کا ہے
اور دشمن ہے یہ باغ بہاروں کا
اور سنگی ہے یہ سرمایہ داروں کا
ہر طرف سے ظلم سیالوں کا
دھاکہ ایک بھونچالوں کا
قانون اللہ کا جاری ہے
کل ان کی باری ہے
چنگیز ہلاکو ختم ہوئے
نمرود فرعون ختم ہوئے
یہ باتیں نہیں ابہام کی

یہ باتیں ہیں پاکستان کی
کیا باتیں ہیں پاکستان کی

(اقبال انجم)

بجلیوں کا شور وغل
روح میں دھڑکتا ہے
وصل کے حسین لمحے
بوند بوند آنکھوں سے
جب برسنے لگتے ہیں
تب تمہاری یادیں ہی
لفظ لفظ کاغذ پر شعر کا بدن اوڑھے
حالِ دل سناتی ہیں
باخدا تری یادیں خونِ دل جلاتی ہیں
بے پناہ ستاتی ہیں رات بھر جگاتی ہیں
(عاکف عثمان عاکف)

گیت وطن کا گاتا جاؤں

بستی بستی نگر نگر میں
کوچہ کوچہ ڈگر ڈگر میں
پرچم کو لہراتا جاؤں
گیت وطن کا گاتا جاؤں

سبز ہلالی وطن کا پرچم
جس میں چمکے تارا چم چم
اس کا مان بڑھاتا جاؤں
گیت وطن کا گاتا جاؤں

سب سے دل کش اور اُجیارا
پاک وطن ہمیں جان سے پیارا
سب کو یہ جتلاتا جاؤں
گیت وطن کا گاتا جاؤں

محنت میں ہے' عظمت اپنی
عزت دولت شہرت اپنی
ہر اک کو سکھلاتا جاؤں
گیت وطن کا گاتا جاؤں

آؤ! سب ہم وطنو! آؤ!
وطن کا نغمہ مل کر گاؤ!
سازِ امن بجاتا جاؤں
گیت وطن کا گاتا جاؤں
(ڈاکٹر سید نعیم احمد ادیب جعفری)

مارِ آستیں

بے سہارا ہو کے آیا کام ایسا کر گیا
جاتے جاتے فاصلے ہی
آنکھ میں وہ بھر گیا
احسان فراموش آخر راستہ بدل گیا
کیسا اس کا ذوق تھا؟ کیسا اس کا شوق تھا؟
آستیں کے سانپ بھی
انگشت بدنداں تھے
ہوس کے پجاری نے
پُرخلوص لوگوں کو پھر فریب دے ڈالا
مجبور اپنی فطرت سے
بے ضمیری کے گھنگھرو
باندھ کر پاؤں میں
گرہن کے رستے پر
محوِ رقص ہے ظالم کیسا شخص ہے ظالم؟
(جاوید راہی)

غزل

پتھر کے صنم سے جو وفا مانگ رہے ہیں
خاشاک سے ہم رنگ حنا مانگ رہے ہیں
ہم ظلم کی سنگلاخ چٹانوں پہ کھڑے ہیں
ظلمات کے چھٹنے کی دعا مانگ رہے ہیں
مجرم ہیں ابھی آج کٹہرے میں کھڑے ہیں
ہم اپنے جرائم کی سزا مانگ رہے ہیں
نفرت کی کڑی دھوپ میں بیٹھے ہیں مسلسل
محبوب کے دامن کی ہوا مانگ رہے ہیں

جلادے کے ہاتھوں میں دیجئے تیغ برہنہ
ہم اپنی نوازش کا صلہ مانگ رہے ہیں
انسان کی مجبوری حالات دیکھو
قاتل سے بھی آب بقا مانگ رہے ہیں
ممکن جو نہیں اس کو بھی ممکن ہیں سمجھتے
اب آگ لگی ہے تو گھٹا مانگ رہے ہیں
انسان کا کیا بوجھ اٹھاتی نہیں دھرتی
اب چاند پہ بسنے کی جگہ مانگ رہے ہیں
(ریاض حسین قمر)

غزل

وہ کبھی مل جائیں تو کیا کیجئے
رات دن صورت کو دیکھا کیجئے
چاندنی راتوں میں اک اک پھول کو
بے خودی کہتی ہے سجدہ کیجئے
جو تمنا بر نہ آئے عمر بھر
عمر بھر اس کی تمنا کیجئے
عشق کی رنگینیوں میں ڈوب کر
چاندنی راتوں میں رویا کیجئے
ہم ہی اس کے عشق کے قابل نہ تھے
کیوں کسی ظالم کا شکوہ کیجئے
(ناصر کاظمی)

غزل

تجھے اداس بھی کرتا تھا خود بھی روتا تھا
یہ حادثہ بھی مری جاں کبھی تو ہوتا تھا
جو داستاں اسے کہنا تھی پھر ادھوری رہی
کہ میں بھی تھک سا گیا تھا اسے بھی سونا تھا
وہ مجھ کو توڑ کے پھر جوڑتا رہا ہر بار
میں اس کے واسطے جیسے کوئی کھلونا تھا
سنبھل سنبھل کے میں روتا رہا کہ فرقت میں
جگر کا داغ مجھے آنسوؤں سے دھونا تھا
میں تخت اکبر پہ سویا تھا رات بھر محسن
کھلی جو آنکھ تو صحرا میرا بچھونا تھا
(محسن بھوپالی)

خاص اعلان

محترم قارئین! بزم شاعری میں آپ کی دلچسپی کے پیش نظر ادارہ نے ایک خصوصی سلسلہ شروع کیا ہے جس کے تحت ہر ماہ ایک خوش نصیب شاعر/شاعرہ کا تعارف بمعہ تصویر شائع کیا جائیگا۔ جو احباب اس سلسلہ میں شریک ہونا چاہتے ہیں وہ اپنی تازہ غزل/نظم پسندیدہ شاعر کی غزل/نظم اور دیگر تفصیلات کے ساتھ درج ذیل کوپن بھر کے سیارہ ڈائجسٹ: 244 مین مارکیٹ ریواز گارڈن لاہور پر ارسال کریں۔

کوپن برائے اس ماہ کا شاعر

یہاں اپنی تصویر منسلک کریں

نام: .... تعلیمی قابلیت: ....
عمر: .... پسندیدہ شاعر: ....
پسندیدہ غزل/نظم: ....
مشاغل: .... تاریخ پیدائش/برج: ....
شادی شدہ/غیر شادی شدہ: .... پتہ: ....
ای میل: ....

نوٹ: اپنی پسند ناپسند شاعری کی ابتدا مزاج اور دیگر تفصیلات الگ صفحے پر درج کر کے بھیجئے۔

شہنائی کے آنسو

ابو ضیا اقبال

وہ اپنی زخمی ٹانگ لیے ایک ایک انچ بڑھنے لگا، اس نے ہاتھ لگا کر دیکھا، دھوتی خون میں لت پت ہو گئی تھی، درد کی ٹیسیں ناقابل برداشت تھیں، پھر وہ غش کھا کر گر پڑا۔

کرم داد نے انگڑائی لی اور اٹھ بیٹھا۔ پو پھٹا چاہتی تھی اور ہوا میں نسیم سحر کی مہک تیر رہی تھی۔ گاؤں کی واحد مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی۔ اس نے کلمہ پڑھا اور چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پاس ہی دوسری چارپائی پر جنداں اور اس سے کچھ پرے زینو سو رہی تھی۔ اس نے بیوی اور بیٹی پر اچٹتی سی نظر ڈالی۔ جنداں ابھی کچی نیند میں تھی اور کسمسا رہی تھی لیکن زینو گھوڑے بیچ کر سو رہی تھی۔

بیٹی پر نظر پڑتے ہی کرم داد کے جسم میں جھرجھری سی آ گئی جوانی اس کے انگ انگ سے پھوٹی پڑتی تھی، اور چہرہ کھلے ہوئے کنول کی طرح تازہ تھا۔ کرم داد کی آنکھوں میں فکر و تردد کے بادل تیرنے لگے اور ماتھے پر شکنیں ابھر آئیں۔ جوان بیٹی بیل کی طرح چڑھتے جا رہی تھی۔ وہ بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھ چکا تھا۔ نہ



جانے کب مالک حقیقی کا بلاوا آجائے۔ بیٹی کے سر پر ہاتھ کون رکھے گا۔ اچانک کہیں سے ایک کرن پھوٹی اور اس کی آنکھیں جگمگانے لگیں۔ چوہدری چاچا نے رشتہ تو لگا ہی تھا۔ مہینے بیس دن تک لڑکے والے لڑکی کو دیکھنے آ ہی جائیں گے۔ خدا نے چاہا تو وہ اپنے گھر کی ہو جائے گی۔ پھر فکر کا ہے کی!

اس نے گھر پر ہی وضو کیا اور چادر کاندھے پر رکھ کر زینو کو جگانے لگا۔

"اٹھ گوئیے! دن چڑھ آیا ہے" اس نے کہا اور کلمہ پڑھتا ہوا باہر نکل گیا۔ زینو اُٹھ بیٹھی اور سرہانے دوپٹہ ڈھونڈنے لگی۔ کرم داد کی آواز سُن کر جب اس کی آنکھ کھل گئی اور وہ بلند آواز سے کلمہ پڑھنے لگی۔

کرم داد باہر نکلا تو ستمبر کی ستم گری کے باوجود ہوا میں لطافت تھی۔ فضا آغوش کھولے سردی کی آمد کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ مسجد کی سمت چل پڑا۔ دھندلکا چھٹ رہا تھا اور روشنی کی چادر چار سو بڑھتی آ رہی تھی۔

وہ نماز پڑھ کر مسجد سے نکلنے لگا تو مولوی صاحب نے اُسے اشارے سے رُکنے کا کہا۔ وہ صحن میں رُک کر ان کے وظیفہ ختم کرنے کا انتظار کرنے لگا۔ بابا معراج دین پاس سے گزرا تو کہنے لگا "چلو گے نہیں!"

"تم چلو مجھے مولوی صاحب سے بات کرنی ہے"۔ کرم داد نے کہا اور پیر کے انگوٹھے سے زمین کریدنے لگا۔ "نہ جانے مولوی صاحب مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہیں؟" وہ سوچ رہا تھا۔ وہ گاؤں میں پنساری کی دکان کرتا تھا۔ تین چار روپے روزانہ بکری ہو جاتی، وہ اس سے مطمئن تھا۔ تین وقت پیٹ بھر روٹی مل جاتی، پہننے کو موٹا جھوٹا میسر آجاتا۔ ایک بھینس تھی، دودھ دہی کے لیے کسی کی محتاجی نہ تھی۔ کسی سے لینا نہ دینا۔ مختصر سا کنبہ تھا۔ بیوی، بیٹی اور خود نپا تلا خرچ تھا۔ لے دے کر ایک زینو کی شادی کی فکر تھی سو یہ مشکل بھی آسان ہوتی نظر آرہی تھی۔ زینو اپنے گھر سدھار گئی تو سُکھ ہی سُکھ تھا۔ صرف ایک حج کرنے کی خواہش تھی۔ اگر وہ چاہے تو اپنے گھر اور اپنے حبیبؐ کے روضے کی زیارت کرا سکتا ہے۔ وہ تو صرف پنجگانہ نماز کے بعد گڑگڑا کر دعا ہی مانگ سکتا تھا۔

وظیفہ ختم کر کے مولوی صاحب نے تسبیح منبر پر رکھی اور آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتے ہوئے کرم داد کے پاس آئے۔

"بھائی کرم داد!" انہوں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "بُری بُری خبریں سننے میں آ رہی ہیں نمبردار کہہ رہا تھا کہ بھارت نے بھاری تعداد میں فوجیں پاکستان کی سرحد پر جمع کر دی ہیں میرا خیال ہیں کچھ بندوبست کر لینا چاہیے"۔

یہ کوئی نئی بات نہ تھی جسے سُنانے کے لیے انہوں نے کرم داد کو روکا تھا۔ ایک عرصے سے بھارتی فوجیں پاکستان کی سرحد پر جمع ہو رہی تھیں۔ اس نے سوچا لیکن یہ اس لیے تھا کہ کشمیر میں مجاہدین نے جنگ آزادی شروع کر رکھی تھی۔ بھارتی فوجوں کے اجتماع سے پاکستان کو کوئی خطرہ نہ تھا۔

"گھبراتے کیوں ہو مولوی جی! کوئی خطرے والی بات نہیں ہے" اس نے مولوی صاحب کو دلاسا دیا۔

"میں گھبرا نہیں رہا ہوں بھائی!" مولوی صاحب نے جواب دیا "الحمدللہ مسلمان ہوں۔ خدا اور رسول ہمارا محافظ ہے' کوئی ہمارا بال بیکا نہیں کر سکتا لیکن یہ تو حدیث شریف میں بھی ہے کہ کافر سے ہوشیار رہو۔ دشمن سے چوکنا رہنا تو حدیث رسول ہے"۔

"یہ تو ٹھیک ہے" کرم داد نے کہا "لیکن حکومت جو ہر دم چوکس ہے۔ آپ بالکل فکر نہ کریں کشمیر میں چاہے جو ہو پاکستان پر حملہ نہیں ہو سکتا"۔

"اچھا اللہ مددگار ہے" مولوی صاحب نے بات ختم کی۔

"اللہ مددگار ہے" کرم داد نے تائید کیا اور مسجد سے باہر نکلا۔ کھیت جاگ گئے تھے۔ رہٹ چل پڑے تھے۔ گلیوں میں زندگی انگڑائیاں لے رہی تھی۔ صرف رات کا تھکا ہارا چوپال گھڑی دو گھڑی سستا رہا تھا۔ اسے پھر مستعد ہونا پڑا۔ کرم داد راہ میں ملنے والے اکا دکا گاؤں والوں سے علیک سلیک کرتا دھیرے دھیرے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ مولوی صاحب کی باتیں اس کے ذہن سے نکل چکی تھیں۔ اب ذہن میں صرف چوہدری چاچا کا تصور بسا ہوا تھا۔ وہ ان کی کامیابی کی دعائیں مانگ رہا تھا۔

گھر میں داخل ہوا تو زینو دودھ بلو کر مکھن اتار رہی تھی، جنداں چولہے پر روٹی سینک رہی تھی۔ وہ صحن میں پڑی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ زینو گرم گرم روٹی پر مکھن اور لسی کا گلاس لیے آئی۔ جب وہ چنگیر چارپائی پر رکھ کر جانے لگی تو اس کی کمر پر بل کھاتی لمبی چوٹی کرم داد کو سانپ بن کر ڈس گئی۔ اچانک زینو کے سیاہ بالوں کی جگہ چوہدری چاچا کے سفید بال نظروں کے سامنے پھر گئے۔ ان کا جھریوں بھرا چہرہ سامنے آ گیا۔ وہ تصور میں بارات آتے، شہنائیاں بجتے اور زینو کو ڈولی چڑھتے دیکھنے لگا اور دل ہی دل میں مسکراتا رہا۔

روٹی کھا کر اس نے بلند آواز سے شکر الحمدللہ کہا اور کمرے میں جھانک کر جنداں سے کہنے لگا:۔

"کب آنے کو کہہ گیا ہے چوہدری چاچا؟"

جنداں چکنی منہ سے ہٹاتے ہوئے بولی:۔

"جمعے کا کہہ گیا ہے"۔

کون سا جمعہ؟"

کرم داد کو بیوی کی سادگی پر ہنسی آ گئی۔ پھر وہ خود ہی شرمندہ ہو گیا کہ انگریزی تاریخ کا حساب تو اسے خود بھی نہ آتا تھا۔ اسے تو محض چاند کے اتار چڑھاؤ کا پتا تھا لیکن اس زمانے میں چاند کی تاریخوں کا حساب ہی کون رکھتا تھا۔ وہ اٹھ کر دکان پر چلا گیا۔

دکان کھولی ہی تھی کہ حسب دستور کریم بخش آ گیا۔ وہ علی الصبح حقے کا تمباکو لینے آتا تھا۔ کریم بخش شہر سے کپڑا لاتا اور اسے گاؤں میں گھوم پھر کر بیچا کرتا تھا۔ اس کی زبانی شہر میں پیدا ہونے والی خبروں کا تھوڑا بہت علم ہو جاتا تھا۔ ورنہ گاؤں میں تو محض اناج ہی پیدا ہوتا تھا اور اناج جسم کو تو پروان چڑھا سکتا تھا دماغ کو توانائی نہ دے سکتا تھا۔ ویسے ریڈیو اور اخبار تو وہ اکا دکا گھروں میں تھے۔ پھر ان میں تو محض سرِبازار نظر آنے والی باتیں ہوتی ہیں، ڈھکی چھپی اور رازداری کی۔ گرم گرم خبریں تو زبانوں پر ہی چلتی ہیں۔ کریم بخش گاؤں کے ممبر، نمبردار پٹواری اور وڈا کے کے بعد سب سے زیادہ باخبر آدمی تھا۔ گاؤں کے چوہدری بھی اس صفت سے محروم تھے۔

"سنا بھئی کرم داد" کریم بخش نے آتے ہی مولوی صاحب جیسے انداز میں کہا" لڑائی کی تیاریاں زوروں پر ہیں"۔

"اوے بھئی کیسی لڑائی کہاں کی لڑائی؟" کرم داد نے چوکی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اللہ کا نام لو"

"کیسی لڑائی" کریم بخش کو اس کی لاعلمی اور عدم واقفیت پر حیرت ہو رہی تھی۔" کہتے ہیں بھارت حملہ کرے گا۔ شاستری نے دھمکی دے دی ہے"۔

"ہونہہ! دھمکی دے دی ہے لالہ کی دھمکی بس سنتے رہو" کرم داد نے ہنس کر کہا۔

"ہندوؤں کو موت نے پکارا ہے کیا؟"

"موت نے پکارا ہے تب ہی پاکستان پر حملے کے خواب دیکھ رہے ہیں"۔ کریم بخش نے داناؤں کی طرح سر ہلا کر کہا۔

"شاستری کو پاکستان پر حملہ کرنے کے لیے دوبارہ جنم لینا پڑے گا" کرم داد بھی کب دانائی میں کسی سے کم تھا۔

"لیکن گڑ بڑ ضرور ہے!" کریم بخش اپنی بات گرتی دیکھ کر افسردہ ہو گیا پھر وہ تمباکو لے کر چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد کرم داد پھر چوہدری چاچا کے متعلق سوچنے لگا۔ بات پکی ہوگئی تو شاید بھینس بیچ دینی پڑے۔ وہ تیل کے کنستر پر صافی پھیر رہا تھا کہ نوردین آ گیا۔

"لے بھئی خوش خبری" اس نے کہا "جموں فتح ہو گیا"۔

"ہیں سچ!" کرم داد خوشی کے مارے اچھل پڑا اور جھٹ مٹھی بھر بتاشے اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا "لے منہ میٹھا کر"۔

نوردین نے اس کی ہتھیلی سے دو تین بتاشے اٹھائے اور کہنے لگا:۔

"بالکل سچ خبر ہے"۔

"ریڈیو میں بتایا ہے؟" کرم داد کی آواز مسرت سے کانپ رہی تھی نوردین ایک آنکھ میچ کر رازداری سے بولا۔

"ابھی بتایا تھوڑے جائے گا لیکن خبر پکی ہے"۔

"یا مولا! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے" کرم داد چوکی پر ہی سجدہ شکر کرنے لگا۔ نوردین نے بتاشے چباتا چلا گیا۔

دن پوری آب و تاب سے چڑھ آیا تھا۔ ہوا میں تمازت رینگ رہی تھی۔ فضا میں ستمبر کی بے کیفی کا احساس پھیل گیا تھا۔ پھر دوپہر ہوگئی اور جنداں روٹی لے آئی۔ اس تمام عرصے میں کرم داد دکان پر آنے والے گاہکوں کو بتاشے تقسیم کرتا اور اس خبر کو زینو کی شادی کے لیے نیک فال خیال کرتا رہا۔ جنداں دیکھتے ہی بول پڑی۔ "لے بھاگ بھریے! جموں مل گیا، نماز پڑھ کر مجاہدین کے لیے دعا کیا کر"۔

جنداں کو جموں کے محل وقوع کا خاک علم تھا لیکن وہ بھی خوش ہوگئی۔ کرم داد روٹی کھا چکا تو وہ خالی برتن اٹھائے مجاہدین کی کامیابی کی دعائیں مانگتی چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد وہ ظہر کی نماز کے لیے وضو کرنے لگا۔ پھر اس نے دکان بند کی اور مسجد چلا گیا۔ دوپہر کے وقت گاہک بھولے سے بھی نہیں آتے تھے۔ وہ ظہر کی نماز پڑھ کر مسجد میں ہی لیٹ جایا کرتا تھا۔ سلام پھیر کر مجاہدین کے حق میں دعا مانگی گئی اور لوگ جانے لگے تو وہ لپک کر مولوی صاحب کے پاس گیا اور ان کے کان میں کہنے لگا۔

"مولوی صاحب! مبارک ہو جموں فتح ہو گیا"۔

"ہاں سنا میں نے بھی ہے" مولوی صاحب نے بے یقینی سے کہا "ہمیں غافل نہیں رہنا چاہیے"۔

کرم داد جھنجلا گیا۔ ہمیشہ الٹی سوچتے ہیں مولوی صاحب۔ اس نے دل میں کہا اور صحن میں سائبان تلے جا بیٹھا۔ آج اسے غنودگی محسوس ہو رہی تھی۔ عصر کی نماز پڑھ کر دکان پر چلا گیا۔ مغرب تک دو چار گاہک مٹی کا تیل لینے آ ہی جاتے تھے یا کسی کو میٹھے چاول کھانے کی خواہش ہوتی تو گڑ لینے آ جاتا۔

آفتاب دھیرے دھیرے اپنی کرنیں سمیٹنے لگا اور دل بجھا بجھا سا آیا۔ مغرب کی نماز پڑھ کر وہ سیدھا گھر چلا جاتا تھا۔ اگر اس وقت کسی کو کوئی چیز درکار ہوتی تو اس کے گھر چلا جاتا تھا۔ چیزوں کا سٹاک تو وہیں رکھا تھا۔ گھر پہنچا تو زینو روٹی پکا رہی تھی۔ جنداں پاس ہی بیٹھی گاہے گاہے چولہے میں لکڑیاں ٹھیک کر رہی تھی۔ وہ بلا مقصد گھر میں ادھر سے ادھر پھرتا رہا۔ ایک پل چین نہ آتا تھا گھر پہنچنے پر جموں اور چوہدری چاچا گڈمڈ ہو گئے تھے۔ پھر وہ تھک ہار کر صحن میں چارپائی پر دراز ہو گیا۔

زینو روٹی لائی تو وہ اٹھ بیٹھا۔ جلد جلد روٹی کھائی اور باہر جانے لگا۔ وہ ہمیشہ عشاء کی نماز کے وقت باہر جایا کرتا تھا۔ اسے اس وقت خلاف معمول جاتے دیکھ کر جنداں نے کہا "کہاں چلے؟"۔

"یونہی ذرا چوپال تک!" وہ اس پر اپنا لڑکپن ظاہر نہ کرنا چاہتا تھا۔ آج وہ عشاء کی نماز سے پہلے چوپال کا ایک آدھ چکر لگانا چاہتا تھا تا کہ کوئی تازہ خبر

رہ گئی ہو تو سن لے۔ وہ چوپال سے گزرا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ عشاء کی نماز میں ابھی وقت تھا۔ وہ وقت گزارنے کے لیے دکان پر چلا گیا۔ دراصل اسے نور دین یا رحیم بخش سے ملنے کی خواہش ہو رہی تھی لیکن وہ ان کے گھر جا کر اپنی بے تابی کا اظہار کرنا نہیں چاہتا تھا۔ چوپال واحد جگہ تھی جہاں ریڈیو، اخبارات اور سینہ گزٹ خبریں سمٹ آتی تھیں۔

دکان پر بیٹھے بیٹھے عشاء کی اذان سنائی دی اور وہ دکان بند کر کے مسجد چلا گیا۔ نماز سے فارغ ہو کر اسے ایک گونہ اطمینان سا محسوس ہوا۔ اب لوگ چوپال کی طرف جا رہے تھے۔ سب بڑے بوڑھے جمع ہوئے۔ حقے تازہ کیے گئے اور کریم بخش شہر سے لائی ہوئی خبریں بانٹنے لگا۔ نور دین اس کی باتیں بڑے دھیان سے سن رہا تھا۔ اسے ان ہی خبروں کو ہیر پھیر کر اپنی طرف سے پیش کرنا تھا۔ دیر تک قیاس آرائیاں ہوتی رہیں۔ محفل برخاست ہوگئی اور سب اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہوئے۔

کرم داد کے دن دکان پر اور راتیں چوپال میں گزرتی رہیں نہ تو جموں فتح ہونے کی تصدیق ہوئی نہ چوہدری چاچا لڑکے والوں کو لیکر آئے۔ مجاہدین کی پیش قدمی کی خبریں بدستور آتی رہیں لیکن کرم داد جموں اور چوہدری چاچا دونوں سے ناامید ہو گیا تھا۔ زینو کی پس پردہ چلی جانے والی فکر پوری شدت سے عود کر آئی تھی۔ گاؤں میں ایسا کوئی لڑکا نہ تھا جو نگاہوں میں جچتا۔ جو تھے وہ پہلے ہی شادی شدہ تھے۔ نماز کے بعد جب بلند آواز سے مجاہدین کی کامیابی اور پاکستان کی سلامتی کے لیے دعائیں مانگی جاتیں تو وہ دل ہی دل میں زینو کے رشتے کے لیے گڑگڑا کر دعا مانگتا۔

ایک رات وہ چوپال سے لوٹا تو جنداں سو رہی تھی۔ زینو چارپائی پر لیٹی کچھ سوچ رہی تھی۔ وہ اتنی نادان بھی نہ تھی کہ باپ کے تفکرات کو نہ سمجھ سکتی۔ اسے بھی علم تھا کہ کرم داد کو چوہدری چاچا کا شدت سے انتظار ہے۔ وہ بیٹی کو ڈولی چڑھا کر پائی پائی جوڑنا چاہتا ہے تاکہ اپنی زندگی کی آخری خواہش کو پورا کرنے کے لیے خانہ خدا کی زیارت کرے۔ روزہ مبارک کی چوکھٹ کو بوسہ دے۔ اس مقدس سرزمین کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر دل کی پیاس بجھائے۔ جہاں سرور کائنات ﷺ نے آنکھیں کھولیں، نعرہ حق بلند کیا اور اپنے محبوب سے جا ملے لیکن اس خواب کی تعبیر اس وقت پوری ہو سکتی تھی جب زینو اپنے گھر کی ہو جاتی۔ باپ کو آتا دیکھ کر اس نے آنکھیں موند لیں۔ کرم داد نے ایک نظر اسے دیکھا اور چارپائی پر دراز ہو گیا۔

وہ عموماً دو چار کروٹیں بدل کر نیند کی آغوش میں پہنچ جاتا تھا۔ لیکن اس رات نہ جانے کیوں نیند اچاٹ ہو گئی تھی۔ دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہو رہے تھے اور ذہن نہ جانے کن تنگ و تاریک سرنگوں میں بھٹک رہا تھا۔ جن میں داخل ہونے کا راستہ تو تھا، باہر نکلنے کا کوئی راہ سجھائی نہیں دیتی تھی۔ ایسی ہی ایک سرنگ میں اسے ایک سایہ رینگتا نظر آیا جو دیواروں سے دیوانہ وار سر ٹکرا رہا تھا اس کا جی چاہا کہ سائے کا پیچھا کرے لیکن وہ تو ایک چھلاوہ تھا۔ جب وہ اس کے قریب پہنچتا تو وہ نظروں سے اوجھل ہو جاتا۔ کہیں دور نظر آتا۔

اچانک کہیں بجلی کوندی اور اس نے دیکھا کہ سایہ تو زینو تھی، اس کی بیٹی زینو!

”زینو“ وہ چلایا۔

”چاچا“ زینو اپنی چارپائی سے ہڑبڑا کر اٹھی جنداں بھی گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔

”کیا بات ہے زینو؟“ جنداں بولی۔

زینو منہ سے کچھ نہ بولی چپ چاپ باپ کو دیکھتی رہی۔ کرم داد آسمان کو تک رہا تھا۔ اسی وقت

بادل گرجنے لگے بجلی رہ رہ کر چمکنے لگی۔ گھن گرج سے کانوں کے پردے پھٹے جاتے تھے۔ فضا میں روشنی کے گولے پھٹ رہے تھے۔ یک دم چار سو روشنی پھیل جاتی اور ہیبت ناک گرج میں ڈوب جاتی۔

کرم داد گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ وہ پسینے میں شرابور تھا۔ سانس زور زور سے چل رہی تھی۔ یہ سب کیا تھا؟ بادل، بجلی، گرج، دھماکے اور اس کے ساتھ چیخ وپکار۔ آہ وبکا۔ شور وغل۔ یہ سب اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں سن ہو رہے تھے اور ذہن ماؤف ہوا جارہا تھا۔

اچانک بہت سے لوگوں کے بھاگنے کی آواز سنائی دی۔ کرم داد اٹھا اور دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ نہ کہیں بادل تھا نہ بجلی لیکن دھماکے! روشنی کے گولے!!

کچھ لوگ بھاگتے ہوئے اس کے پاس سے گزرے۔

"ہندوستانی فوج گاؤں میں گھس آئی ہے۔" کسی نے کہا۔

"کرم داد جان بچا اپنی بھاگ" ایک طرف سے آواز آئی۔

دفعتاً ایک گولہ اس سے کچھ فاصلے پر آکر پھٹا۔ اس کی آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔ وہ بھاگ کر اندر گیا۔ جنداں اور زبنو ایک دوسرے سے چمٹی کھڑی تھیں۔

"جنداں، زبنو' نکلو بھاگو" اس نے ہانپتے ہوئے کہا" بھارت نے حملہ کر دیا ہے۔"

زبنو اپنی جوتی ڈھونڈنے لگی لیکن کرم داد ایک ہاتھ سے اسے دوسرے سے جنداں کو کھینچتا ہوا باہر نکل گیا۔

ہر طرف افراتفری مچی تھی۔ عورتوں اور بچوں کے رونے پیٹنے کی فلک شگاف آوازیں گونج رہی تھیں۔ بھگدڑ مچ گئی تھی۔ گھروں سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ لوگ ایک ہی سمت میں بھاگ رہے تھے۔ ان کی امیدوں کا واحد مرکز خانہ خدا تھا۔ سب اس میں پناہ لینے بھاگے جارہے تھے۔

کرم داد جب جنداں اور زبنو کو گھسیٹتا ہوا مسجد کے قریب پہنچا تو اس کے صحن میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ دروازے پر دھکا پیل ہو رہی تھی کسی کو ہوش نہ تھا نفسا نفسی کا عالم تھا۔

کرم داد کے حواس اب تک قابو میں نہ تھے۔ اس نے چلا کر کہا "ارے سارے ایک جگہ کیوں اکٹھے ہو رہے ہو یہاں سے نکلنے کا راستہ بھی نہیں ملے گا کہیں ادھر اُدھر چھپ جاؤ صبح تو ہونے دو۔" یہ کہہ کر وہ جنداں اور زبنو کو لیے اندازے کے مطابق کماد کے کھیتوں کی طرف بڑھنے لگا۔ جن لوگوں نے اس کی آواز سن لی تھی اور اس کا مشورہ قبول کر لیا تھا، وہ بھی ادھر اُدھر ہو لیے، لیکن انہیں اس بات کا علم نہ تھا کہ چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہے۔ گاؤں میں چاروں طرف بھارتی ٹینک پھیل گئے تھے۔

کرم داد چند قدم ہی چلا ہوگا کہ گولیوں کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ اس کے ساتھ ہی فضا میں کئی دلدوز چیخیں گونجیں۔ وہ بیوی اور بیٹی کو لیے ایک درخت کی آڑ میں دبک گیا۔ گولیاں چلنی بند ہو گئیں تو اس نے سرگوشی میں انہیں گھٹنوں کے بل رینگنے کا کہا۔ اسے معلوم تھا کہ کھیت شمال میں تھے اور کھیتوں میں ٹینک نہیں جا سکتے تھے۔ کھیتوں میں سے گزر کر ساتھ والے گاؤں میں پہنچنا ممکن تھا بشرطیکہ اس پر بھی بھارتی گیدڑوں نے رات کی تاریکی میں قبضہ نہ کر لیا ہو۔ کرم داد کو اپنی فوج کا خیال آیا وہ یہاں سے کتنے فاصلے پر کہاں ہوگی۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ صبح تک یہاں پہنچ جائے اور انہیں ان درندوں سے نجات دلائے۔

تینوں گھٹنوں کے بل آہستہ آہستہ رینگ رہے تھے۔ جنداں اور زبنو خوف اور دہشت سے تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ جنداں کے لیے اس طرح چلنا دوبھر تھا لیکن کرم داد اسے گھسیٹ رہا تھا۔ اچانک ایک گولی سنسناتی ہوئی آئی اور کرم داد کو یوں لگا جیسے

اس کی ٹانگ آگ کے شعلوں میں جا پڑی ہو۔

"میری ٹانگ" اس کے منہ سے نکلا اور درد کی شدت سے کچھ نہ کہہ سکا، اسے رُکا دیکھ کر زینو نے ہولے سے کہا:۔

"چاچا"

کرم داد اپنے درد کی شدت بھول گیا۔"بیٹی! تم جنداں کو لے کر کھیتوں میں جاؤ میں پیچھے پیچھے آرہا ہوں" اُس نے بہ مشکل کہا۔

"لیکن......چاچا" زینو کو کیا معلوم تھا کہ اس کے باپ کی ایک ٹانگ ناکارہ ہو چکی تھی۔

"وقت مت ضائع کرو' جو کہتا ہوں وہ کرو، جلدی سے نکل جاؤ" اس نے کراہتے ہوئے کہا۔

زینو ماں کو گھسیٹتی آگے بڑھ گئی۔ کرم داد اپنی زخمی ٹانگ لیے ایک ایک انچ بڑھنے لگا۔ اس نے ہاتھ لگا کر دیکھا دھوتی خون میں لت پت ہو گئی تھی۔ درد کی ٹیسیں ناقابل برداشت تھیں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا اور وہ غش کھا کر گر پڑا۔

جب اسے ہوش آیا تو دن کی روشنی پھیل چکی تھی اس نے گرد و پیش پر نظر ڈالی کئی لاشیں پڑی تھیں۔ زمین خون سے سرخ ہو رہی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ چاروں طرف بھارتی فوجی پھرتے نظر آئے۔ دائیں سمت چند ٹینک اور بہت سی چھوٹی بڑی توپیں دکھائی دیں۔ وہ کھیتوں سے ابھی بہت دور تھا۔ اسے فکر لاحق ہوئی کہ نہ جانے جنداں اور زینو وہاں پہنچ بھی سکی ہیں یا نہیں۔ وہ درد کی شدت سے تڑپنے لگا۔ چلنا تو کجا اٹھنا بھی ناممکن تھا۔ فضا میں سکوت طاری تھا۔ کہیں سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ اسے یہ جاننے میں دیر نہ لگی کہ گاؤں پر بھارتی فوج کا مکمل قبضہ ہو چکا تھا۔ اب کیا ہوگا؟ جنداں اور زینو کہاں ہوں گی؟ ان پر اور گاؤں کے دوسرے لوگوں پر کیا گزر رہی ہوگی۔ وہ یہاں سے کس طرح آگے بڑھے۔ اسے سخت پیاس لگ رہی تھی۔ آنکھوں کے آگے تارے ناچ رہے تھے۔ اسے موت کا کوئی خوف نہ تھا لیکن وہ جنداں اور زینو کو مصیبت میں چھوڑ کر ابھی مرنا نہیں چاہتا تھا۔

اس نے ہمت کر کے رینگنے کی کوشش کی۔ ابھی اس نے جسم کو تھوڑا سا سرکایا ہی تھا کہ اسے سامنے زمین پر دو سائے نظر آئے۔ اس نے سر گھما کر دیکھا دو سکھ سپاہی رائفلیں تانے کھڑے تھے۔

"تو ابھی تک زندہ ہے؟" ایک نے رائفل کا کندا اس کی پشت پر مارا اور وہ بلبلا اٹھا۔

"اسے گولی مار دو' آرام سے مرے گا" دوسرے نے کہا۔

"دیکھتے نہیں کتنی تکلیف میں ہے"۔

"اگر آرام سے مرنے دیا گیا تو کیا مزا آئے گا" پہلے نے مکروہ قہقہہ لگایا" اسے تڑپ تڑپ کر مرنے دو"۔

"ٹھہرو ذرا پوچھیں کہیں مال وال تو نہیں چھپا رکھا ہے؟" دوسرے نے کہا اور کرم داد کے پاس اکڑوں بیٹھ گیا۔

"کیوں مُسلے!" اس نے کرم داد کی گردن پکڑ کر کہا۔

"تیری جورو بیٹی بھی ہے؟"

کرم داد کی آنکھوں میں خون اتر آیا لیکن اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

"اگر ہوگی بھی تو بتائے گا تھوڑے ہی" دوسرے نے اس کی پشت پر رائفل کا کندا مارا اور اس کے منہ سے چیخ نکل گئی "یا مولا! یا مولا" دونوں فوجی کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

"بلانا اپنے مولا کو ذرا" ایک نے کہا "رائفل بہت مضبوط ہے" کرم داد نے جواب نہ

دبا اور کراہتا رہا۔

اگر کسی لڑکی وڑکی کو کہیں چھپا دکھا ہے تو بتا دے۔ تیری مرہم پٹی بھی کر دیں گے اور کھانا بھی دیں گے۔ ورنہ تڑپ تڑپ کر مر جائے گا“۔ ایک نے ہمدردی جتائی، کرم داد نے پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

اکڑوں بیٹھے ہوئے سپاہی نے اس کے سر کو بالوں سے پکڑ کر دو تین مرتبہ زمین پر پٹکا اور چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

کرم داد کے ماتھے سے خون بہنے لگا اور بلند آواز سے کلمہ پڑھنے لگا۔ دوسرے سپاہی نے اس کی کمر پر لات ماری اور دونوں چلے گئے۔

”یا رسول اللہ!“ کرم داد نے کراہتی ہوئی آواز سے دہائی دی۔

”میری بیٹی کی عزت بچاؤ“۔

”یا مولا مجھ سے پہلے جنداں اور زیبو کو موت دے دے“۔ اس کی دم توڑتی ہوئی زندگی کی ایک ہی خواہش تھی کہ زیبو مر جائے۔ جس بیٹی کو ڈولی چڑھانے کا ارمان سالہا سال سے سینے میں دبائے وہ بارگاہ ایزدی میں شب و روز دعائیں مانگا کرتا تھا آج اس کی موت کے لیے گڑگڑا کر دعائیں مانگ رہا تھا۔ اب اسے چوہدری چاچا کا انتظار نہیں تھا۔ اسے بارات دیکھنے اور شہنائیوں کی آواز سننے کی تمنا نہیں تھی۔ اسے زیبو کے جوڑے بنانے کے لیے بھینس بیچ دینے کی فکر نہیں تھی۔ اسے اس لمحے زندگی اور موت کے دوراہے پر، اپنی اکلوتی، لاڈلی بیٹی کے لیے دو گز زمین اور لٹھے کے کفن کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ وہ تو چاہتا تھا کہ وہ کہیں کسی کھیت میں مر جائے اور اس کی بے گور و کفن لاش کو کتے اور گدھ کھا جائیں۔ اسے اپنی بیوی کی بوڑھی ہڈیوں کی فکر نہیں تھی۔ بیٹی کے جوان جسم کا تحفظ مقصود تھا۔ اس سے کچھ بن نہ پڑا تو زمین پر سر پٹکنے لگا۔

آسمان پر کوے اور گدھ منڈلا رہے تھے۔ آج ان کی بن آئی تھی۔ وہ مردار جانور کا سڑا ہوا گوشت کھا کھا کر تنگ آ گئے تھے۔ آج انسانوں کا تازہ تازہ گرم لذیذ گوشت ان کا کھاجا بن رہا تھا۔ زمین پر پڑے ہوئے انسانوں میں وہ بھی تھے جن کی روح کا جسم سے ناطہ ٹوٹ چکا تھا اور وہ بھی جو اب تک سسک رہے تھے بھارتیوں کی گولیوں سے بچ رہنے والے ان کی سنگدلی سے تڑپ تڑپ کر دم توڑ رہے تھے۔ خوش نصیب تھے وہ مرد جن کی بیٹیاں اور بہنیں ان کی آنکھوں کے سامنے خاک و خون میں تڑپ کر ٹھنڈی ہو چکی تھیں اور بدنصیب تھے وہ جن کی بیٹیاں اور بہنیں ابھی زندہ تھیں۔ بھارتی فوجیوں کے لیے سامان نشاط بننے پر مجبور کی گئی تھیں۔ نہ جانے کتنے کرم داد اپنی اپنی زیبو کے لیے تڑپ رہے تھے۔

ایک گدھ کرم داد کے سر پر دیر سے منڈلا رہا تھا۔ کرم داد کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔ کچھ دور دو نسوانی چیخیں اور بھارتی فوجیوں کے قہقہے گونج رہے تھے۔ چیخیں اور قہقہے بدستور گونجتے رہے۔ کرم داد کا خون کھول رہا تھا لیکن وہ مجبوریوں کی اتھاہ گہرائیوں میں گھرا ہوا تھا۔

معاً اس کے کانوں میں اللہ اکبر کی آوازیں گونجیں اور ساتھ ہی گولہ باری سے کان کے پردے پھٹنے لگے۔ بھارتی سپاہی ہڑبڑا کر مورچے سنبھالنے لگے۔ پاکستانی فوج پہنچ چکی تھی۔ کرم داد کے چہرے پر سرخی دوڑنے لگی اور وہ سر اٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ منہ ہی منہ میں پاکستان کی فتح و نصرت کی دعائیں مانگنے لگا۔ پاکستانی فوجی ابھی دور تھے۔ آسمان پر منڈلانے والے گدھ قریب تھے۔ زندگی کی آخری منزل قریب تھی۔ پھر اس کے ہونٹ ہلنے بند ہو گئے۔ ایک گدھ قریب اور قریب آ گیا!



اسماء الحسنٰی کامیابی کا راستہ

پیر شاہ محمد قادری

شکیلہ تبسم۔ کراچی

○ محترم! میرا ایک مسئلہ ہے کہ میرے بچے بہت ذہین ہونے کے باوجود بعض اوقات ٹیسٹ میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔ عام حالات میں وہ بہت اچھے نمبر لیتے ہیں مگر جب انہیں یہ بتا دیا جائے کہ آج امتحان ہے ٹیسٹ ہے تو پھر وہ پتا نہیں کیوں خوفزدہ سے ہو جاتے ہیں، اس صورت حال کے لئے کوئی نقش تجویز فرمائیے۔ آپ کی دعاؤں کی طلبگار۔ آپ کی بہن

☆ عزیز بہن! اللہ تعالیٰ آپ کو اور تمام بہن بھائیوں کو اپنی رحمتوں اور برکتوں کے سائے میں رکھے آپ سب کی حوصلہ افزائی ہے جو کہ اتنا بڑا دینی پروجیکٹ پایہ تکمیل کی جانب رواں دواں ہے۔ آپ سب کی دعاؤں کا بے حد شکریہ آپ کے بچوں کے لئے امتحانی کامیابی اور خیر و برکت کیلئے لوح عطا رد

ارسال کی جا رہی ہے۔ بروز جمعہ سورۃ الجمعہ تین مرتبہ پانی پر دم کر کے پلایا کریں اول آخر 11 مرتبہ درود شریف۔

○ سمر۔ شیخوپورہ

☆ آپ اپنی صحت کے لئے کسی اچھی لیڈی ڈاکٹر سے مشورہ کیجئے۔ بھائی کے لئے علاج ورتعلیم کے سلسلے میں دوبارہ میڈیکل رپورٹس کے ساتھ خط لاہور کے پتے پر لکھیں۔

○ صدف جاوید۔

☆ عزیز بہن! دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے شوہر کو ہدایت دے (آمین) آپ بکثرت "یاعزیز یاقدوس" پڑھا کریں اول آخر 11 مرتبہ درود شریف۔ آپ لاہور کے پتے پر براہ راست بھی خط لکھ سکتی ہیں۔ دعاؤں کا شکریہ

○ ع۔ ر۔ اوسلو ناروے

☆ عزیز بہن! اللہ تعالیٰ آپ کی ازدواجی ناہمواری کو بہتر فرمائے (آمین) از روئے استخارہ اس فیصلے کے نتیجے میں کافی مسائل جنم لیں گے۔ اس لئے بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھائیں بکثرت "یاستار" پڑھا کریں۔ آپ لاہور کے پتے پر براہ راست خط بھیج سکتی ہیں میرا ذاتی فون نمبر 92300-8425381+ پاکستانی وقت کے مطابق صبح 10 بجے تا رات 10 بجے تک کال کر سکتی ہیں۔ دعاؤں کا شکریہ

○ ہانیہ۔ آزاد کشمیر

☆ آپ کے معاملات میں خصوصاً بیرون ملک کے سفر میں تاخیر ہے۔ "یافتاح" بکثرت پڑھیں۔ نماز کی پابندی کیجئے۔

○ روشنی رحمان۔ سرگودھا

☆ عزیز بیٹی! مایوس نہیں ہوتے بکثرت "یاوہاب" پڑھا کریں۔ حسب توفیق صدقہ دیں۔

اللہ تعالیٰ کرم فرمائیں گے۔ انشاء اللہ

عفراء خاتون۔ کوٹ عبدالمالک لاہور

○ محترم! گزشتہ طویل عرصے سے عجیب سی کیفیت رہتی ہے یوں لگتا ہے کہ جیسے کوئی اندر ہی اندر کلیجہ کھرچ رہا ہے گھر میں عجیب قسم کی بدبو کا احساس ہوتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے کاموں میں رکاوٹ پڑتی ہے یوں لگتا ہے کہ جیسے کسی نے ہمیں ان دیکھی زنجیروں میں جکڑ لیا ہے۔ بچی کی نسبت جہاں ڈیڑھ سال سے طے تھی انہوں نے اچانک بغیر کسی معقول وجہ کے رشتے سے انکار کر دیا بیٹے کا اقامہ اچانک کینسل ہو گیا شوہر کا ایکسیڈنٹ ہو گیا اور ٹانگیں ٹوٹ گئیں ایک دن اچانک ایسا شارٹ سرکٹ ہوا کہ فریج، ٹی وی، مائیکرو ویو اوون گیزر سب بھک سے جل گئے۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے نادیدہ بلاؤں نے چاروں طرف سے اپنا حصار کر لیا ہے۔ آپ از روئے استخارہ کچھ ارشاد فرمایئے اور اس صورتحال کا تدارک کے لیے کچھ کیجئے۔ بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ سخت قسم کی بندش اور سفلی علم کیا گیا ہے کچھ نہیں آتا کہ ہم سے کیا گناہ کیا تقصیر ہو گئی ہے جو زندگی یوں عذاب کی لپیٹ میں ہے۔

☆ عزیز بہن! از روئے استخارہ یہ تشخیص درست ہے کہ آپ حقیقتاً سفلی اور آسیبی معاملات میں مبتلا کر دی گئی ہیں۔ ۔ یہ اس کا غالباً آپ کا کسی خاص معاملے میں انکار تھا بہر کیف ظالم کا قہر اللہ کی رحمت کاملہ کے آگے کوئی حیثیت نہیں رکھتا ہے آپ ذاتی طور پر "عمل اتار" اور متعلقہ نقوش دفتر سے منگوا لیں سورۃ بقرہ کی تلاوت کثرت سے کیجئے۔ اور گھر میں باقاعدگی سے پنج وقتہ اذان اور نماز کی طرف توجہ دیجئے۔ انشاء اللہ حالات میں فرق پڑ جائے گا۔

سہیلہ کریم۔ کراچی

○ محترم! اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ مخلوق خدا آپ

کے بتائے ہوئے وظائف سے صحیح اسلامی طریقے سے فیض یاب ہورہی ہے۔ ہماری تو ہر سانس میں بھی دعا نکلتی ہے کہ آپ اور تمام اہل خانہ دین، ایمان، اور مقامات دنیا میں ہمیشہ عروج پر فائز رہیں۔ میرا ایک مسئلہ یہ ہے کہ میں ہر بات میں بہت جلدی گھبرا جاتی ہوں۔ بچوں کو اسکول سے دیر ہوجائے میاں اگر کسی مہمان کو باہر چھوڑنے کے لئے جائیں، نوکرانی کسی دوسری نوکرانی سے کھسر پھسر کرے تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ جیسے کوئی سازش ہورہی ہے سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ ایسا کیوں ہوگیا ہے حالانکہ پہلے تو میں ایسی نہیں تھی۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میری بیٹی کی شادی کا مسئلہ کسی صورت حل نہیں ہورہا ہے۔ لہٰذا آپ اس حوالے سے مجھے کوئی نقش یا لوح عنایت فرمائیں۔ گیارہویں شریف کے لئے پچیس ہزار مرتبہ درود شریف اس کو میری جانب سے شامل کر لیجئے گا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ اپنے حفظ وامان میں رکھے (آمین) آپ کی بہن۔ آپ کے لئے ہمیشہ دعا گو!

☆عزیز بہن! اللہ تعالیٰ آپ سب کو بھی ہمیشہ عافیت کی چھاؤں میں رکھے (آمین) آپ ہر نماز کے بعد "یاقوی یاسلام" 125 مرتبہ پڑھ کر دعا کرلیا کریں اول آخر 11 مرتبہ درود شریف۔ آپ کی کیفیت کے پیش نظر آپ کو لوح اسم ذات ارسال کی جارہی ہے۔ حسب ہدایت استعمال سے آپ کے خوف اور پریشانی میں کمی آجائے گی۔ انشاء اللہ

مراد بخش۔ کوٹلی لوہاراں

○ محترم! میری پریشانی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ میں مستقل مزاج نہیں ہوں۔ وہمی اور شکی بھی ہوں، بات بات پر نخرہ کرتا ہوں اور ایمانداری سے اپنا تجزیہ کروں تو آپ کو صاف صاف کہہ دوں کہ میں جلد باز، غصہ ور، کینہ پرور، اور کنجوس ہوں۔ میری بیوی بہت اچھی ہے میری ساری خامیاں برداشت کرتی ہے لیکن میں اس کے ساتھ بدسلوکی کرتا ہوں پھر بعد میں پچھتاتا ہوں مجھے کوئی ایسا اسم الٰہی عطا کریں کہ جس سے میں نرم مزاج ہو جاؤں میری خامیوں کی اصلاح ہوسکے۔ میں نے آپ کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا ہے اس امید پر کہ آپ کے در سے خالی ہاتھ نہیں جاؤں گا۔ میری مدد کیجئے آپ کا پرستار اور ادنیٰ خادم آپ کی نظر کرم کا شدت سے منتظر۔

☆عزیزم! اللہ تعالیٰ آپ کی اور ہم سب کی اصلاح فرمائے اور ہماری بھلائی کے راستے کھول دے (آمین) جب انسان کے اندر اصلاح کی خواہش ہو خود کو بدلنے کی سچی آرزو ہو تو اللہ تعالیٰ یقیناً مدد فرماتا ہے آپ کوشش کریں کہ زیادہ سے زیادہ باوضو رہا کریں اور بکثرت "یاقدوس" پڑھا کریں لوح اسم ذات برائے اصلاح اور روحانی ترقی کے لئے ارسال کی جارہی ہے نماز کی پابندی فرمائیں۔

مریم کوثر۔ اسلام آباد

○ محترم! گزشتہ کافی عرصے سے شدید پریشان ہوں سمجھ میں نہیں آتا کہ کس سے مشورہ لوں، ایک خاتون نے مجھے آپ کا کالم پڑھوایا۔ ایسا لگا کہ جیسے اندھیرے میں روشنی مل گئی۔ میں ایک ملٹی نیشنل کمپنی کے مقامی دفتر میں کام کرتی ہوں وہاں مجھے ایک کولیگ نے پرپوز کیا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کیونکہ میں اپنے بہن بھائیوں کی پرورش کا عزم لیکر گھر سے نکلی تھی اور تیسرے ہی مہینے میں کس طرح اپنے مقصد سے بے وفائی کرسکتی تھی۔ مگر اس کا اصرار بڑھتا ہی گیا پھر ایک وقت ایسا آیا کہ میں اس سے گریز نہ کرسکی اور اس سے اقرار کر بھی لیا مگر میں نے اس کو اپنے سارے حالات بتادیئے کہ میں تم سے محبت تو کرسکتی ہوں مگر کم از کم مجھے سات سال شادی نہیں کرسکتی۔ کیونکہ اس وقت تک میرے بہن بھائی پڑھ لکھ کر کسی قابل ہوسکیں گے اس نے فوراً ہی

اس صورت حال کو قبول کرلیا کیونکہ اس پر بھی بہت ذمے داریاں تھیں۔ اس کے بعد یوں ہوا کہ اس کا ایک دوست آسٹریلیا چلا گیا اور اپنا فلیٹ اس کو دے گیا کہ تم بہت دور رہتے ہو یہاں رہا کرو اس طرح تمہیں ہر ہفتے گاؤں آنے جانے سے نجات مل جائے گی۔ وہ بہت خوش ہوا، پھر اس فلیٹ کو میں نے سجایا سنوارا۔ وہ کہنے لگا گھر مل گیا ہے چاہے عارضی طور پر ہی سہی (یہ عارضی سال کم از کم پانچ سال تھے) ہم لوگ اکثر ویک اینڈ اکٹھا گزارتے اور اس سے پہلے کہ جذبات کے ہاتھوں کوئی غلطی کرتے ہم نے باہمی رضامندی سے نکاح کرلیا۔ بدقسمتی یہاں سے شروع ہوتی ہے کہ ایک دن میری والدہ نے مجھے اس کے ساتھ گھومتے دیکھ لیا پھر انہوں نے کوشش کر کے میرا فلیٹ بھی دیکھ لیا پھر ایک دن وہ فلیٹ پر آ پہنچیں۔ اب وہ سخت ناراض ہیں انہوں نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔ حالانکہ میں نے اور میرے شوہر نے ان سے پاؤں پکڑ کر معافی مانگی، ہمارے دو تین کولیگ جو اس صورت حال سے واقف تھے انہوں نے نکاح کی گواہی دی، نکاح نامہ دکھایا مگر میری والدہ کی ناراضگی برقرار رہی۔ خدا گواہ ہے کہ اب تک میں نے گھریلو اخراجات میں کوئی کمی نہیں کی۔ اور ہمیشہ انہیں پیسے دینے کی کوشش کی۔ مگر وہ مجھ سے پیسے نہیں لیتی ہیں، اس قدر تنگی ترشی میں وقت گزار رہی ہیں کہ کیا بتاؤں آج اس خط کو لکھنے کی وجہ یہ بھی ہے کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ انہوں نے کسی گھر میں کھانا پکانے برتن دھونے کی نوکری کرلی۔ میرے چھوٹے بھائی مجھ سے ملنے کے لئے ترستے ہیں۔ مگر ماں کو چھوڑ نہیں سکتے۔ دال چٹنی کھا لیتے ہیں مگر مجھ سے پیسے لینے کی انہیں اجازت نہیں ہے ماں نے مجھے بہن بھائیوں سے ملنے سے نہیں روکا مگر میں ان سے مل کر کیا کروں، جب وہ مجھے ایک گلاس پانی بھی دے نہیں سکتے۔ میرے شوہر نے میری تنخواہ کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا۔ وہ کہتے ہیں کہ تم پہ یہ ساری مصیبت میری وجہ سے آئی ہے، ان کی باتوں میں سچائی بھری ہے۔ میں والدہ کو منانا چاہتی ہوں۔ کوئی ایسا اسم بتایئے کہ جس سے میری ماں مجھ کو واپس مل جائیں کوئی لوح عنایت کردیں تو بہت ہی مہربانی ہوگی۔ اس کے علاوہ میں چاہتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اولاد کی نعمت بھی عطا فرمادیں۔ آپ کی بہن محتاج دعا۔

☆ عزیز بہن! اللہ تعالیٰ آپ پر فضل و کرم فرمائے (آمین) بنیادی طور پر آپ نے کوئی شرعی اعتبار سے غلطی یا گناہ نہیں کیا مگر آپ نے چونکہ ان کے علم میں لائے بغیر یہ کام کیا اس لئے ان کی ناراضگی ہوئی دوسری اہم بات یہ بھی ہے کہ آپ کے والد کے انتقال کے بعد انہوں نے تمام توقع آپ سے وابستہ کرلی تھی اس حوالے سے بھی ان کا ردعمل شدید ہوا۔ تاہم خوشی اس امر کی ہے کہ آپ کے شوہر آپ کے معاملات میں آپ کے ساتھ مکمل تعاون کررہے ہیں آپ ہر نماز کے بعد "یا عزیز یا قدوس" پڑھا کریں 140 مرتبہ اول آخر 11 مرتبہ درود شریف والدہ کے لئے لوح تسخیر خاص اور اولاد کے لئے علاج ورعقیم ارسال ہے دعاؤں کا شکریہ

محمد ادریس۔ راولپنڈی

○ محترم! آج سے 7 سال پہلے میری نوکری بہت اچھی تھی میں نے نوکری چھوڑ کر پراپرٹی کا کام شروع کردیا جس میں، میں نے بہت پیسا کمایا میرا کام زیادہ فائلوں کا ہوا کرتا تھا جتنے لوگوں کو میں نے فائلیں دلوائیں تھیں ان کو شروع میں تو منافع ہوا لیکن اب ان فائلوں کے ریٹ کافی کم ہوگیا ہے میں نے بھی جو پیسہ کمایا اس پیسے کی فائلیں خریدلی تھیں۔ اب نہ روزگار اور نہ کوئی سرمایہ ہے کہ کوئی کاروبار کرسکوں

میری مدد فرمائیں۔

☆ ''یاوہاب یافتاح'' بکثرت پڑھا کریں۔نماز کی پابندی فرمائیں۔لوح مشتری ارسال ہے۔

حمیرا نثار۔چوک اعظم

○ محترم! اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے میری شادی کو پانچ سال ہو گئے ہیں لیکن ابھی تک اولاد کی نعمت میسر نہیں آئی ہے۔شادی کے پہلے سال تین ماہ کے بعد حمل ضائع ہو گیا تھا۔ پھر اس کے بعد آج تک کوئی معاملہ نہیں ہوا ہے۔ جبکہ طبی اعتبار سے ہم دونوں بالکل فٹ ہیں۔آپ سے درخواست ہے کہ آپ محفل دعا میں ہمارے لئے اولاد کی دعا بھی فرمائیں اور اس حوالے سے مجھے روحانی علاج بھی تجویز فرمایئے۔

آپ کی بیٹی۔ہمیشہ آپ کے لئے دعا گو

☆ عزیز بیٹی! اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیشہ آپ کے گھر کو شاد و آباد رکھے (آمین) آپ ہر نماز کے بعد 140 مرتبہ ''یاکریم یاسلام یاوارث یاباقی'' پڑھ کر دعا کریں اول آخر 9 مرتبہ درود شریف۔آپ کی فرمائش پر اولاد نرینہ کے لئے علاج درعقیم ارسال کیا جارہا ہے۔دعاؤں کا شکریہ

محمد اکبر۔لیاقت آباد کراچی

○ محترم! کافی ماہ سے ہمت کر رہی ہوں کہ آپ کو خط لکھوں مگر ہمت نہیں ہو رہی تھی میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے شوہر نے ہمیشہ مجھے دوسرے درجے کی عورت سمجھا۔ کبھی محبت اور پیار سے بات نہیں کی۔ کبھی بھروسہ نہیں کیا۔میری ساری زندگی کی کمائی چار بچے ہیں جو کہ میاں کے سامنے موم کے پتلے بنے رہتے ہیں میرے شوہر مجھے جوان اولاد کے سامنے پیٹتے ہیں اس طرح کھینچ کھینچ کر مارتے ہیں کہ بعض اوقات قمیض پھٹ جاتی ہے جوان اولاد کے سامنے بے عزتی ہوتی ہے۔مجھے طلاق کا نہیں موت کا خوف طاری رہتا ہے۔شوہر ایسا جنونی شخص ہے کہ کیا بتاؤں ان کو عورت پر اعتبار ہی نہیں۔ ہمیشہ کنجری کے لفظ سے یاد کیا۔سمجھ میں نہیں آتا کہ کس گناہ کی سزا مل رہی ہے۔کبھی جی چاہتا ہے کہ خودکشی کر لوں مگر پھر سوچتی ہوں کہ اس حرکت کے بعد اگر خدا مجھ سے روٹھ گیا تو میرا ٹھکانہ کہاں ہوگا؟ بس انہی وجوہات کی بناء پر خودکشی نہیں کر سکی۔چاروں جوان بیٹے باپ سے خوف زدہ رہتے ہیں یوں لگتا ہے کہ انہیں خوابوں میں بھی صرف باپ ہی دکھائی دیتا ہے۔ میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ میرا شوہر تشدد سے باز آجائے۔کیونکہ مجھ میں اب مزید زخم کھانے کی استطاعت نہیں رہی ہے اس کے لئے آپ مجھے کوئی تعویز کوئی دعا بتا دیجئے۔یہ آپ کا مجھ پر سب سے بڑا احسان ہوگا۔آپ کی دکھیاری بہن۔ہمیشہ آپکے لئے دعا گو رہے گی۔

☆ عزیز بہن! اللہ تعالیٰ آپ کو آپ کے صبر اور استقامت کی جزا دنیا اور آخرت دونوں ہی جگہ دے گا انشاء اللہ آپ جیسی عورتوں نے ہی ہمیشہ آبرو قائم رکھی ہے۔ درحقیقت جب انسان بچپن سے عورت کا منفی رخ دیکھتا آئے تو پھر اس کا یقین عورت ذات سے اٹھ جاتا ہے آپ کے شوہر کی والدہ کا کردار ان کی نفسیات پر اثر انداز ہوا اور یوں ایک عورت کی غلطی دوسری عورت کے لئے سزا بن گئی۔آپ بکثرت "یاقدوس" پڑھا کریں۔آپ کی فرمائش پر لوح تسخیر خاص ارسال کی جارہی ہے۔دعاؤں کا شکریہ۔

پیر شاہ محمد قادری B-359، فیصل ٹاؤن لاہور۔ پاکستان

فون نمبرز: +92-42-35167842-35168036

بذریعہ خط جواب کے لئے جوابی لفافہ ہمراہ ارسال کریں۔

وقت ملاقات: ظہر تا عشاء (تعطیل جمعتہ المبارک)

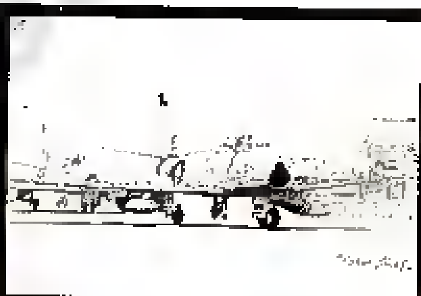
ایم اسلم

شہر لاہور پہ

لڑائی کے پہلے دن سے متواتر سترہ روز تک یعنی جب تک لڑائی جاری رہی نہ کسی کے چاقو مارا گیا، نہ کسی کو خنجر گھونپا گیا اور نہ کہیں چوری کی واردات ہوئی نہ کسی کی جیب کٹی نہ کہیں گالی گلوچ اور نہ کہیں سے لپاڑ کی خبر ملی۔ ہاں جب تک جنگ رہی لاہور کی مساجد میں پانچوں وقت غیر معمولی رونق نظر آئی۔ رات کو جگہ جگہ قرآن خوانی اور مولود خوانی ہوتی۔

ستمبر 65ء کی جنگ میں لاہوریوں کی ہمت و حوصلہ کا آنکھوں دیکھا حال

لاہور والوں کا پانچ ستمبر 65ء کا دن حسب معمول زندگی کے ہنگاموں میں گزر گیا جس طرح دن بھر لاہور کے کوچہ و بازار میں چہل پہل رہی اسی طرح رات کے بارہ بجے تک سینما گھروں میں رونق رہی۔ نصف شب کے قریب اچانک لاہور کی اکثر مساجد کے لاؤڈ اسپیکروں کی کرخت آواز نے سونے والوں کو بیدار کر دیا۔ لاؤڈ اسپیکر لاہور پر بھارت کے حملے سے خبردار رہنے کی ہدایت کر رہے تھے۔ لاہور والے یہ اعلان سن تو رہے تھے لیکن جو کچھ سن رہے تھے۔ اس پر انہیں یقین نہیں آ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد چند خاکسار جیپ میں بیٹھے آلۂ صوت سے لاہور والوں کو بتا رہے تھے کہ رات کے کسی وقت بھارتی طیارے لاہور پر حملہ









کریں گے۔ لوگ اپنی حفاظت کا انتظام کرلیں لیکن لاہور کے خوش فکروں کی ادا سب سے نرالی تھی۔ خوف زدہ یا ہراساں ہونے کی بجائے جن لوگوں کے پاس بندوقیں تھیں، گھروں سے نکل کر بازاروں میں آگئے۔ بعض آدمی بندوقیں پکڑ کر اپنے کوٹھوں پر چڑھ گئے۔ سب کی آنکھیں آسمان کی فضاؤں کو چیرتی نظر آتی تھیں۔ کان کوئی خوفناک دھماکہ سننے کے منتظر تھے، کچھ اللہ والے اللہ کو یاد کررہے تھے۔ وقت گزر رہا تھا۔آسمان کی نیلی نیلی خاموش فضاؤں میں تاروں کا قافلہ اپنی اپنی منزل پر رُکا ہوا نظر آتا تھا۔ کچھ دیر بعد اِدھر اُدھر سے وقت کے تعقیب غمن بجنے کا اعلان کرنے لگے۔ خطرے کا اعلان رات کے ایک بجے کے قریب ہوا تھا۔ اعلان ہوئے دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ لوگوں کی آنکھیں آسمان کو گھورتے تھک گئی تھیں۔ بازاروں میں پہرہ دیتے ،بچے پاؤں بوجھل ہو رہے تھے۔ عورتوں اور بچوں کی آنکھیں نیند سے مندنے لگی تھیں۔ بعض لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ ہوائی حملے کا اعلان بھی ایک مذاق ہی تھا۔ بعض کا خیال تھا کہ حکومت نے لوگوں کی چوکسی کا امتحان لینے کو یہ اعلان کیا تھا۔ ستارے رات کا سفر طے کر کے آسمان کی بے پایاں وسعتوں میں آنکھیں جھپک رہے تھے اور سویرا رات کی تاریکیوں کا دامن چاک کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اِدھر اُدھر سے نعرۂ توحید اللہ اکبر، اللہ اکبر، لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ فضا میں ایک ارتعاش سا پیدا کرتا سنائی دینے لگا۔ لوگ بیدار ہو ہو کر نماز کی تیاری کرنے لگے اور گھروں سے نکل نکل کر مسجدوں کو ہو لیے۔ کچھ گھروں میں ہی قبلہ رو ہو کر کھڑے ہوگئے اور بہت سے ایسے بھی تھے جو ابھی تک نیند کے مزے لے رہے تھے۔ سپیدۂ سحر کے نمودار ہوتے ہی ایک عجیب سی گرج تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد سنائی دینے لگی۔ یہ گھن گرج کہیں نزدیک ہی سے آرہی تھی۔

لاہور والے سمجھ رہے تھے کچھ فاصلے پر توپیں چل رہی ہیں۔ لاہور کا قلعہ جب سے محکمہ آثار قدیمہ کی تحویل میں چلا گیا تھا، قلعہ کی فوج وارث روڈ پر لاہور کیریژن میں منتقل ہوگئی تھی لیکن کبھی کبھی کیریژن سے توپوں کی آواز بھی سنائی دیتی تھی لیکن یہ توپیں اسی وقت چلتی تھیں جب صوبے کا گورنر لاہور سے کہیں باہر جارہا ہو یا دورے پر سے واپس آرہا ہو یا توپیں کسی سرکاری معزز مہمان کی سلامی کے موقع پر چلائی جاتی تھیں۔ لیکن آج توپوں کا انداز کچھ اور ہی تھا۔ آواز بھی معمول سے زیادہ خوفناک تھی اور دھماکے بھی دلوں میں کچھ خوف سا پیدا کررہے تھے۔ سورج کے نکلتے نکلتے پھر سارے لاہور میں یہ خبر پھیل گئی کہ گزشتہ رات بھارتی فوج پاکستان کی حدود میں داخل ہوگئی ہے اور دو بجے پر جو لاہور سے صرف سولہ میل دور تھا آپہنچی ہے اور گولے برسارہی ہے۔ دشمن لاہور سے صرف سولہ میل دور تھا۔ اُس کی توپیں آس پاس کے مقامات پر گولہ باری کررہی تھیں۔ گولوں کی آواز سے لاہور کے بام ودر کانپتے معلوم ہوتے تھے دشمن رات کی تاریکی میں سانپ کی طرح رینگتا ہوا اچانک لاہور کے دروازے پر آپہنچا تھا اور لاہور کی طرف بڑھنے کی کوشش کررہا تھا۔ الامان الحفیظ۔ لاہور والے کیسے خوفناک خطرے سے دوچار تھے۔ وہ خطرہ جو گزشتہ اٹھارہ سال سے پاکستان پر منڈلا رہا تھا آج لاہور والوں کے سر پر آن پہنچا تھا لیکن اس خطرے کا جس نے لاہور والوں کے موت اور زندگی کا سوال پیدا کردیا تھا۔ لاہور والوں کی طرف سے ردعمل کیا ہوا؟ کیا لاہور والے خوف زدہ ہو کر لاہور سے بھاگنے لگے تھے یا پناہ کی جگہ تلاش میں گھروں سے نکل کر ادھر اُدھر بھاگتے پھرتے تھے یا لاہور میں خوف و ہراس پھیل گیا تھا، لاہور کے بازار سنسان نظر آنے لگے تھے یا لاہور کے کالج اور سکول بند ہوگئے تھے؟ نہیں اس قسم کی کوئی بات کہیں نظر نہیں

آتی تھی۔ اس کے برعکس زندہ دلان لاہور کے روزمرہ میں کوئی خلل نظر نہیں آتا تھا۔ بازار حسب دستور کھلے ہوئے تھے۔ طالب علم بغل میں بستے دبائے سکول اور کالج جارہے تھے۔ کارخانے کھلے تھے۔ دفتروں میں حسب معمول کام ہورہا تھا۔ خوانچے والے اور بھیجڑے بر روز کی طرح گلی کوچوں میں ہانک لگا رہے تھے۔ بھک منگے ہاتھ پھیلا کر بھلا تیرا بھلا ہوگا، آنکھوں والوں آنکھیں بڑی نعمت ہیں کی صدا لگا رہے تھے۔ بازاروں میں کاروبار حسب معمول چل رہا تھا۔ دشمن کی توپوں کی آواز بھی آرہی تھی اور دکانوں پر پوری حلوہ بھی بک رہا تھا۔ انارکلی، بانو بازار، اعظم مارکیٹ اور مال پر شاپنگ کے وہی انداز تھے۔ سورج ڈھلے کرکٹ، فٹ بال، ہاکی اور پتنگ بازی ہوتی تھی۔ سینماؤں میں وہی رش اور رونق تھی۔ رات کو ارباب نشاط کے کوٹھوں پر ہارمونیم، سارنگی اور طبلے کی تھاپ کے ساتھ رقص و سرود کی محفلیں بھی جمتی تھیں۔ سڑکوں پر موٹروں، سکوٹروں، بائیسکل اور تانگے کی تیز رفتاری بھی وہی تھی اور توپوں کی گھن گرج بھی برابر سنائی دیتی تھی۔ یہ بھی لاہور والوں کی ایک ادا تھی۔ ایک ادا اور بھی تھی۔ سرحد پر لڑائی شروع ہوچکی تھی اور سرحد لاہور شہر سے صرف پندرہ سولہ میل دور تھی۔ دشمن اور لاہور والوں کے درمیان صرف نہر حائل تھی۔ دشمن کی توپوں کی ہولناک آواز تھوڑے تھوڑے وقفے بعد کانوں کے پردے پھاڑتی اور لاہور کے اکثر منچلے موٹروں، بسوں، سکوٹروں اور تانگوں پر سوار ہوکر لڑائی کا تماشا دیکھنے اور پاکستان کے پاسبانوں کا ہاتھ بٹانے کے لیے واہگے کی طرف جاتے نظر آتے تھے۔ لاہور والے اگر میلے ٹھیلوں، کھیل تماشے کا شوق رکھتے تھے تو ان کے دل میں قوم کا درد بھی تھا اور وطن پر جان دے دینا بھی کوئی بات نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن باٹا پور کے قریب پاکستان کے فوجی انہیں روک لیتے اور سمجھا بجھا کر واپس بھیج دیتے

اور اسی لاہور شہر کے کچھ ایسے فرزند بھی تھے جو کسی نہ کسی طرح سرحد پر پہنچ کر اپنے فوجی بھائیوں کی مختلف طریقے سے ہاتھ بٹاتے اور ان کی خدمت کرنا اسلام کی خدمت سمجھتے تھے۔ جب بھارتی فوج کی مار دھاڑ اور مظالم سے تنگ آکر سرحد کے آس پاس کی آبادیوں والے اپنے گھر لٹا کر سخت پریشانی کے عالم میں پاکستان کے اندرونی علاقے میں پناہ لینے کے لیے آئے تو لاہور والے ان کی پیشوائی اور خدمت کے لیے پہلے سے موجود ہوتے۔ انہیں کھلاتے پلاتے اور مصائب میں ان سے ہمدردی کرتے۔ لاہور والوں کا یہ روز کا معمول تھا۔

چند روز بعد لاہور کے رنگین مزاجوں نے ایک اور منظر بھی دیکھا۔ ایک روز لاہور سے لاریاں، بسیں، ٹرک واہگے اور برکی محاذ کی طرف جارہے تھے۔ کسی نے خبر اڑادی کہ ان لاریوں، بسوں اور ٹرکوں میں بھارتی سپاہی جو پاکستان کے بہادروں نے لڑائی میں گرفتار کیے ہیں، لائے جائیں گے۔ یہ خبر آگ کی طرح سارے لاہور میں پھیل گئی اور اہل شہر ہزاروں کی تعداد میں واہگے سے آنے والی سڑک پر جاکر کھڑے ہوگئے۔ سب کی نظریں سڑک پر لگی ہوئی تھیں۔ جب کوئی بس یا لاری دور سے آتی نظر آتی تو لاہور والے بڑے زور سے اللہ اکبر اور پاکستان زندہ باد کے نعرے لگاتے۔

20 ستمبر 65ء کو لاہور والوں نے ایک اور تماشا دیکھا۔ دوپہر کا وقت تھا، اچانک فضائی حملے سے شہر والوں کو خبردار کرنے کے لیے بے شمار سائرن بجنے لگے، لیکن لاہور والے خطرے کو کب خاطر میں لاتے تھے۔ کچھ لوگ دشمن کے جہاز دیکھنے کے لیے بازاروں میں نکل آئے۔ کچھ کوٹھوں پر چڑھ گئے۔ شاید آج قدرت بھی لاہور والوں پر مہربان تھی۔ لاہور والوں کو فضائی لڑائی دیکھنے کا موقع مل گیا۔ دشمن

کے تین طیارے بائی کوٹ کی جانب سے شہر کی طرف آرہے تھے اور پاکستانی طیارے شاہین کی طرح ادھر اُدھر سے ان پر جھپٹ رہے تھے اور اس تاک میں تھے کہ موقع ملے تو راکٹ مار کر بھارتی طیاروں کو تباہ کردیں۔ دشمن کے طیارے موچی دروازے کی طرف سے شہر پر آئے پاکستانی شاہین ان کا تعاقب کررہے تھے اور جہاں موقع ملتا دشمن پر راکٹ مارتے۔ کسے معلوم نہیں کہ راکٹ ایک بڑی مہلک اور خطرناک چیز ہے لیکن زندہ دلان لاہور کو اس وقت نہ موت کا ڈر تھا نہ جان کا خوف۔ وہ یہ ہوائی جنگ بڑے شوق سے دیکھ رہے تھے اور والہانہ انداز سے اللہ اکبر اور پاکستان زندہ باد کے فلک بوس نعرے لگا کر پاکستانی ہوا بازوں کی ہمت بڑھا رہے تھے۔ پاکستانی ہوا بازوں نے بھارتی طیاروں کو اس طرح گھیر رکھا تھا کہ وہ بم پھینکنا بھول کر جان بچانے کی فکر میں نظر آتے تھے۔ اُدھر پاکستانی طیارے نہ ٹلنے والی قضا کی طرح ہر طرف سے جھپٹ رہے تھے۔ اسی چھینا جھپٹی میں موچی دروازے کے دو آدمی ہوائی جہاز کی گولی لگنے سے ہلاک ہوچکے تھے لیکن پھر بھی ہوائی جنگ کا جدھر رخ ہوتا لوگ بھی دیوانوں کی طرح بازاروں اور گلیوں میں بھاگتے پھرتے اور قدم قدم پر نعرے لگاتے۔ دلی دروازے کے باہر ہوائی جنگ دیکھنے کے لیے بے پناہ ہجوم تھا۔ قرائن سے معلوم ہوتا تھا کہ پاکستانی ہوا باز اس کوشش میں ہیں کہ دشمن کو شہر سے ہٹا کر ان پر راکٹ ماریں تاکہ راکٹ چلنے سے شہر والوں کو نقصان نہ پہنچے۔ اگر شہر کی حدود میں دشمن پر راکٹ پھینکے جاتے تو ممکن تھا کہ تماشائیوں میں سے بھی اکثر کو جان سے ہاتھ دھونے پڑتے لیکن شاید قدرت کو بھی لاہور والوں کو آج خوش کرنا منظور تھا۔ لوگوں کے دیکھتے دیکھتے دشمن کا ایک طیارہ پاکستانی طیاروں کی آتشبازی سے دلی دروازے سے کچھ پرے ہٹ کر کسی زخمی پرندے کی طرح قلابازیاں کھاتا زمین کی طرف آتا نظر آرہا تھا۔ (یہ طیارہ لاہور سے 13 میل دور کالا شاہ کاکو کے پاس جا گرا تھا) ایک دوطیارے بڑی تیزی سے اپنی سرحد کی طرف پرواز کررہا تھا۔ یہ طیارہ بھی اپنے عقب میں دھوئیں کے بادل چھوڑتا جارہا تھا اور زمین کی طرف جھک رہا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ پاکستانی ہوا بازوں کا نشانہ بن چکا ہے۔ بھارتی فوج کا صرف ایک طیارہ پاکستانی ہوا بازوں سے بچ کر فضا میں گم ہوگیا۔

بھارتی فوج کی مسلسل کوششوں اور بے پناہ گولہ باری اور واہگے کے محاذ پر کیا وہ جان لیوا حملوں کے باوجود محض تائید ایزدی سے لاہور کی فتح کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا، حالانکہ ایک پاکستانی جانباز کے مقابلے پر کہیں پانچ اور کہیں سات ہندوستانی سپاہی تھے۔ بھارتی کمانڈر انچیف جنرل چوہدری نے اعلان کردیا تھا کہ وہ اپنے افسروں کے ساتھ لاہور جم خانہ میں کاک ٹیل پارٹی منائے گا اور یہ بھی قدرت کا شاید ایک کھیل تھا کہ جہاں ہر روز دن میں دو دو اور تین تین خنجرزنی اور چاقو مارنے کی وارداتیں ہوتی تھیں، چوریاں ہوتی تھیں اور جیبیں کٹتی تھیں لڑائی کے پہلے دن سے متواتر سترہ روز تک یعنی جب تک لڑائی جاری رہی نہ کسی کے چاقو مارا گیا نہ کسی کو خنجر گھونپا گیا اور نہ کہیں چوری کی واردات ہوئی نہ کسی کی جیب کٹی نہ کہیں گالی گلوچ اور نہ کہیں سے لڑائی کی خبر ملی۔ ہاں جب تک جنگ رہی لاہور کی مساجد میں پانچوں وقت غیر معمولی رونق نظر آئی۔ رات کو جگہ جگہ قرآن خوانی اور مولود خوانی ہوتی۔ اقبالؒ نے کیا خوب کہا ہے:۔

مقام شوق ترے قدسیوں کے بس کا نہیں
انہی کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد

لاہور! زندہ باد



خواب

حنا اصغر

ایک مفلس شخص کا فسانہ، وہ خوابوں کو پورا کرنے کی سکت نہ رکھتا تھا
اس لیے ان سے دستبردار ہوگیا تھا!

تازہ چنے ......تازہ چنے...... چنے والا آیا!
...... چنے والا آیا۔ چنے لے لو تازہ چنے۔ کرم دین کی بھاری بھرکم آواز اس کو دوپہر کی اس تپتی گرمی لو، شدید تپش اور حبس زدہ ماحول میں خوشگوار بہار کے جھونکے کی مانند لگی تھی۔ تازگی کی اس نئی لہر نے اس کا جسم خوشبوؤں سے معطر کر رہا تھا۔ اس نے شتابی سے کھڑکی کے دونوں پٹ کھول دیے تھے۔ سامنے اس کے خوابوں کا شہزادہ کمر بستہ تکلی باندھے محبت پاش نظروں سے اسی کو تکے جا رہا تھا۔ نوری نے شرما کر اپنا چہرہ دوپٹے کی اوٹ میں کر لیا۔

"مجھ سے پردہ کاہے کو کرتی ہے میں نے تو ساری عمر اس چہرے کو دیکھنا ہے اب تو" کرم دین

بے تابی سے کھڑکی کے قریب آ کر بولا۔ "اندر آ جا ناں....." نوری کے کہنے پر اس نے دائیں بائیں دیکھا، گلی بالکل سنسان تھی پھر بولا" چاچا کیا گھر پر ہے؟" "وہ گھر پر نہیں ہے۔ آج کل دہی بھلے بہت بکنے لگے ہیں اسی لیے صبح سویرے چلا جاتا ہے۔ اب تو ہم نے ٹھنڈے پانی کی سوڈا بھی لگالی ہے"۔

"اچھا یہ تو اچھا ہوا ویسے بھی گرمی بڑھ گئی ہے" جانے کیوں نوری کو کرم دین کا رنگ اُڑتے ہوئے محسوس ہوا تھا۔ "نہیں میں ٹھیک ہوں" نوری کے کیے گئے سوال کا جواب اس نے بہت دیر سے دیا تھا۔

"پہلے تُو مجھے یہ بتا، آ گئی تجھے میری یاد، کتنے دنوں بعد آیا ہے تو؟" نوری نے ماتھے پر بل ڈال کر پوچھا۔ کرم دین کی ساری تھکن ساری کلفت تو اس کو دیکھ کر ہی دور ہو گئی تھی۔ اس کا دیدار کر کے اس کو ناقابل بیان خوشی و اطمینان ملا تھا، کچھ لمحے کی شرمندگی اب دور ہو گئی تھی۔

"میں نیم پر آیا ہوں، تُو ہی اس گرمی میں منہ سر لپیٹے پڑی تھی، کافی دیر سے کھڑا چلا رہا تھا۔ تجھے پتہ بھی ہے کتنا بے چین رہا ہوں" کرم دین نے ڈھٹائی سے کہا۔ نوری نے تیکھی نظروں سے اس کو گھورا پھر بولی۔ "بس رہن دے تجھے پتہ ہے کتنی دیر سے میں تیرا انجار (انتظار) کر رہی تھی، پچاس بار دروازے پر دیکھ کر آئی ہوں تجھے لیکن تیرا تو کوئی اتہ پتہ نہ تھا، آخری میوس (مایوس) ہو کر سو گئی تھی میں۔" "ہاں تُو نے تو سوچا ہووے گا کہ میں مسرت کے ساتھ بھاگ گیا ہونگا۔ کملو ہی میں سمجھتا ہوں تیری ھیجیت (ذہنیت) کو" کرم دین نے اس کو گھورا جواب میں وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ مسرت کرم دین کی خالہ کی بیٹی تھی جس کے ماں باپ اس کے بچپن میں ہی انتقال کر گئے تھے اور کرم دین کی ماں نے اسکو پالا تھا، وہ ان کے گھر میں رہتی تھی۔ "مجھے پتہ ہے تُو مر کر بھی یہ کام نہ کر سکے گا۔ وہ بہت کالی ہے تجھے تو چٹی لڑکیاں پسند ہیں مجھ جیسی" وہ تفاخر سے بولی، اس کے الفاظ کرم دین کو اندر تک شرمسار کر گئے تھے۔

"تجھے پتہ ہے تیری یاد میں اک اک پل مشکل لگا ہے مجھے، سارا وخت (وقت) میں اس کھڑکی کے قریب ٹھہر کر انجار (انتظار) کرتی رہی ہوں" نوری نے اپنی بے چینی و بے تابیوں کی داستان اس کو سنا دی تھی۔

"لے جھلی نہ ہو تو میں سویرے سے گھر سے نکلا ہوں۔ سارا دن مارا مارا فرا (پھرا) ہوں لیکن وخت (وقت) تھا کہ گجرنے (گزرنے) کا نام نہ لے رہا تھا۔ دو دن پردیس جا کر ہر پل ترسا ہوں تجھ سے بات کرنے کو، تیری شکل دیکھنے کے واسطے اور دیکھ تیرے واسطے کیا لایا ہوں میں"۔

"کیا لایا ہے دکھا" نوری نے مشتاق لہجے میں پوچھا۔ وہ بے اختیار مسکرا دیا۔ کرم دین نے ریڑھی پر رکھے دو سیاہ شاپر اس کے حوالے کر دیئے تھے۔ ایک شاپر میں بہت بڑا سا رنگ برنگے دھاگوں سے بنا شیشوں والا پراندہ تھا اور دوسرے شاپر میں سرخ و سفید رنگ کی چوڑیاں تھیں۔ اس کے دیئے گئے تحفے نے نوری کی آنکھیں جھلملا دی تھیں۔

"تجھے میرا اتنا خیال ہے کرم دین" نوری نے اٹھلا کر پوچھا۔ "پاگل نہ ہو تو، تیرا خیال نہ کرونگا تو کیا اس مسرت کا کرونگا"۔

"اچھا سن شام کو ابا آئے گا تو تُو آ کر بات کریں ناں اس سے"۔

"کیا بات کروں؟ وہی اپنے اتھرے لہجے میں چاچا کہے گا پہلے کوٹھا ڈال پھر بیاہ کرونگا"۔ کرم دین کا لہجہ دو آدھا سپاٹ ہو گئی تھی۔ نوری کا دل ایک بار پھر بیٹھنے لگا تھا۔ کیونکہ کل رات ہی ابا نے اماں سے کہہ دیا تھا کہ اگر کرم دین کوٹھا نہ بنا سکے گا تو اس کو ہرگز رشتہ نہ دونگا اور کل رات سے آج دوپہر تک کا وقت نوری نے کانٹوں

پر گزارا تھا۔ "پھر انکار کردے گا ابا، تو سمجھتا کا ہے کو نہیں ہے؟" نوری نے تپ کر کہا۔

"دیکھ نوری میں بندہ ہوں گھرا تو سن لے۔ اماں تو ویسے ہی تجھ میں ہجار نقص نکالتی ہے یہ تو میری جد ہے کہ وہ رُکی ہے ورنہ اس کا بس چلے تو آج ہی مجھے اس کالی مسرت سے بیاہ دے۔ تیرے باپ کی پھرمائش سن سن کر گھر والے سب بے جار (بیزار) ہو گئے ہیں۔ جب سے تیرے باپ نے یہ کوٹھا بنایا ہے ناں خود کو جانے کیا سمجھنے لگا ہے۔ ہمارے ساتھ جھونپڑے میں رہتا تھا اور اب محلوں کے خواب دیکھنے لگا ہے۔ بجلی اور گیس کے مزے لے رہا ہے۔ وہ دن بھول گیا جب ہمارے ساتھ بیٹھ کر سگنے جھلتا تھا، لکڑیاں جلاتا تھا، گندا پانی پیتا تھا، کاروبار کیا چل نکلا ہے مجاز بدل گئے ہیں اس کے۔ میرا باپ بجاز پڑتا تو ہم بھی کوٹھے میں ہوتے جھونپڑے میں نہ رہتے اور نہ ہی مجاز دار بنتے"

کرم دین کے سنگلاخ و سپاٹ الفاظ نے نوری کا رنگ اڑا دیا تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگی تھی۔ خفت و سبکی کے احساس نے اس کی پیشانی عرق آلود کردی تھی۔ وہ تھوک نگلتے ہوئے بولی "تو کیا تو مسرت سے بیاہ رچائے گا؟" "میں نے یہ تو نہ کہا ہے میں تو یہ کہہ رہا ہوں چاچا کو سمجھا، اگر نہیں مانتا تو بھاگ چل میرے ساتھ۔ کراچی میں میرا دوست رہوے ہے نکاح کرکے اس کے پاس چلے جاویں گے"۔

"دیکھ کرم دین میں اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی ہوں، بہت منتوں مرادوں سے جد پیدا ہوئی ہوں۔ میری ماں نے مجھے شہجادیوں (شہزادیوں) کی طرح پالا ہے۔ وہ سارا دن لوگوں کے گھروں میں برتن مانجھتی ہے پر میں گھر پہ رہتی ہوں۔ میرا باپ مجھے ملکہ کہتا ہے، ان کی کنڈ (پشت) پیچھے یہ کام نہ کرسکوں تو ایسے منالے میرے باپ کو یہ بھاگنے کی رہن دے"۔ "تو ٹھیک ہے پھر اپنے باپ سے کہہ شہجادے (شہزادے) سے بیاہ کردے نیا۔ اتنی مہنگائی میں، میں اتنا کما سکوں کہ دال دلیا مل جاوے تو کیا کہنے یہ کوٹھا بنانا میرے بس کا نہ ہے"۔ وہ کہہ کر آگے بڑھ گیا، نوری اس کو پکارتی رہ گئی اور پہلی بار وہ نوری کے پکارنے پر بھی نہ رُکا تھا۔ نوری کے دل میں ایک پھانس سی گھس گئی تھی۔

"دیکھو اللہ یار، اکو اک لڑکی ہے ہماری۔ میں اس کو تجھ سے کئے گئے وعدے کے بدلے بیاہ نہ سکوں جب تک تو کوٹھا نہ ڈلوائے گا۔ یہی بات کی تھی ناں اب آنا کانی کاہے کو کر رہا ہے تو"۔

"میں آنا کانی نہیں کر رہا، بھرا اللہ دتہ میرے حالات مندے ہیں، بیمار ہوں میں۔ ہمارا ایک چھورا کمائے ہے۔ میری بیوی سارا دن گھروں میں برتن مانجھے پھر جا کر گھر کا گزارا ہووے۔ ایسے حال میں کوٹھا کیسے ڈلوا دوں"۔ اللہ یار بے بسی سے بولا۔ لیکن اس کی بے بسی کا اللہ دتہ پر مطلق کوئی کوئی اثر نہ ہوا تھا۔ اس نے بڑے بھائی کی ویسے بھی نہ کی اور بھڑک کر بولا:۔

"پھر تو بیاہ مشکل ہووے گا" اللہ دتہ نے صاف ہری جھنڈی دکھائی جس پر نوری کی ماں مداخلت کرتے ہوئے بولی۔

"اب ہماری اتنی بڑی لسٹ تو نہ ہے پھرمائشوں کی بھرا اللہ یار۔ کرم دین نے نزدیکی بستی میں جو دوسرے کا پلاٹ لیا ہے اس پر صرف ایک کوٹھا ڈلوا دے میری بچی سکھی رہ جاوے گی۔ جھگیوں میں اب نہ رہ سکے گی نوری۔ نہ بجلی نہ گیس نہ ٹھنڈا پانی، نہ چھت۔ نہ جانے اس کو تو اینٹ والے کوٹھے میں رہنے کی عادت پڑ گئی ہے" نوری کی ماں کے بے لاگ تبصروں نے کرم دین کا خون کھولا دیا تھا۔ وہ بھڑک کر بولا:۔

"پھر کسی جمین والے سے بیاہ دے اس کو، اب میری حیثیت تو نہ ہے کہ میں اس کو کوٹھا بنا کر دے سکوں، میرا باپ بیمار ہے پھیپھڑوں کا مریج (مریض) ہے۔ ہزاروں کا خرچہ ہوتا ہے اس کی

دوادارو پر، بہت مشکل سے وہاں ساگ بنتا ہے۔ کوٹھا کہاں سے ڈال دوں میں، تُو بتا کہاں سے پیسہ لاؤں"۔ کرم دین نے بھڑک کر کہا۔ جبکہ دوسری جانب کھڑی نوری کا دل بیٹھا جارہا تھا۔ یہ وہ کرم دین تو نہ تھا جو ہر وقت اس کی محبت کا دم بھرتا تھا۔ یہ تو کوئی اجنبی اکھڑ کرم دین تھا جس کو صرف اپنے مسائل اور گھر والوں سے سروکار تھا۔ اس کو نوری کی ذرا بھر بھی پرواہ نہ تھی۔ اس بات نے نوری کو آبدیدہ کردیا تھا۔

"پھر سوچ لے کرم دین ایسے بیاہ تو میں بھی نہ کرونگا۔ اوپر سے تُو تو وخت (وقت) بھی نہ مانگ رہا ہے"۔

"چاچا میں جانتو ہوں اپنے ہتھیلیوں کو، مجھے معلوم ہے کہ میں گھر نہ بنا سکوں چاہے جتنی خاہش (خواہش) ہو میری۔ تُو آٹھ سال کا وخت (وقت) رے گا میرے کو بول، اپنی بیٹی کو میرے انتظار میں بٹھا سکے گا"۔

"نہ اتنا عرصہ نہ بٹھا سکوں، حنیف درزی کب سے مانگ رہا ہے اس کا رشتہ"۔ "تو ٹھیک ہے کردے پھر ساری اس کی" اللہ یار یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا، بیوی اور بیٹا بھی ساتھ کھڑے ہو گئے تھے۔ اللہ دتہ نے سرسری طور پر بھی ان کو روکنے کی سعی نہ کی تھی۔ کرم دین نے باہر نکلنے سے پہلے دروازے کی اوٹ میں کھڑی نوری کو دیکھا پھر اس کے قریب آکر بولا:۔

"نوری بیاہ کر کے میرے ساتھ بھاگ چل' میرے ساتھ تیرا باپ بیاہ نہ کرے گا چار سال ہوگئے، اب اماں نہ ماننے کی اتنی بے عزتی (بے عزتی) کے بعد تو مان جا"۔

"تُو میرا جواب جانتے ہے کرم دین" نوری نے سر جھکا کر بھیگے لہجے میں جواب دیا۔ اس کے جواب نے کرم دین پر گھڑوں پانی ڈال دیا تھا۔ "کرم دین کیا تُو میری اتنی سی خاہش (خواہش) پوری نہ کرسکے ہے کیا بہت بڑی ہے میری خاہش (خواہش)؟"

"تیری خاہش بڑی نہ ہے، میری جیب ہی کھالی ہے نوری۔ کھالی (خالی) جیب تو کھالی دل سے بھی سے یادہ (زیادہ) خطرناک ہووے۔ کوئی دل نہ دیوے کوئی رشتہ نہ دیوے"۔ وہ کہہ کر چل پڑا۔ اس کے شکستہ قدم دیکھ کر نوری کی آنکھوں میں خوابوں کی بکھری کرچیاں چبھنے لگی تھیں، آنسو تواتر سے بہنے لگے تھے۔

پورا ایک ہفتہ گزرنے کو آیا تھا۔ کرم دین نے پلٹ کر خبر بھی نہ لی تھی۔ نہ تو وہ خود آیا تھا اور نہ ہی اس نے اپنے ماں باپ کو بھیجا تھا۔ نوری کے ماں باپ بھی پریشان تھے اور نوری کی حالت تو ناگفتہ بہ تھی۔ نوری کے دل پر بے کلی سی چھائی ہوئی تھی۔ دل کو کسی طور چین نہیں آرہا تھا۔ کیا وہ اس کے خوابوں کو پورا کرنے میں جت گیا تھا۔ کتنے سارے سوالات تھے جو اس کے سامنے منہ پھاڑے کھڑے تھے۔ ایک ہفتے کے اختتام پر اس نے دل کڑا کر کے اس کے گھر جانے کا فیصلہ کرلیا۔ اس نے اپنی ماں سے کہا، وہ فوراً اس کو بھیجنے کے لیے تیار ہوگئی۔

"دیکھ نوری کرم دین کو ہاتھ نہ چڑا (چڑھا) اس کو احساس دلا کر تو وہاں نہ رہ سکے ہے۔ مری چھوکو تو اولوا (اوائیں) بھی نہ آوے جس سے مرد کو پھنسا (پھنسا) لیویں دوسری چھوریاں (لڑکیاں)۔ اب تیار ہو کر جا اور اس کو راجی (راضی) کر کر دہ کو بٹھا ذلوائیں"۔

"اماں تو پھکر (فکر) نہ کر میں اس کو منا لونگی، وہ مانتا ہے مری، اس گندے سے نکالونگی میں" نوری نے عزم سے اپنے گھر سے نکلی تھی۔ نہ تو اس کے قدم ڈگمگائے تھے نہ دل میں بدگمانیوں نے جنم لیا تھا۔ وہ خواہشات کی سرزمین پر ثابت قدمی سے چل رہی تھی۔ گندے نالوں سے گزرتے ہوئے وہ اب جنگی والوں کے ناختم ہونے والے جھونپڑوں میں داخل ہوگئی تھی۔ جھونپڑوں کے باہر سے گزرتے ہوئے اسکے پیر گوبر سے اٹ گئے تھے۔ اس نے کراہت سے دو غلیظ گالیاں وہاں کے

رہنے والوں کو ریں۔ وہاں جگہ جگہ زمین پر پانی جمع تھا اور وہاں کے رہائشی اسی پانی کا استعمال کرتے تھے۔ اس نے گورے کو مٹی سے رگڑ رگڑ کر بنایا تھا لیکن پارس کی انگلیاں ابھی بھی لتھڑی ہوئی تھیں۔ اس نے تالاب میں پاؤں ڈال دیے، قریب بیٹھی عورت چلانے لگی "اری اوانی (اندھی) ہے، یہ پانی ہم پیویں گے، تو نے کیا کیا کم بخت پانی کھراب (خراب) کردیا"۔ نوری نے جواب نہ دینے میں عافیت جانی اور آگے بڑھ گئی۔

کالی سیاہ عورتیں اسی زمین پر روز تلابوں پر بیٹھی اپنے کپڑے دھو رہی تھیں۔ دوسری جانب ننگ دھڑنگ بچے اسی تالاب میں نہا رہے تھے کچھ عورتیں اسی پانی سے اپنے مٹکے بھر رہی تھیں۔ حالانکہ کپڑوں کا گندا جھاگ اسی پانی کا حصہ بن رہا تھا۔

میں بھی اس ماحول میں نہ رہ پاؤں گی۔ بجلی اور گیس کے بغیر میں کیسے گیلی لکڑیاں سلگاؤں گی۔ اس جگہ بیٹھ کے کیسے کپڑے دھوؤں گی۔ وہ خود سے مخاطب تھی۔

"ارے تُو نوری ہے ناں، جو کچھ ارصہ پہلے یہاں رہوے تھی" ایک کالی سیاہ لڑکی نے اس کی کلائی تھام کر پوچھا۔ اس کا گورا رنگ اس کے گہرے سانولے رنگ میں اور بھی زیادہ سفید لگ رہا تھا۔ "نہ میں نہ ہوں نوری، میں بھاگاں ہوں، تُو نے نہ پچھانا (پہچانا)؟"۔ "میں نے نہ پچھانا" وہ کہہ کر آگے بڑھ گئی "گندے لوگ نہ ہوں تو"۔ اس نے نخوت سے سر جھٹکا تھا۔ اس کو تو اس حوالے سے بھی شرمندگی ہوتی تھی۔ اب کرم دین کو میری بات ماننا ہوگی میں بیاہ کرکے اس کو ابا کے گھر لے جاؤں گی۔ ہاں یہ ٹھیک ہے، جب وہ کوٹھا بنوالے گا تب میں ابا کے گھر سے جاؤں گی۔ مستقبل کے خواب بُنتے بُنتے وہ کرم دین کے جھونپڑے تک پہنچ گئی تھی۔ اس کے جھونپڑے کی ایک جانب کوڑے کا بہت بڑا ڈھیر تھا۔ جس پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ گیج (غلیظ) لوگ نہ ہوں تو۔ اس نے دوپٹے سے اپنا آدھا منہ ڈھانپ لیا۔ لیکن اس کوڑے پر بکھرے سرسوں کے مرجھائے ہوئے پیلے پھولوں نے اس کو رکنے پر مجبور کردیا تھا۔ اس نے سرعت سے جھونپڑے کا پردہ سرکایا اور اندر نظر آنے والے منظر نے اس کے پیروں کے نیچے سے زمین سرکادی تھی۔ سامنے چارپائی پر کرم دین بیٹھا تھا اور مسرت اس کے بالکل قریب سرخ جوڑے میں ملبوس انتہائی تیز میک اپ کیے ہوئے تھی۔ وہی کالی سیاہ مسرت جس کا وہ اور کرم دین مذاق اڑایا کرتے تھے۔ کرم دین اپنے ہاتھوں سے اس کو روٹی کے نوالے بنا بنا کر کھلا رہا تھا اور ہر نوالے کو منہ میں رکھنے کے بعد وہ شرما جاتی تھی اور کرم دین ہر ہر نوالے پر نہال ہو رہا تھا۔

دوسرے کونے میں چاچی رکھی میں سے بچے ہوئے چاول پرات میں ڈال رہی تھی۔ اماں نوری کے گھر بھی چاول دے آئیو اور ہاں اس کے باپ سے کہیو رجیو کہ اپنی شہجاری (شہزادی) کی شادی کسی شہجارے (شہزادے) سے کردے میرا انتجار (انتظار) نہ کرے مجھے میری شہجاری (شہزادی) مل گئی ہے۔" کرم دین نے محبت پاش نظروں سے مسرت کو دیکھا جن نظروں سے کبھی وہ نوری کو دیکھا کرتا تھا۔ نوری کے دل پر آرے چلنے لگے تھے۔

آنکھوں سے زار و قطار بہتے آنسو اس کے ٹوٹے بکھرے خوابوں کو کسی تنگ و تاریک قبر میں دفنا رہے تھے۔ محبت کا ہرجائی خواہشات کا کتبہ اس کی قبر سے اتار کر دور پھینک چکا تھا وہ ان خوابوں کو پورا کرنے کی سکت نہ رکھتا تھا اس لیے دستبردار ہو گیا تھا۔

نوری کے خواب کیا بے جا تھے؟ کیا اس کے خوابوں کی قیمت بہت مہنگی تھی، کرم دین سے بھی زیادہ مہنگے اور سچے تھے اس کے خواب؟



شوکت افضل

گمانِ وفا

شوکت افضل حسب معمول اس بار بھی قارئین سیارہ ڈائجسٹ کے لیے ایک شاہکار کہانی لکھ کر آئی ہیں۔ یہ کہانی ایک ایسے شخص کی ہے جو شادی سے قبل ایک کھلنڈرا ضرور تھا مگر اس نے ایک جنت نما ازدواجی زندگی کا خواب ضرور سجا رکھا تھا۔ تلاش بسیار کے بعد اُسے اپنی پسند کی شریک حیات تو مل گئی مگر شادی نے اس کی زندگی یکسر تبدیل کر کے رکھ دی ہے...... کہانی کے کردار انتہائی مضبوط اور پلاٹ جاندار ہے، یہی وجہ ہے کہ قاری ایک بار پڑھنا شروع کرنے پر کہانی کے سحر سے نکل نہیں پاتا۔



ایک شخص کی دلگداز کہانی، جس نے جنت نظیر زندگی کا خواب دیکھا تھا

وقت کے گجر نے بارہ بجائے اور پھر ایک کار کی ہیڈ لائٹس اس کی کوٹھی کے گیٹ پر پڑیں۔ محسن یکدم چونک کر بے پاؤں گیٹ کے دروازے کے پیچھے کھڑا ہوگیا۔ کھڑی کار کا دروازہ کھلتے ہی کار کی اندرونی بتی جل اٹھی تو رنج اور صدمے کا ایک اور نوکیلا خنجر محسن کے سینے میں پیوست ہوگیا۔ حقیقت ایک منہ زور وحشی درندے کی طرح اس پر لپکی۔ فرزانہ نہایت ہی نازو انداز سے لہراتی بل کھاتی کار

سے نیچے اُتری اور ڈسٹیرنگ پر بیٹھی شہر کی ایک بااثر شخصیت نے اوباشانہ انداز میں سگریٹ کا کش لیا اور پھر ایک ہوائی بوسہ اُچھالتے ہوئے کار ریورس کرنے لگا۔ ہلکا سا نقرئی قہقہہ رات کی تاریک فضا میں بکھیرتے ہوئے فرزانہ نے ہاتھ ہلا کر "بائی" کہا اور پھر گنگناتی ہوئی پرس جھلاتی گیٹ کے اندر داخل ہوئی۔ اس کے لباس کی معطر لپٹ محسن کی ناک میں آئی تو وہ گیٹ کی اوٹ سے نکل کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا اور رو رو کر سوجی ہوئی سرخ سرخ آنکھوں سے اسے گھورنے لگا۔

فرزانہ کا پرس جھلاتا ہوا ہاتھ فضا میں رُک کر رہ گیا۔ وہ ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی اور کھسیاہٹ سے اسے دیکھنے لگی۔ چند لمحے دونوں ایک دوسرے کو تکتے رہے اور پھر فرزانہ اک ادائے ناز سے شانوں تک کٹے ہوئے خمدار بال پیچھے کو جھٹک کر آگے بڑھتی گئی۔ وہ اس کے پیچھے اس کے کمرے میں آ کھڑا ہوا۔ فرزانہ نے اس کی طرف دیکھے بغیر پرس میز پر رکھا اور جھک کر سینڈل اُتارنے لگی۔

"کہاں سے آ رہی ہو؟" محسن نے خشک اور کھوکھلی، پھٹی ہوئی آواز سے پوچھا۔

"کیوں پوچھ رہے ہو؟" وہ بدستور سر جھکائے ہوئے اس کی طرف پیٹھ کیے بولی۔

"شاید مجھے اس بات کی بار بار وضاحت کرنی پڑے گی کہ میں تمہارا شوہر ہوں"۔ محسن کی آواز رنج اور غصے سے کانپ رہی تھی۔

"کبھی اس اجارہ داری سے ہٹ کر بھی بات کر لیا کرو محسن"۔ فرزانہ لاپرواہی سے پرے دیکھتے ہوئے کان سے بندہ نکالتے بولی۔ "ڈرائیور کئی دنوں سے چھٹی پر ہے۔ تمہیں میرے لیے وقت نہیں ملتا تو پھر کیا کروں۔ گھٹ گھٹ کر مر جاؤں۔ آج کلب سے واپسی پر امجد صاحب مجھے چھوڑ گئے ہیں تو تمہارے دل میں حسد کی چنگاری سلگ اُٹھی ہے۔ ٹھیک ہے تم میرے شوہر ہو لیکن انسان کو اتنا بھی dominate نہیں ہونا چاہیے"۔ فرزانہ سر کو خم دے کر کان سے دوسرا بندہ بھی نکال کر بولی۔

"جس چیز کو چنگاری سمجھ رہی ہو نا۔ وہ ایک دن تمہارے سر پر آتش فشاں بن کر پھٹے گا فرزانہ بیگم۔ تمہیں نہ صرف میرے احساسات کچلنے کی قیمت ادا کرنی پڑے گی بلکہ معاشرے میں بھی کہیں کی نہ رہو گی۔ میں دو سال سے صبر کے گھونٹ پی رہا ہوں اور تم کو اس کا ذرہ بھر احساس نہیں کہ یہ دو سال مجھ پر صدیاں بن کر گزرے ہیں لیکن آج کانوں سے سب کچھ سُن کر اور آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لینے کے بعد میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا ہے فرزانہ"۔ محسن شدت احساس سے ہانپتے ہوئے جیسے تلخی کے گھونٹ بھر کر بولا۔

فرزانہ نے گلے سے لاکٹ اُتارتے ہوئے قدرے کنکھیوں سے محسن کی طرف دیکھا۔ وہ ٹانگیں پھیلائے کمرے کے وسط میں کھڑا تھا اور اس کی آنکھیں وحشت سے پھٹ رہی تھیں۔ آج پہلی دفعہ اسے اتنے کڑوے تیوروں میں دیکھ کر فرزانہ کا دل ایک لمحہ کو دھڑک اُٹھا۔ وہ لرز سی گئی مگر خود کو بظاہر نارمل ثابت کرنے کے لیے فوراً ہی لاتعلقی سے بیڈ کے نیچے جھک کر ہاتھ روم سلیپر ڈھونڈنے لگی اور پھر چند منٹ بعد اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے اس نے آرام سے سلیپروں میں پاؤں ڈالے۔ پھر قریب پڑے صوفے پر بیٹھتے ہوئے سائیڈ ٹیبل کھول کر سگریٹ کیس نکالا اور سگریٹ نکال کر سلگاتے ہوئے دوسرے صوفہ کی طرف اشارہ کرتے بولی۔

"تم بھی بیٹھ جاؤ محسن۔ آرام سے بیٹھ کر بات کرو"۔

محسن آگے بڑھ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ فرزانہ نے سلگتا ہوا سگریٹ محسن کی طرف بڑھایا جو اسے

لیا پڑا اور پھر فرزانہ نے ایک دوسرا سگریٹ سلگایا اور کش لے کر نہایت سٹائل سے سر صوفے کی پشت پر ٹکا دیا۔ اس کے خوبصورت نیم وا ہونٹوں سے آہستہ آہستہ دھوئیں کے مرغولے نکلنے لگے۔ محسن کو معلوم نہ تھا کہ فرزانہ نے سگریٹ نوشی بھی شروع کر دی ہے۔ وہ قدرے چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

"اس میں حیرانی کی کونسی بات ہے بھئی، جس ماحول میں تم نے پرورش پائی ہے وہاں لڑکیاں بالیاں بھی کبھار چھپ کر ایک آدھ سگریٹ کے ٹوٹے کا سوٹا لگا کر یہی سمجھ لیتی ہیں کہ کارنامہ کر لیا لیکن جس ماحول کی میں پروردہ ہوں، اس ماحول میں ہر تہذیب یافتہ ماڈرن خاتون ٹینشن دور کرنے کے لیے سگریٹ پیتی ہے۔ اس سے ذرا گفتگو کرنے میں بھی یکسوئی آجاتی ہے۔" فرزانہ کچھ دنوں سے محسن کو آپ سے تم کہنے پر اتر آئی تھی "ہاں تو میں یہ کیا کہہ رہی تھی؟ مجانے کیا بات تھی؟ ہاں یاد آیا کہ تمہیں بتانا چاہتی ہوں محسن، کہ میں نے ایک نہایت امیر گھرانے میں پرورش پائی ہے۔ تنگدستی کے نام تک سے ناآشنا رہی۔ ایک حادثے میں میرے ماں باپ دونوں ختم ہو گئے تو پھر کمبخت بھاوجوں کا راج آگیا۔ انہوں نے میرے بھائیوں کے ذہنوں پر قبضہ کر کے مجھے ترکہ میں حصے کی رقم دے کر الگ کر دیا۔ یہی رقم میری اعلیٰ تعلیم پر بھی استعمال ہوئی۔ میں شروع ہی سے ماں باپ کی لاڈلی تھی اور اعلیٰ طرز زندگی کی عادی تھی۔ جب یہ رقم جواب دے گئی تو میری انا نے قبول نہ کیا کہ میں ان ذلیل بھاوجوں کی ماتحتی کر کے زندگی گزاروں، چنانچہ میں نے وقتی طور پر ملازمت کر لی۔ مجھے اپنی اعلیٰ تعلیم، ذہانت اور خوبصورتی پر ہمیشہ سے ناز اور بھروسہ رہا۔ میں سمجھتی تھی کہ میں کسی سے کم نہیں تو ضرور ایک وقت ایسا آئے گا کہ پھر سے میرے پاس دولت کی ریل پیل ہوگی۔ میں عام لوگوں سے بچتی بچاتی کسی ایسی ہی منزل کی تلاش میں تھی کہ تم نے ایک موڑ پر آکر میرا راستہ روک لیا اور راحت کے سبز باغ دکھانے پر میں تمہیں منزل سمجھ بیٹھی کیونکہ ایک طرح سے تم یوں بھی میرے لیے مناسب انتخاب تھے۔ بھائی بھاوجوں، ماں، باپ کے جھنجٹوں سے آزاد، خوبصورت، نوجوان اور خوش مزاج۔ بس یہیں میں دھوکا کھا گئی کیونکہ تم میری توقع کے مطابق مالدار نہ نکلے۔ تم بس ایک خاندانی، شریف اور متوسط سفید پوش آدمی ہو اور مجھے ان روایات سے نفرت ہے۔ سفید لباس مردہ لاشوں کو پہنایا جاتا ہے۔ زندہ انسان کے لیے تو خدا نے کتنی رنگین دنیا بنائی ہے لیکن ان رنگینیوں کو سمیٹنے کے لیے جھولیاں بھی سنہری ہونی چاہئیں۔ سفید چادر کو تو کفن سمجھ کر آتے جاتے راہ گزر ازراہ ترحم چند ٹکے پھینک کر راہ لیتے ہیں۔ آج جن صاحب کو میرے ساتھ دیکھ کر تم آپے سے باہر ہوتے جا رہے ہو، وہی تو ہمارا ان داتا ہے، جو محض شیری یا شمپین کے ایک دو جام میں ساتھ دینے پر تمہارے بزنس کے لیے بڑے بڑے آرڈرز پر دستخط کر دیتا ہے۔" فرزانہ ذرا جھوم کر سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے بولی۔

فرزانہ کے لہجے میں برف کی سی یخ بستگی تھی اور الفاظ اس کے منہ سے اولوں کی طرح تڑ تڑ محسن کے اعصاب پر گر رہے تھے۔ محسن جو ابھی تک خاموشی سے اسے برداشت کیے جا رہا تھا، شراب کے جام کے لفظ پر اس طرح چونکا جس طرح اسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ وہ تمام جان سے لرزا اور اس کا رونگٹا رونگٹا کھڑا ہو گیا۔ اچانک ہی اس کا ہاتھ اٹھا اور ایک زناٹے دار تھپڑ کی آواز کمرے میں گونج اٹھی۔

"اوہ تم ذلیل عورت! تم اس حد تک گر جاؤ گی، میں سوچ نہ سکتا تھا! نیک نامی عورت کا سرمایہ ہوتی

ہے۔ لیکن تم تو عورت کے نام پر گالی ہو۔ فرزانہ ...... کاش میں تمہیں پہلے سمجھ سکتا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ تمہارے اس حسین و دلفریب پیکر کے اندر اس قدر غلیظ روح ہے۔ تم تو براہ راست شیطان کی شاگرد نکلیں"۔

فرزانہ کو محسن سے اس رویے کی اُمید نہ تھی۔ اس نے ششدر سی ہو کر اپنے دہکتے ہوئے رخسار پر ہاتھ رکھ لیا اور پھر دانت پیس کر محسن کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"حد ہو گئی۔ کس بات پر مار رہے ہو۔ میں نے شراب پینے کی بات کی ہے اس لیے؟ لعنت ہے تم پر ...... تم جیسے کسی بنئے والے متوسط طبقے کے گھٹیا انسان کو کیا خبر کہ اونچی سوسائٹی میں تو محض فیشن ہونے کے لیے بھی ہر کوئی ایک دو پیگ لے لیتا ہے۔ اسے کوئی بھی برا نہیں سمجھتا اور میں نے تمہارا اسٹینڈرڈ آف لائف بلند کرنے کے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔ یہی صلہ دیا تھا تم نے مجھے۔ اس کا؟" غصے سے فرزانہ کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔

"اسٹینڈرڈ" "اسٹینڈرڈ" "اسٹینڈرڈ" میں کہتا ہوں بند کرو یہ بکواس۔ نہیں چاہیے مجھے ایسا اسٹینڈرڈ، روپیہ دولت پیسہ۔ کیا کبھی تم نے اس چیز سے آگے بھی بڑھ کے کچھ سوچا ہے بیچ عورت۔ سونے چاندی کے برتن میں ہی کھا لینا تو سب کچھ نہیں ہوتا۔ کیا اعلیٰ تعلیم نے یہی شعور دیا ہے تمہیں۔ میں نہیں جانتا تھا کہ تم ذہنی طور پر اس قدر معذور اور احمق ہو" محسن نے تلملاتے ہوئے کہا۔

"احمق تو تم ہو۔ اگر تم میں ذرہ برابر بھی عقل ہوتی تو حالات سے سمجھوتہ کر سکتے تھے۔ دنیا میں آخر دوسرے مرد بھی ہیں۔ دوسروں کی بیویاں بھی شمع محفل ہوتی ہیں لیکن وہ تمہاری طرح حاسد، تنگ نظر اور جاہل نہیں ہوتے۔ نہ تو وہ گھر آئی دولت پر لات مارتے ہیں نہ ہی بیویوں کی زندگیاں اجیرن کرتے ہیں۔ تم خود تو برباد ہو گے۔ مجھے بھی برباد کرو گے"۔ فرزانہ گلو گیر لہجے میں بولی۔

"وہ اور لوگ ہوتے ہیں جو ایسی ذلتوں سے سمجھوتے کر لیتے ہیں۔ میں اس طرح نہیں کر سکتا۔ میں خاندانی نجیب الطرفین آدمی ہوں۔ میں نو دولتیا نہیں کہ مال و دولت کو خدا سمجھوں اور اس کے حصول کو اس قدر اہمیت دوں کہ پستیوں کے پاتال تک اتر جاؤں اور کان کھول کر سن لو۔ اگر آج کے بعد تم نے گھر سے باہر قدم بھی رکھا تو تمہاری ٹانگیں توڑ کر رکھ دوں گا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ تم میری محبت، میرے لحاظ کا اس حد تک ناجائز فائدہ اٹھاؤ گی" محسن دانت پیستے ہوئے بولا۔

"اور تم بھی سن لو کان کھول کر گھٹیا انسان۔ میں اونچے اسٹینڈرڈ کی سوشل وومن ہوں اور کسی رعب تلے آنے والی نہیں ہوں۔ چاہے وہ میرا شوہر تو کیا کوئی بھی ہو۔ میں دیکھوں گی تم مجھے کیسے باہر جانے سے روک سکتے ہو"۔ فرزانہ نے غصے سے پھنکارتے ہوئے کہا" اور جو تھپڑ تم نے مجھے لگایا ہے یہ بھی تمہیں بہت مہنگا پڑے گا"۔

"وہ تو میں تمہیں ابھی بتاتا ہوں کہ میں تمہیں باہر جانے سے کیسے روکتا ہوں" مارے اشتعال کے محسن کی آنکھوں سے چنگاریاں سی نکلنے لگیں اور وہ اس طرح مٹھیاں بھینچ کر فرزانہ کی طرف لپکا گویا اسے کچا ہی چبا جائے گا کہ پیچھے سے آواز آئی" ...... ابو......!"

یکا یک محسن کے بڑھتے ہوئے قدموں کو جیسے بریک لگ گئی۔ اس نے تڑپ کر پیچھے مڑ کے دیکھا۔ اس کا بڑا بیٹا حسن دروازے میں کھڑا تھا۔ بڑی بڑی سہمی ہوئی معصوم آنکھوں میں رحم اور ترس کے لیے ایک خاموش التجا تھی۔ بچے کے زخمی پرندے کی سی معصوم نظریں محسن کے دل پر ایک بجلی بن کر گریں اور اس کے وجود پر قیامت سی گزر گئی۔

"تماری ای کو مت مار دیے ابو......!" بیٹے کی فریاد کرتی ہوئی غمزدہ آواز ایک چھری کی طرح اس کی روح میں اترتی چلی گئی۔ محسن کو اپنی ٹانگیں مفلوج ہوتی محسوس ہوئیں اور اس نے لڑکھڑا کر چوکھٹ کا سہارا لیا۔ بیٹے پر نظر پڑتے ہی فرزانہ نے بھاگ کر بیٹے کو گود میں اٹھا لیا اور چیخ چیخ کر رونے لگ پڑی۔

بچہ اس نئی افتاد سے مزید بوکھلا گیا اور وہ بھی ہچکیاں لے لے کر رونے لگا۔ وحشت محسن کو اپنا سانس برقرار کرنے میں لگے۔ اس نے خاموشی سے ماں بیٹے کو روتا دیکھا اور پھر سر سے پاؤں تک پسینے میں نہایا ہوا کمرے سے نکل کر اپنے سٹڈی روم میں چلا گیا اور اندر سے دروازہ بند کر کے دھڑام سے صوفہ پر گر گیا۔ اس کا ذہن اور وجود بے رحم شکاری کے جال میں پھنسے پرندے کی طرح پھڑ پھڑا رہا تھا لیکن اسے فرار کا کوئی راستہ سجھائی نہ دے رہا تھا۔ وہ اپنے ہی الاؤ میں جلتا اور اپنے ہی کانٹوں پر تڑپتا رہا۔ باہر بارش ہونی شروع ہوگئی اور بارش کے قطرے آوارہ روحوں کی طرح کھڑکی کے شیشے پر دستک دینے لگے۔ وہ سٹڈی روم میں بغیر بتی جلائے بیٹھا تھا۔ اس کے سینے میں بادبا دھواں سا امنڈ رہی تھی اور وہ صوفے میں دھنسا سوچتا رہا۔

"شاید مجھے اپنے وقت کا بیشتر حصہ فرزانہ کے ساتھ ہی گزارنا چاہیے تھا۔ شاید اس طرح مجھے اس کو سمجھنے میں زیادہ آسانی ہوتی"۔ اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ عورت اس کے لیے ہمیشہ اجنبی رہی۔ وہ اسے جانے بوجھے بغیر دولت کمانے میں مصروف رہا تھا۔ صرف اسی کی خوشنودی کی خاطر لیکن خود اس کے وجود میں فرزانہ کے دل میں کوئی اہمیت نہ تھی جیسا کہ وہ سمجھتا رہا۔ آج فرزانہ کی ذات پر بے تحاشا اعتماد کرنے، اس سے بے اندازہ محبت کرنے کے نتیجے میں جہاں فرزانہ کے قدم پہنچ چکے تھے اور آج جس طرح فرزانہ نے اپنی پوری پوری افتادِ طبع اور قلبی کیفیات کی وضاحت کردی تھی، اس کی واپسی کا خفیف سا امکان بھی دم توڑتا معلوم ہو رہا تھا۔ اب تک اس کے دل میں اُمید و بیم کا ایک شعلہ روشن تھا کہ شاید سنگلاخ چٹان میں کوئی سبزے کی پتی اُگ آئے لیکن آج کے سانحے نے ظاہر ہو کر تمام تر اُمیدوں اور خوشیوں کو خاک میں ملا دیا۔ دوسرا تمام دن بھی اس نے سٹڈی میں گزار دیا۔ نوکروں کے کھٹکھٹانے کے باوجود اس نے دروازہ نہ کھولا اور اندر ہی سے منع کر دیا کہ اسے ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ جب گہری شام پڑ گئی تو وہ سٹڈی کا عقبی دروازہ کھول کر پچھلے لان میں اُتر گیا اور آہستہ آہستہ ٹہلنے لگا۔ بچوں کی خوابگاہ کی پچھلی کھڑکی کا پردہ سرکا ہوا تھا اور روشنی باہر لان میں پڑ رہی تھی۔ وہ دبے پاؤں چلتا ہوا کھڑکی میں اندر دیکھنے لگا۔ اس وقت اس کے دونوں بچے سب کچھ بھول بھال کر آپس میں کینوسیٹ سے کھیل رہے تھے۔ ان کے چہرے کھلے ہوئے تھے اور آنکھیں روشن تھیں۔ بڑا بچہ حسن کھیلتے کھیلتے بار بار Ruby Marray کے گانے کا یہ بند دہرا رہا تھا۔ I shall love you ever more!

محسن کو یاد آیا کہ یہ گانا فرزانہ کو پسند تھا اور وہ روزانہ دن یا رات میں اس کو دو تین دفعہ ضرور سنا کرتی تھی۔ محسن کے سینے سے ایک گہری آہ نکلی اور وہ زیر لب بولا:۔

"تمہیں کیا پتہ میرے بچے، محبت کا چھوٹا سا چراغ گھر کو روشنی دیتا ہے مگر کبھی کبھی یہ چراغ گھر کو آگ بھی لگا دیتا ہے"۔ محسن سے وہاں کھڑا نہ رہا گیا اور وہ پھر سٹڈی روم میں چلا آیا۔ وہ رات بھی اس نے بھوکی پیاسی حالت میں وہیں گزاری۔ گزرے ہوئے شیریں لمحات اور حسین یادوں کو یکے بعد دیگرے اکٹھا کر کے ان کو مایوسی کا کفن پہنا کر

حالات کے بے رحم دھاروں پر ان کے جنازے رخصت کرتا رہا۔ کئی دفعہ اسے محسوس ہوا کہ وہ بھی مر رہا ہے، ساتھ ہی مر رہا ہے مگر پھر ایسے ہی لمحوں میں ایک ننھی سی شیریں آواز I shall love you ever more اس کی سوچ کے دھارے کا رُخ تبدیل کر دیتی۔

وہ سوچتا ''اس وقت میرے بچوں کی زندگی احساسِ محبت سے معمور ہے۔ اگر زندگی کے اس معصوم دور میں ان کو تلخیوں نے گھیر لیا تو وہ نفسیاتی مریض بن جائیں گے۔ تمام زندگی تلخیاں اور نفرتیں ہی بانٹتے پھریں گے۔ صبح کے قریب وہ کھڑکی کے پاس آیا تو بادلوں کی اوٹ سے ایک روشن تارہ اسے دیکھ کر مسکرایا۔

''ہاں میں زندہ رہوں گا۔ اسی طرح سے زندگی کے دن گزاروں گا۔ اپنے بچوں...... اپنی آنکھ کے تاروں کے لیے لیکن فرزانہ!! آج کے بعد میں اپنے دل کے دروازے تم پر بند کرتا ہوں۔ ہمیشہ...... ہمیشہ کے لیے''۔

پھر اس کے دو تین دن بعد ہی جب محسن اپنے متعلقہ سیٹھ صاحب کے پاس کوئی ضروری کاغذات لے کر گیا تو اس نے محسن کو بٹھایا اور پھر باتوں باتوں میں کہنے لگا۔

''محسن میرا تو خیال تھا کہ تم جیسے نوآموز بزنس پیشہ لوگوں کو محض بڑے آرڈرز اور بلوں کی رقوم کی وصولی سے دلچسپی اور مطلب ہوتا ہے''۔ اس نے گلا کھنکھار کر معنی خیز انداز میں سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے کہا۔

''میں سمجھا نہیں سیٹھ صاحب!'' محسن نے کچھ حیران سا ہو کر کہا۔

''مجھے معلوم نہ تھا کہ تم جو دیکھنے میں اتنے سمجھ دار معلوم ہوتے ہو۔ اتنے تنگ نظر اور حاسد شوہر ثابت ہو گے'' اب وہ ذرا کھل کر بات کی طرف آتا ہوا بولا۔

''اوہ! تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی'' محسن نے تلملا کر سوچا اور پھر دقفے سے بولا ''یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے سیٹھ صاحب اور میرا خیال ہے اس میں دوسروں کو دخل اندازی نہیں کرنی چاہیے''۔

''لیکن بیوی پر بے جا روک ٹوک اور ظلم کرنا بھی تو اخلاق کے منافی بات ہے'' اس نے ناگواری سے کہا۔

''آپ نہیں جانتے سیٹھ صاحب وہ...... وہ خیر بہرحال وہ میری بیوی ہے اور قانوناً شرعاً میں اس کے بُرے بھلے کا خود ذمہ دار ہوں''۔

ٹھیک ہے کہ وہ بہت بڑا سرمایہ دار تھا جس سے محسن کے مالی مفادات منسلک تھے لیکن اس سے مرعوب ہونے کے باوجود اس کی اس قسم کی اہانت آمیز گفتگو سے محسن کو بھی غصہ آنے لگا حالانکہ وہ جانتا تھا کہ اس تمام گفتگو کے پیچھے فرزانہ کا اپنا ہاتھ ہے تاہم وہ صبر نہ کر سکا۔

''دیکھو محسن!'' وہ سگریٹ کا گہرا کش لگا کر بولا ''میں تمہارے ہی بھلے کے لیے کہہ رہا ہوں، ازدواجی زندگی باہمی اعتماد کے بغیر نہیں گزر سکتی''۔

''جب اعتماد کے رشتوں کا بھرم ہی ٹوٹ جائے تو انسان نہ صرف اپنی بلکہ دوسروں کی نگاہ میں رسوا ہو کر رہ جاتا ہے سیٹھ صاحب اور بیوی کی بے وفائی جو اس کے بچوں کی ماں بھی ہو، خاوند کے لیے محض کبھی کی چوٹ نہیں ہوتی جسے وہ سہلا کر چپ ہو لے''۔

محسن یک دم کرسی سے اُٹھ کر کھڑا ہوا اور اسے غضبناک نظروں سے گھورتا ہوا بغیر سلام کیے ہی باہر نکل گیا۔ اس کے بعد محسن کو فون پر بھی اس قسم کی اُلٹی سیدھی دھمکیاں ملتی رہیں۔ محسن فطرتاً بزدل نہ تھا۔ وہ کئی دفعہ مختلف قسم کے مراحل سے گزر چکا تھا لیکن اس نے ہمیشہ بہترین طریقے پر زندگی گزاری تھی۔ وہ صلح کن، خوش مزاج اور مرنجان مرنج طبع کا حامل تھا اور اسی خاصیت کی وجہ سے بچپن ہی سے

خونی رشتوں سے محرومی کے باوجود اس پر زمانے کے سرد گرم نے کوئی خاص اثر نہ ڈالا تھا لیکن اب آخر اسے یہ محسوس ہونے لگا کہ پہلے جو کاروباری حلقے اسے ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے اب انہوں نے اس سے منہ موڑنا شروع کر دیا ہے اور اس چیز کا محسن کے کاروبار پر ناقابل برداشت اثر پڑنا شروع ہو گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آمدنی برائے نام رہ گئی اور پھر بینک میں جمع شدہ رقم خرچ ہونا شروع ہو گئی مگر اس دوران فرزانہ کے نہ تو اخراجات میں کوئی فرق آیا نہ معمولات میں۔

محسن نے کچھ عرصہ سوچ بچار کے بعد کاروبار کی تلاش میں باہر کا رخ کیا اور اب وہ اکثر گھر سے باہر رہتا۔ اس کا شیرازۂ حیات منتشر ہو کر رہ گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس کی قسمت کا ستارہ گردش میں آچکا ہے۔ وہ جو مٹی میں ہاتھ ڈالتا تھا تو سونا ہو جاتی تھی، آج وہ سونے کو ہاتھ لگاتا تھا تو وہ مٹی ہو جاتا تھا۔ تقدیر کی ستم ظریفی نے اب ایک ایسا پانسا پھینکا جس نے محسن کو وہ ضرب لگائی کہ اس کی زندگی کا رخ ہی تبدیل ہو کر رہ گیا اور جینا اس کے لیے تہمت ہو گیا۔

ہمیشہ جب وہ کام کے سلسلے میں باہر جایا کرتا تھا تو اکثر اس کو دو تین دن بلکہ کبھی تو ہفتہ لگ جاتا تھا۔ مگر اس دفعہ وہ باہر گیا تو ایک رات گزارنے کے بعد اس کا جی گھبرانے لگا۔ تمام دن ایک بے نام سے اضطراب نے اس کی روح کو گھیرے رکھا۔ شام کو وہ کام سے کافی دیر بعد فارغ ہوا تو بھی اس کی چھٹی حس نے اسے بے چین کیے رکھا۔ آخر وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر رات ہی وہاں سے روانہ ہو پڑا۔ جب وہ گھر پہنچا تو رات کے دو بج رہے تھے۔ اس وقت تمام نوکر چاکر کوارٹر میں سو رہے تھے۔ کار گیراج میں کھڑی کرنے کے بعد اس نے پورچ کی سیڑھی پر پاؤں رکھا ہی تھا کہ اسے پورچ سے چند فٹ پرے کچھ پڑا دکھائی دیا۔ اس جگہ روشنی ٹھیک نہ پہنچ پا رہی تھی۔ اس نے بغور اس طرف دیکھا تو اس کا ماتھا ٹھنکا اور اس کے قدم وہیں رک گئے۔ وہ واپس آ کر قریب سے دیکھنے لگا کہ یہ کیا چیز ہو سکتی ہے۔ بے یقینی کے صبر آزما لمحوں میں اس کی نگاہوں نے جو کچھ دیکھا تو وہ وہیں سکتے کی سی حالت میں کھڑا رہ گیا اور پھر چند لمحے توقف کے بعد من من پاؤں لیے نجانے کس طرح وہ آگے بڑھا اور جھک کر اسے دیکھنے لگا۔

"شمپین کے ایک دو پیگ تو تمہیں فریش کر دیا کرتے تھے مگر یہ آج زمین پر رینگنے والے حقیر کیڑوں کی طرح فرش کی ان پہنائیوں میں کس خوشی میں لیٹی ہو فرزانہ بیگم؟ چلو دفع ہو جاؤ، مجھے تم سے کیا لینا دینا" محسن کے وجود میں کرب کی لہریں اٹھنے لگیں اور اس نے غم و غصے سے نڈھال ہو کر واپس جانے کے لیے قدم بڑھائے۔

"خود ہی جب نشہ ٹوٹے تو چلی آئے اندر اٹھ کے" محسن یہ سوچ کر چل پڑا مگر پھر اس کے دل سے آواز آئی۔

"ٹھہر جاؤ محسن۔ اس نے شاید آج ضرورت سے زیادہ وہسکی چڑھائی ہے۔ اس لیے یہ ہوش و خرد سے بیگانہ تمہاری دہلیز کے باہر پڑی ہے لیکن یہ مت بھولو کہ یہ تمہارے بچوں حسن اور علی کی ماں ہے، تمہاری عزت ہے۔ جیسی بھی ہے جو بھی ہے حقیقت سے تم نظریں نہیں چرا سکتے۔ اسے اٹھاؤ اور اندر لے جاؤ" محسن پھر پلٹا اور قریب آ کر فرزانہ کا بازو پکڑ کر ہلایا اور آواز دی۔

"فرزانہ!!"

"لیکن فرزانہ کا بازو برف کی طرح ٹھنڈا اور بوجھل تھا۔ محسن کو ایک نہایت ہی عجیب سا احساس ہوا اور اس کے اعصاب کو جیسے بجلی کا کرنٹ لگا۔ وہ ششدر ہو کر عجیب نگاہوں سے فرزانہ کے سراپے کو

گھورنے لگا۔ فرزانہ کا لباس سخت بے ترتیب تھا۔ قیمتی ساڑھی جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی تھی اور گرد آلود تھی۔ چہرے اور بازوؤں پر جگہ جگہ خراشوں اور زخموں کے نشان تھے۔ محسن یک دم اس پر جھک گیا اور اس کا سر سیدھا کر کے اسے پھر آواز دی۔

”فرزانہ.....فرزانہ.....اٹھو فرزانہ!!“

مگر فرزانہ کی کھلی ہوئی آنکھیں فضا میں ایک طرف ہی مرکوز تھیں۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں ساکت اور بے نور تھیں۔ اس کا حسین چہرہ خاک آلود اور زخمی تھا۔ اس کی مشکبار زلفیں بکھری ہوئی تھیں اور جسم بے حس و حرکت اور برف کی طرح سرد تھا۔ اس کے سر میں گلے پر نیلے نیلے نشان تھے شاید کہ اس کا گلا بھی گھونٹا گیا ہو لیکن اب وہ اس دنیائے رنگ و بو میں سانس نہ لے رہی تھی.....وہ مر چکی تھی۔

محسن کی رگوں میں خون منجمد ہونے لگا۔ فرزانہ کے لب و لہجہ کی خوبصورتی اور اس کی آواز کا ترنم کبھی اس کے کانوں میں رس گھولا کرتا تھا، آج اس کے کانوں میں بھیانک چیخ بن کر گونجنے لگا۔ اسے ایسے لگا جیسے اس کا سینہ شق ہو جائے گا۔ وہ بے دم سا ہو کر فرزانہ کے بے جان جسم کے پاس بیٹھ گیا اور محسن کے منہ سے ایک گہری آہ کے ساتھ نکلا۔

”تو تم اپنے اس دھواں سفر کی ہولناک منزل کو آخر پہنچ ہی گئیں، فرزانہ بیگم.....سفر جو تم نے بدنامی سنگلی راستوں پر نامحرم لوگوں کے ساتھ عیش و نشاط کی شام بہار چکا چوند روشنیوں میں کیا تھا۔ کیا اسی دنیا کی جھوٹی شان بان کے لیے تم نے ضمیر کا سودا کیا تھا جسے چھوڑ کر آج تم موت کی اندھیری وادیوں میں اتر گئی؟ ارے تم تو ان وادیوں میں بھی مجھ سے پوچھے بغیر اکیلی ہی چل دیں۔ مگر تم مجھ سے کچھ پوچھنے کی پابند ہی کب تھیں۔ اپنا یہ حق تو تم نے ہمیشہ اپنے پاس ہی رکھا۔ اپنے فیصلے ہمیشہ خود ہی کیے اور آج یہ اتنا بڑا فیصلہ بھی خود اکیلے اکیلے ہی کر لیا..... مجھے نہ کچھ بتایا، نہ پوچھا۔ فرزانہ! ہمارے پاس ایک خوش حال زندگی بسر کرنے کو کیا کچھ نہ تھا۔ کسی چیز کی کمی نہ تھی مگر تم قناعت کو موت سمجھتی تھی۔ تم نے مجھے حقیر سمجھا، نٹ پونجیا کہا.....تم تو راتوں رات امارات کے آسمان پر پرواز کر کے ستاروں کو چھو لینا چاہتی تھیں۔ پھر میں نے تمہاری منہ زور طبیعت کے آگے ہتھیار پھینک دیے اور میں کرتا بھی کیا۔ میرا تم پر زور ہی کب چلتا تھا فرزانہ.....! اور اب

اب دکھاؤ نہ ٹوٹے ہوئے پر اپنے
یہ دوری کا نتیجہ ہے آسمانوں سے

تم نے اعلیٰ سٹینڈرڈ کی خاطر اونچی اڑان لیتے ہوئے کبھی نظریں جھکا کر نیچے نہ دیکھا، جہاں ایک خوبصورت خوشحال گھر تھا، محبت کرنے والا شوہر، پیارے پھول سے دو بچے تھے اور پھر میں نے لاچار ہو کر دیدہ دانستہ تمہیں کھلی فضا میں آزاد چھوڑ دیا اور دل کے دروازے تم پر بند کر لیے مگر گھر کے دروازے تم پر بند نہ سکا۔ یہ سوچ کر کہ جیسی بھی ہو میرے بچوں کی ماں ہو اور ان کی معصوم نگاہیں تمہارے انتظار میں دروازے پر لگی رہتی ہیں اور پھر یہ بھی سوچتا رہا کہ شاید کبھی تو تم اپنے اس بے منزل سفر سے لوٹ ہی آؤ گی۔ اور آج تم واقعی لوٹ تو آئی ہو مگر تمہاری اس واپسی کے بارے میں تمہارے معصوم بچوں کو کیا جواب دوں گا۔ ہاں کیا جواب دوں گا؟ فرزانہ.....بولو نا؟.....جواب دو فرزانہ کیا جواب دوں گا میں تمہارے بچوں کو.....؟

تمہیں تو اپنے حسن و شباب، اپنی ذہانت پر بہت مان تھا، اعتماد تھا، تمہارا ترکش تو ناز و انداز کے تیروں سے بھرا رہتا تھا۔ جس سے تم من پسند شکار پر تاک تاک کر نشانے پھینکا کرتی تھی مگر ایک دن تم خود ان

تیروں کا نشانہ بن جاؤ گی۔ یہ تو میں سوچ بھی نہ سکتا تھا، یہ ہوس سرمایہ داروں کی جس اعلیٰ سوسائٹی کے سمندر میں تم خود کو ایک ماہر تیراک سمجھتی تھی آج اسی سمندر کی مہیب لہروں نے تمہیں تمہاری مہارت سمیت رسوا کن موت کی اندھی گھائیوں میں لا پٹخا ہے فرزانہ...... آخر آج وہ تمہارا پرس میں رکھا ہوا پستول بھی کام نہ آسکا فرزانہ!"

مختلف قسم کے جذبوں نے محسن کے ذہن کو جکڑ رکھا تھا۔ مختلف خیالات اس کے ذہن میں پٹڑی پر تیزی سے چلتی ٹرین کی طرح کھٹاکھٹ بھاگے جا رہے تھے۔ یکبارگی اس کا جی چاہا کہ اپنا گریبان پھاڑ کر چیخ چیخ کر اردگرد کوٹھیوں میں سکون سے سونے والوں کو اکٹھا کرے اور اونچی سوسائٹی کے اس شاہکار کے اس انجام کو دکھائے...... پولیس کو بلائے ...... رپورٹ لکھوائے۔

مگر...... پولیس ......؟ پولیس کا خیال آتے ہی ایک انجانے خوف نے محسن کے دماغ کو ایسا جھٹکا دیا جیسے اس پر کسی نے منوں پانی ڈال دیا ہو۔ اس کا ذہن چکرانے لگا۔ لاتعداد وسوسے کچوکے دینے لگے۔

"لوگ کیا کہیں گے؟ محسن علی خان کی بیوی کے بارے میں کیا کہیں گے؟ لوگ میرے معصوم بچوں کی سیاہ کار ماں کے بارے میں کیا کہیں گے؟ رنج والم کا یہ ناسور میں تو دل میں چھپالوں گا مگر رسوائی کا جو سیاہ داغ میرے ماتھے پر لگ جائے گا تو یہ ظالم دنیا کے سنگدل لوگ روز مجھے طعنوں کے پتھر ماریں گے۔ میں روز مروں گا اور روز مر مر کے جیوں گا۔ کیا ہوگا میرا جینا؟ کیا ہوگا میرا جینا؟" محسن دونوں ہاتھوں میں سر تھامے اس اذیت ناک کشمکش کے سمندر میں ڈوب ابھر رہا تھا کہ یکایک اس کے ذہن میں چھائی دھند چھٹنے لگی۔ اس کی سوچ کے بیکراں اندھیروں میں ایک خیال روشنی کی کرن بن کر چمکا اور وہ اپنا ریزہ ریزہ وجود سمیٹ کر اندر کو لپکا۔ کافی دیر فون کی گھنٹی بجتی رہی، پھر رضا نے ریسیور اٹھایا اور نیند میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا "کون ہے بھئی اس وقت؟"۔

"ہیلو۔ رضا میں محسن بول رہا ہوں" محسن نے خشک اور پھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

"او محسن خیریت تو ہے بھئی" رضا جمائی لیتے ہوئے بولا "تم تو کہیں باہر گئے ہوئے تھے نا دو دن ہے، کہاں سے بول رہے ہو؟"

"گھر ہی سے بول رہا ہوں، ابھی دو بجے پہنچا ہوں تم اور راحت فوراً آ جاؤ یہاں...... اسی وقت...... دیر مت کرو"۔

"ارے معلوم ہے اس وقت کیا بجا ہے؟...... ڈھائی بج رہے ہیں رات کے۔ کیا پھر کوئی جھگڑا تو نہیں کھڑا کیا تم نے؟" رضا نے بیزاری سے ایک اور جمائی لے کر کہا۔ "سو جاؤ یار صبح دیکھا جائے گا"۔

"جو میں تمہیں کہہ رہا ہوں وہ کرو...... رضا فوراً آجاؤ یار تم نہیں سمجھتے سچویشن کو۔ راحت بھابھی کو جگاؤ اور فوراً پہنچو...... دیکھو یہ مذاق نہیں ہے نہ ہی مذاق کا وقت ہے" محسن بے ربط سے فقروں میں بولا۔

"خدا خیر کرے مگر خدا کے بندے کچھ پھوٹو تو منہ سے۔ آخر راحت کو میں جگا کر کیا بتاؤں کچھ بات پلے بھی تو پڑے۔" رضا نے ناگواری سے کہا "عجیب سسپنس پیدا کر رکھا ہے چغد نے"۔

"میں کچھ بھی نہیں بتا سکتا رضا"۔ سسکتے ہوئے محسن نے کہا "مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہی تم خود ہی آ کر دیکھ لیتے تو اچھا تھا"۔

"کیا دیکھ لیتا؟" رضا کے منہ سے بے ساختہ

نکلا۔

"فرزانہ کی لاش"۔

رضا کو یوں محسوس ہوا جیسے زلزلے سے ہر چیز زمین بوس ہوتی جارہی ہے۔ وہ فون کا ریسیور کریڈل پر پٹخ کر راحت کو جگانے بھاگا۔

بیس منٹ کے اندر اندر رضا اور راحت پہنچ گئے۔ وہ دونوں میاں بیوی بھی وہیں لاش کے پاس ہی حیران و پریشان ہوکر بیٹھ گئے۔ آدھے گھنٹے کے سوچ بچار کے بعد رضا اور راحت کے ذہن میں ایک ترکیب نے سر اُبھارا اور انہوں نے کچھ اطمینان کا سانس لیا۔ محسن کو سمجھایا بجھایا اور پھر اس کے لرزتے کانپتے حواس باختہ وجود کو سنبھال کر اندر لے جا کر بٹھا دیا اور باقی معاملے کی کمان رضا اور راحت نے سنبھال لی۔ پہلے تو دونوں نے فرزانہ کی لاش وہاں سے اُٹھائی اور اندر لے آئے۔ دوستی کی راحت نے بچپن کی سہیلی کے بے جان جسم سے گرد آلود پھٹی ہوئی ساڑھی اُتار دی۔ اس کے جسم سے تمام دھول صاف کی اور پھر اسے شب خوابی کا لباس پہنا کر دو تین جگہ سے پھاڑ دیا اور بستر کی چادر بے ترتیب کر کے اسے اُلٹے زاویے سے لٹا دیا پھر سوچ و بچار کے بعد انہوں نے کمرے میں فرنیچر درہم برہم کر دیا۔ جس الماری میں فرزانہ اپنے قیمتی لباس اور جیولری رکھتی تھی اس کا تالا توڑ کر کچھ چیزیں زمین پر بکھیر دیں اور باقی جیولری ایک علیحدہ بکس میں چھپا کر رکھ دی۔ الغرض انہوں نے ایک ایسا نقشہ ترتیب دیا جس سے معلوم ہو کہ یہ تمام کارروائی نامعلوم حملہ آوروں کی ہے جنہوں نے زیور اور رقم کے لیے یہ سب کچھ کیا اور مدافعت کرنے کی کوشش میں انہوں نے فرزانہ کو بھی مار ڈالا اور جیولری لے کر بھاگ گئے اور اس سب کارروائی کے بعد انہوں نے پولیس کو اطلاع دی۔

بقیہ تمام رات محسن فرزانہ کی لاش کے پاس بیٹھا سسکتا رہا۔ اس سیاہ رات میں درختوں میں سے سنسناتی ہوئی ہوائیں آوارہ مضطرب روحوں کی طرح بین کرتی ہوئی گزر رہی تھیں۔ خوابگاہ کے باہر اُگے ایک بوڑھے قدیم درخت کی لمبی لمبی شاخیں بار بار خواب گاہ کی کھڑکیوں سے سر ٹکرا رہی تھیں۔ آسمان کسی اُجڑے ہوئے مزار کی طرح ویران اور چپ چاپ تھا۔ دور دور تک کوئی ستارہ نظر نہ آرہا تھا۔ گھر کے باہر در و در پر موت کے مہیب سائے منڈلا رہے تھے اور محسن کے کانوں میں یادوں کی بازگشت گونج رہی تھی" یہ سب کیا ہے۔ فرزانہ؟ تمہارے مرمریں جسم سے مدہوش کن خوشبو کی جگہ خون کی بساندھ کیوں آرہی ہے؟ اس وقت زندگی کی چمک سے محروم چہرے پر موت کا سنگین پہرہ ہے۔ اور میں تمہارے سرہانے بیٹھا سگریٹ کے نکلتے دھوئیں سے جلتے ہوئے سینے کو اور جلا رہا ہوں۔ میں وہ پتھر ہوں جس کو تم نے ٹھوکروں سے پامال کر دیا تھا اور آج میں درماندہ دل شکستہ خالی ہاتھ تمہارے سامنے بیٹھا ہوں۔ میرے دامن میں تمہارے خون کی سوغات ہے۔ یہ سوغات مجھے کس نے بھیجی ہے بتاؤ نا؟ بولو نا جواب دو؟ کون تھے وہ لوگ جنہوں نے مجھے اور تمہیں آج اس حال پر پہنچا دیا ہے؟ میں ان کو بے نقاب کر کے رہوں گا۔ میں ان سے انتقام لے کر ان کو ایسی ذلت اور بے آبروئی کی دہلیز پر پٹخوں گا کہ وہ معاشرے میں منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے۔"

سورج طلوع ہوتے ہی یہ واقعہ ہر خاص و عام کی زبان پر تھا۔ ہر ایک کے پاس ایک نیا انداز بیان تھا۔ چونکہ فرزانہ اس شہر کی مشہور ہستی تھی؟ لہٰذا پولیس بھی دائرہ تفتیش وسیع کرنا چاہتی تھی اور پھر پڑوس کی ایک خاتون کے پاس تو بالکل ایک علیحدہ ہی کہانی

تھی۔ قتل کے شعبہ سے تعلق رکھنے والے جاسوس سادہ کپڑوں میں مکان کے اردگرد گھوم رہے تھے۔ مگر قاتل نجانے کہاں گم بیٹھے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ٹیلیفون کی گھنٹیاں بار بار بجنے لگیں۔ افسوس کے لیے آنے والے لوگ ایک دوسرے سے منہ جوڑے کھسر پھسر کررہے تھے لیکن چند دن کی کارروائی کے بعد پولیس نے کیس فائل کردیا اور یہ کہہ دیا کہ اس سب کارروائی کے پیچھے محض چند ڈاکوؤں کا ہاتھ ہے جو کہ ایک خطرناک گروہ بن کر لوگوں کو لوٹتے پھرتے ہیں اور محسن کو بھی یہ کہہ کر تسلی دے دی کہ جلد ہی چوری کیے ہوئے زیورات بازیاب کرکے اسے واپس دلائے جائیں گے۔ جبکہ حقیقت یہ تھی کہ جس شخص کے فرزانہ زیادہ قریب تھی اور شروع شروع میں بڑے بڑے آرڈرز پر سائن کروارہی تھی، اس شخص کی بیوی نے فرزانہ کے وجود کو اپنی ذات کے لیے خطرہ سمجھ کر اسے راستہ سے ہٹوایا تھا اور بعد میں کافی عرصہ تک شہر میں یہ خبر بھی گرم رہی اور افواہیں گشت کرتی رہیں کہ شہر کی چند بااثر اور مقتدر ہستیوں نے دباؤ ڈال کر یہ کیس ختم کروایا ہے تاکہ اس داستان کے چند رنگین باب ان کے بارے میں بھی کہیں رقم نہ ہوجائیں۔

محسن کے حالات نے اسے زندگی کے عجیب دوراہے پر لاکھڑا کیا تھا۔ خود تو فرزانہ چلی گئی تھی مگر محسن کو نہ ختم ہونے والی اذیت کے کانٹوں پر سسکتا چھوڑ گئی تھی۔ ایک طرف بے وفا، جفاکار، غدار بیوی کی پراسرار موت اور دوسری طرف دو بچے جن کو محسن باپ سے زیادہ اپنی ماں کا قاتل نظر آتا تھا۔ اور ان کو اپنے خون سے بدگمان کرنے کی ذمہ دار بھی فرزانہ تھی۔ اس نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اپنی موت سے کئی مہینے پہلے بچوں کی برین واشنگ شروع کردی تھی اور بات بے بات بچوں کو باپ کے خلاف اکساتی رہتی۔ محسن بے چارہ گردش حالات کے ہاتھوں معاشی وسائل کے پیچھے پیچھے مارا مارا پھرتا رہتا۔ اسے معلوم بھی نہ ہوسکا کہ جو والدین آپس میں لڑتے رہتے ہیں وہ بچوں کو اپنے اپنے ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہیں، حالانکہ بچہ دونوں کا ہوکر جینا چاہتا ہے۔ فرزانہ نے اپنی کوتاہ نظری کے ہاتھوں سب خون مار کر اس کے دل کے ٹکڑے اور آنکھ کے تارے بچے بھی ذہنی طور پر اس سے جدا کردیے تھے۔ جتنی دیر وہ بچوں کے پاس ہوتا، ان کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں لرزتی رہتیں۔ وہ اسے دیکھ کر بدکتے اور کونوں کھدروں میں چھپنے کی کوشش کرتے۔ جوں جوں وقت گزرتا جاتا تھا۔ محسن زیادہ افسردہ اور ملول رہنے لگا۔ وہ بار بار فرزانہ کے کیس کو جو کہ فائل ہوچکا تھا، آگے چلانے کے لیے رضا سے الجھتا حالانکہ پہلے وہ اس بات کے خود بھی خلاف تھا۔

"دیکھو محسن سمجھنے کی کوشش کرو۔ ٹھوس ثبوت کے بغیر دنیا کا کوئی قانون کسی کو قاتل یا مجرم نہیں ٹھہرا سکتا۔ خاص طور پر کسی مقتدر ہستی پر الزام لگانا اور پھر ثبوت پیش نہ کرنا تو صریحاً جرم بن جاتا ہے"۔

"کئی لوگ ایسے ہیں جن پر صاف طور پر شبہ کیا جاسکتا ہے"۔ محسن چڑی جیسے ہونٹ چبا کر بولا "جن کے ساتھ فرزانہ اکثر رہا کرتی تھی"۔

"شبہ تو پھر تمہاری ذات پر بھی کیا جاسکتا ہے۔ لوگوں کی اکثریت کو پتہ ہے کہ تمہارے درمیان ناچاقی تھی۔ یہ مت بھولو کہ مرنے والا مظلوم بن کر ہر ایک کی ہمدردی حاصل کرلیتا ہے"۔

"تو پھر پکڑ دار دو مجھے ہی۔ تم دیکھتے کیا ہو؟" محسن نے چڑ کر کہا۔

"بکومت...... میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ ان لوگوں کو مجرم ثابت کرنے کے لیے، جو فرزانہ بھابھی کی

پراسرار موت کے ذمہ دار ہیں، ایسے ایسے حقائق اور رازوں سے پردہ اٹھانا پڑے گا کہ ہر طرف رسوائی کا چرچا پھیل جائے گا۔ لوگ تماشا دیکھیں گے۔ دنیا کسی کے اندر تو جھانک کر نہیں دیکھ سکتی۔ صرف سکینڈلز کی شوقین ہوتی ہے۔ اپنی ذات کا دکھ صرف وہی جانتا ہے جو خود اس چتا میں دھیمے دھیمے جل رہا ہو اور پھر رسوائی تو موت سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہے دوست''۔

''مگر رضا اس طرف رسوائی ہے تو اس طرف میرے جگر کے ٹکڑے میرے بچے ہیں جن کے ذہنوں میں اس شک کے ناگ پھنکار رہے ہیں، کہ میں ان کی ماں کا قاتل ہوں۔ میں ان کو کیا منہ دکھاؤں رضا؟ کیا منہ دکھاؤں؟...... جب تک صحیح قاتل سامنے نہ آئیں گے۔ لاکھ سمجھانے کے باوجود مجھے ہی الزام دیتے رہیں گے۔ میں اپنی نظروں میں خود گر چکا ہوں۔ ان کی ملامت بھری سوالیہ نگاہوں میں سمائی دہشت میرے سینے میں خنجر کی طرح پیوست ہو جاتی ہے۔ رضا بولو...... میں کیا کروں؟'' محسن ہاتھوں کی دونوں مٹھیاں بھینچ کر اپنے ماتھے پر مارتے ہوئے بولا'' میری تو وہ حالت ہے کہ ادھر آگ ہے تو ادھر پانی ہے''۔

میں کس کے ہاتھ پر اپنا لہو تلاش کروں
سارے شہر نے پہنے ہوئے ہیں دستانے

واقعی محسن کی حالت اس انسان کی سی تھی جس کا تمام متاع حیات چھن چکا ہو اور کسی لق ودق صحرا میں جلتی دھوپ کے نیچے کھڑا ہو۔ وہ ہر ایک سے منہ چھپائے پھرتا تھا۔ اس کے حلقۂ احباب میں گنتی کے چند دوست ایسے تھے جن کو وہ اپنا کہہ سکتا تھا مگر اس موقع پر محسن کے جذبات ان سے مختلف تھے۔

مقدر نے اس کے وجود کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے تھے۔ اس کی زندگی کا ہر ایک حصہ اس سے باغی ہو کر ایک الگ صورت اختیار کرنے پر مصر تھا اور اس حالت میں جب اس کے ایک واقف کار نے اسے اس کے اس درد کی دوا ایک خوبصورت جام میں بھر کر پیش کی تو اسے پی کر محسن نے جانا کہ ہوش میں رہ کر اذیت کی ٹیسیں سہنے سے بہتر ہے کہ انسان مدہوش رہے اور پھر دو دن بعد جب وہ گھر لوٹا تو شراب کی نئی لذتوں سے آشنا ہو چکا تھا۔ اب اس کی الماری اور میز شیمپئن' ریڈ وائن اور وہسکی کی بوتلوں سے بھری رہتی اور وہ گرد وپیش سے بے خبر ہر دم نشے میں غرق رہتا۔

رضا نے جب اس کی یہ حالت دیکھی تو بے حد پریشان ہوا'' اس طرح تو تم تباہ ہو جاؤ گے محسن۔ زندہ درگور ہو جاؤ گے، یہ تم نے کس زہر کو منہ لگا لیا ہے؟......''

''تو پھر کیا ہوا، ایک دفعہ ہی تو مر جاؤں گا'' محسن نے ہنس کر سرشار ڈوبے ہوئے لہجے میں جیسے گنگناتے ہوئے کہا'' روز جینے اور روز مرنے سے تو بچ جاؤں گا۔ کوئی مر جاتا ہے اور کوئی مر مر کے جیتا ہے...... ہیں؟ کیا ہے فلسفہ برادر؟''

''پینے کی بھی آخر کوئی حد ہوتی ہے۔ محسن۔ یہ سب تو خودکشی کے مترادف ہے''۔ رضا نے اس کے اردگرد خالی بوتلیں اور سگریٹ کے ٹکڑوں سے بھرے ایش ٹرے دیکھتے ہوئے کہا۔

'' مجھے مرنے سے ڈر نہیں لگتا رضا۔ موت سے تو وہ لوگ ڈریں جن کو زندہ رہنے کی ضرورت ہو۔ مجھے تو نہ کچھ حاصل کرنے کی تمنا ہے۔ نہ کھو دینے کا اندیشہ۔ میرے لیے زندگی اور موت کی کوئی اہمیت نہیں ہے''۔ محسن نے جھومتے ہوئے لڑکھڑاتی زبان میں کہا۔'' مجھے تو بس ایک گونہ بے خودی دن رات چاہیے''۔

محسن کی اس حالت سے خوف زدہ ہو کر راحت

سے مشورہ کر کے رضا نے دونوں بچے ہاسٹل میں داخل کروا دیے اور محسن کو اپنے ہاں لے آیا تاکہ اس کو نظروں کے سامنے رکھ کر اس کی بلانوشی پر کچھ پابندی لگا سکے مگر پانی سر سے گزر چکا تھا۔ اس نے ہر اس دوست کو دشمن جانا جس نے اسے سمجھایا۔ وہ دوستوں کی پابندیوں کا حلقہ توڑ کر بھاگ آتا اور اپنی اسی تنہائی کی رفیقہ کو گلے سے لگایا۔ اس حالت میں وہ کاروبار تو کیا چلاتا، اس کا بینک بیلنس بھی اس لت کا متحمل نہ ہو سکا لیکن اس کی محسن کو پرواہ کب تھی۔ اسے تو اپنے سینے میں دکھ کی جلتی سرد کرنے کے لیے دن رات کی بے خودی چاہیے تھی۔ اس نے جائیداد اونے پونے فروخت کرنی شروع کر دی۔ پھر جائیداد بھی کہاں تک ساتھ دیتی۔ پہلے محسن امپورٹڈ شراب پیتا تھا۔ اب ٹھرا بھی مرغوب تھا بلکہ اس میں تو کچھ زیادہ تیزی تھی اور اتنی ہی تیزی سے محسن بھی تباہی کی طرف جا رہا تھا۔ اب وہ کنگال ہو چکا تھا۔ رضا کے پاس کس منہ سے جاتا۔ قرض خواہوں نے جب گھر پر بھی تالے ڈال دیے تو سر چھپانے کو بھی جگہ نہ رہی۔ بے وفا فرزانہ کی ذلت بھری موت کے حادثے نے محسن کی ہنستی کھیلتی باعزت زندگی کا رخ موڑ کر اسے دربدر کر دیا۔ اسے ہولناک انقلاب سے دوچار کر کے رکھ دیا۔ اب وہ دوستوں کی نظروں سے چھپ کر مارا مارا پھرتا۔ اسے نشے کی جستجو رہتی۔ کوئی بھی نشہ جو اسے چند لمحوں کے لیے اپنے آپ کو بھلا دینے میں مدد دے سکے۔ جب اس کے پاس سر چھپانے کا بھی کوئی آسرا نہ رہا تو وہ ایک بزرگ کی درگاہ کی طرف جا نکلا۔ وہاں کے مجاوروں نے جو لگے دم بیٹھے غم کی تفسیر بنے چرس پی کر مست ہو رہے تھے محسن کا ہاتھ تھام لیا اور چرس اور بھنگ کے نشے سے آشنا ہو کر محسن نے وہیں ڈیرہ ڈال لیا۔

ماتھوں پر رکوع و سجود کے محراب سجائے، گلے میں منکوں کی بڑی بڑی تسبیحیں ڈالے اور ہاتھوں میں کوزے لیے تارک الدنیا عبادت گزار لوگ، یاعلی کے مست نعرے لگانے والے مجاوروں کے جھرمٹ، ہر طرف پھیلی ہوئی اگربتی اور لوبان کی افسردہ کر دینے والی بوجھل مقدس خوشبو، درگاہ کے سفیر کی جالی پکڑ کر آہ و بکا کرتے فریادی۔ حاجت مند۔ یہ بھی زندگی کا ایک رخ تھا مگر راتوں کو درگاہ کی پچھلی کوٹھڑیوں کے سامنے فحش گالیاں بکتے، نشے میں دھت مجاوروں کے درمیان جوئے کی بازیاں لگتیں اور درگاہوں کے دوسرے گوشے بے نقاب ہوتے۔

ایک دن ہاتھا پائی کرتے ہوئے گتھم گتھا دو مجاوروں کو چھڑانے کی کوشش میں محسن بھی اس لپیٹ میں آ گیا۔ اب اس کی جان ہی کہاں تھی۔ وہ یہ سب نہ کر سکا اور اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا۔ ایک مجاور اس کو اٹھا کر اپنی کوٹھڑی میں لے گیا اور کئی دن تک اس کی چوٹیں سینکتا رہا۔ ان ضمیر کے قیدیوں کے درمیان یہ مجاور فرشتۂ رحمت ثابت ہوا۔ محسن کی شو و بد و سری نے اس کو ایسے حالات میں پھنسا دیا تھا کہ دیکھنے والے کا پتہ پانی ہو کر رہ جاتا۔ ہوش میں آتے ہی وہ جیسے انگاروں پر لوٹنے لگتا اور اس کے تن من کو جھلسانی آگ کو بھنگ کا پیالہ ہی سرد کر سکتا۔

وہ اکثر غنودگی میں سر جھکائے ہوئے گٹھڑی بنا درگاہ کے کناروں پر پڑا ہوتا جہاں قریب ہی بھوکے ننگے فقیروں کے پرے کے پرے بیٹھے ہوتے، جن کے چہروں پر اداسی اور محتاجی کی داستان لکھی ہوتی۔ ان کے کپڑوں سے جو کہ میلے چیتھڑوں کی طرح ہوتے، بو آ رہی ہوتی۔ وہ ہر حاجت مند ہر گزرنے والے کے آگے ہاتھ پھیلاتے اور پھینکی ہوئی خیرات پر چیل کی طرح جھپٹتے۔ لوگ محسن پر رحم کھا کر اس کے آگے بھی کچھ رقم پھینک جاتے جو کہ اسی طرح پڑی رہتی۔ کئی لوگ اس کی یہ بے نیازی دیکھ کر اسے

کوئی پہنچا ہوا بزرگ سمجھتے اور اس کے گرد دعا کروانے کے لیے اکٹھے ہو جاتے لیکن محسن پاتال کے اس عالم کی سیر کر رہا ہوتا تھا جہاں ان کی آوازیں تک نہ پہنچ سکتی تھی۔ بس چرس اور بھنگ کے جام ہی اس کی سانسوں کا رشتہ اس کے جسم و جاں سے جوڑے ہوئے تھے اور اسی مدہوشی میں وہ زندگی کے باقی سانس بھی پورے کرنا چاہتا تھا۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ محسن کا حلیہ اس طرح تبدیل ہو گیا کہ کوئی سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ بڑی ہوئی داڑھی اور اس کثیف و بوسیدہ لباس میں یہ آدمی کوئی چرس و بھنگ کے نشہ میں سرشار ملنگ نہیں بلکہ یہ تو ایم اے پاس کامیاب بزنس مین صاحب جائیداد ایک خوبرو اور زندہ دل انسان تھا جو کبھی کلبوں کی محفلوں کی جان تھا۔ دوستوں کا مرنجان مرنج اونچے اونچے قہقہے لگانے والا ہنس مکھ اور بے فکرا دوست تھا اور جب دنیا کی یہ زمین اس کے پاؤں تلے سے کھسک گئی تو وہ دھڑام سے اس پاتال میں آ گرا اور یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ اس کو گرد و پیش کی کوئی خبر نہ تھی۔ اس کی اس مدہوش دنیا میں نہ کوئی کیلنڈر تھا نہ گھڑی۔

یونہی کئی ماہ گزر گئے مگر محسن اس غم کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی سخت جان ثابت ہوا۔ رضا اور واحت کے علاوہ اس کے اور بھی کئی دوستوں نے اس کو ڈھونڈنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی مگر مزاروں کی طرف کسی کا خیال نہ گیا تھا۔ بابا رمضو جو کہ محسن کا پرانا خدمت گار تھا اور محسن کا بچپن بھی اس کی گود میں گزرا تھا۔ مزاروں پر جا کر اس کی برآمدگی کیلئے جھولی پھیلا پھیلا کر فریادیں کرتا مگر اسے بھی یہ کہاں معلوم تھا کہ اس کا گوہر مقصود یہیں کہیں کسی درگاہ پر دھول خاک میں رل رہا ہے۔

آج صبح وہ اسی درگاہ پر گریہ وزاری کرنے کے بعد باہر نکلا تو جوتا پہنتے ہوئے اسے کھانسنے اور پھر کراہنے کی ایسی آواز آئی جو اس کی روح میں نشتر کی طرح اترتی چلی گئی۔ اس نے نظر آتی ہوئی آواز کی سمت دیکھا تو سامنے قریبی کوٹھڑی سے ایک مجاور کبوتروں کا دانہ لیے باہر آتا نظر آیا۔

"یہاں اندر کون کھانس رہا ہے میاں؟" بابا رمضو نے بے چینی سے اسے پوچھا۔

"یہاں بچی سرکار کے خادموں کے علاوہ کون ہو سکتا ہے بابا"۔ مجاور بے نیازی سے کہہ کر آگے چلا گیا۔

بابا رمضو ایک لمحہ رکا اور پھر بے دریغ کوٹھڑی میں داخل ہو گیا۔ چند لمحے بعد جب کوٹھڑی کی تاریک فضاؤں سے اس کی آنکھیں مانوس ہوئیں تو اسے سامنے ایک جھلنگا چارپائی پر ہڈیوں کا پنجر نظر آیا جو سینے پر ہاتھ رکھ کر کھانسا اور پھر اس کے منہ سے ایک دلدوز آواز نکلی۔

"ہائے"۔

یہ آواز تو بابا رمضو لاکھوں، کروڑوں آوازوں میں بھی پہچان سکتا تھا۔ وہ اس کے قریب گیا اور اس کی الجھی ہوئی لٹوں اور داڑھی والا چہرہ اٹھا کر دیکھا۔ پھر اس کی رقت بھری چیخ کوٹھڑی میں گونج اٹھی۔

اور آج محسن کو ہسپتال میں داخل ہوئے تیسرا دن تھا۔ جب اس نے آنکھیں کھولیں تو اپنے اردگرد اپنے دوستوں کو دیکھا جو کہ پریشانی سے اس پر نظریں گاڑے کھڑے تھے۔ اس دوران اسے گلوکوز اور دیگر طاقت کی کئی ڈرپس لگ چکی تھیں اور اس کا باقاعدہ علاج ہو رہا تھا مگر وہ موت و زیست کی سرحد پر پڑا تھا۔ اس کی بحالی کی رفتار نہایت سست تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ جس وقت بھی وہ پورے ہوش و حواس میں آتا۔ اٹھ کر بھاگ جانے کی کوشش کرتا لیکن رضا کے علاوہ اس کے دو اور قریبی دوست ظفر اور واسد دن رات اس کی چوکیداری پر مامور تھے۔ وہ باری باری اس پر ڈیوٹی دیتے۔ اس دفعہ انہوں نے صرف

زبانی سمجھانے پر اکتفا نہ کیا بلکہ جواباً کارروائی کی اور اس کے خاصے ہاتھ پاؤں مارنے کے باوجود اس کی ایک نہ چلنے دی۔ میلی چکٹ، جوؤں بھری جٹاؤں کی حجامت کروا کر سیٹ کرایا۔ چہرہ حسب سابق کلین شیو کروانے اور غسل کے بعد اُجلے کپڑے پہنانے کے بعد وہ نکھرا نکھرا سا زرد و ضدی مگر معصوم بچہ معلوم ہونے لگا جو کہ آنکھیں کھول کر ہوش میں آتے ہی کھانے پینے کی چیزیں اُٹھا کر پٹخ دیتا اور نشہ مانگتا۔ نشے کی طلب سے اس کی حالت غیر ہونے لگتی۔ وہ تمام جان سے لرزنے لگتا۔ اس کے ہاتھ پاؤں اینٹھنے لگتے۔ زبان کپکپانے لگتی اور ایسے معلوم ہوتا جیسے کہ وہ اب آخری سانسوں پر ہے۔ وہ ہاتھ جوڑ جوڑ کر ہکلاتے ہوئے ایک ایک دوست ایک ایک نرس اور ڈاکٹر کا منہ دیکھتا، ان کی منت سماجت کرتا مگر اسے کسی کے چہرے پر بھی اپنے لیے ترس کی جھلک نظر نہ آتی۔ دوست یار ایسی کیفیت میں اس کو بُری طرح نظر انداز کر کے آپس میں سنجیدہ گفتگو کرنے۔ ایسی ایسی باتیں کرتے جو اس کی سماعت پر بار گزرتیں لیکن اس کا بس نہ چلتا کہ کس طرح ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر وہاں سے چلتا بنے اور اپنی اسی دنیا میں پہنچ جائے۔ خصوصاً اسے وہ ڈاکٹر جو کہ ظفر کا دوست تھا زہر لگتا۔ وہ اس کے کمرے میں اکثر آ کر بیٹھ جاتا اور منشیات کے خلاف لیکچر دیتا۔ آج پھر وہ کچھ بتا رہا تھا اور رضا، ظفر اور اسد ہمہ تن گوش ہو کر اس کی باتیں سُن رہے تھے۔

''مغرب کے ڈاکٹر لی موہان، جو ایک ایسے ادارے کے ڈائریکٹر ہیں جہاں سے اب تک تین ہزار سے زائد مریض اپنا علاج کروا کر منشیات سے چھٹکارا حاصل کر چکے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ ایک شخص جو روز مرہ کے مسائل خواہ وہ معاشرتی ہوں، گھریلو ہوں، یا تعلیمی، ان سے فرار حاصل کرنے کے لیے منشیات کا استعمال کرتا ہے تو اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفلوج ہو جاتی ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دوسری منشیات کی نسبت بھنگ، چرس بے ضرر ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ بھنگ یا چرس کا بھی دل و دماغ پر وہی اثر ہوتا ہے جو دیگر منشیات کا۔ ایسے چرس اور بھنگ پینے والوں کی کافی تعداد ہے جن کو عین خودکشی کے وقت بچایا گیا۔ دیکھا گیا ہے کہ اکثر لوگوں کو چرس نوشی کی ترغیب یہ کہہ کر دلائی جاتی ہے کہ چرس بے ضرر چیز ہے لیکن نئی نسل کے وہ نوجوان لڑکے لڑکیاں جو اس وقت ہیروئن اور دیگر قسم کی منشیات کے عادی ہو چکے ہیں، انہوں نے ابتداء بھنگ یا چرس سے ہی کی تھی۔ اس کے علاوہ یونیورسٹی آف کیلیفورنیا کے شعبۂ صحت کے ڈائریکٹر ڈاکٹر براؤن کا کہنا ہے کہ چرس نوشی سے جسمانی درد، ہسٹریا اور ذہنی خلفشار پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح جیسا کہ اس وقت ہمارے اس نوجوان مریض میں یہ علامات پائی جا رہی ہیں''۔ ڈاکٹر نے محسن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ تو محسن نے انتہائی بیزاری سے منہ پھیر کر آنکھیں بند کر لیں۔ ڈاکٹر نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا'' اس سلسلے میں چرس میں موجود ''ٹیٹرا ہائیڈرو کینا بائنو نال'' نامی کیمیائی مادہ انسانی جسم میں پائے جانے والے بنیادی جینیاتی ذرّے'' ڈی این اے'' میں مل کر وراثتی خصوصیات کو بھی ختم کر دیتا ہے۔ اور اس کے علاوہ خون کے سفید خلیے جو دماغ کے لیے بے حد ضروری ہے، ان کو بھی برباد کر دیتا ہے۔ میرے عزیز دوستو! تم میں سے جو مرد اب بھی کہے کہ:۔

گلستان میں گھوم لیتا ہوں بادہ خانوں میں جھوم لیتا ہوں
زندگی جس جگہ بھی مل جائے اس کے قدموں کو چوم لیتا ہوں

اسے خبردار ہو جانا چاہیے''۔ ڈاکٹر ہنستے ہوئے محسن کی طرف دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے قریب

جا کر اس کی پیٹھ پر تھپکی دیتے ہوئے بولا۔

"اوہ کم آن ینگ مین۔ بہادر بنو۔ زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرانا سیکھو۔ فرار سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ شاباش دوائی پی لی تم نے۔ دیکھو اب تم جلدی سے ٹھیک ہو رہے ہو۔ بس ذرا حوصلے اور ہمت کی ضرورت ہے...... اچھا دوستو......"۔

"Wish you all the best of luck" یہ کہہ کر ڈاکٹر باہر نکل گیا۔

اب محسن آہستہ آہستہ سنبھل رہا تھا۔ دوست احباب کی مخلصانہ کوششیں اب رنگ لانا شروع ہو گئی تھیں۔ وہ مسلسل اس سیلاب میں بند باندھنے کی کوشش میں مصروف تھے، جو کہ محسن کے وجود کو تنکے کی طرح بہائے لیے جا رہا تھا۔ اس آگ کو بجھانے کی کوشش کر رہے تھے جس کی سوزش نے اس کا تن من جھلسا کر رکھ دیا تھا اور اب کافی حد تک ان کو اپنی اس کوشش میں کامیابی کا احساس ہو رہا تھا۔ محسن خاصا سنبھل تو گیا لیکن اس کی خوبصورت آنکھیں جو کبھی زندگی کی چمک سے معمور تھیں اب وہ ویران خانے تھے، چہرہ ستا ہوا تھا اور جبڑے ایک انجانے جذبے سے بھینچے رہتے تھے جیسے وہ روح اور جسم کا رشتہ جوڑے رکھنے کے لیے پوری قوت صرف کر رہا ہو۔

ان دوستوں میں ظفر ڈاکٹروں کی طرف سے پوری طرح مطمئن نہ تھا چنانچہ اب ایک ماہ کے بعد وہ اسے ہسپتال سے فارغ کرا کے گھر لے آیا۔ وہ خود طبعاً مذہبی اور دین دار شخص تھا اور اسے عبادت سے کافی شغف تھا۔ اس نے ایک دن محسن کے ہاتھ میں تسبیح پکڑا دی اور خود درود شریف پڑھ کر اسے بھی دہرانے کو کہا۔ محسن مذہب سے پہلے بھی بیگانہ تھا اور پھر کچھ عرصہ سے تو اس کے ہاتھ صرف بوتل اور جام پکڑنے سے آشنا تھے۔ لیکن جونہی اس کے ہاتھ میں تسبیح آئی اور اس نے ابھی "اللہ" ہی کہا تھا کہ اس کی ویران اور پیاسی خشک آنکھوں سے نجانے کہاں سے آنسوؤں کا سیلاب امنڈ پڑا اور اس کے پپڑی جمے ہونٹ سسکیوں سے لرزنے لگے...... ظفر یہی چاہتا تھا کہ کسی طرح محسن کے اندر سے صدیوں کا بیٹھا ہوا تہہ در تہہ جمود ٹوٹے۔ غم و اندوہ اور آنسوؤں کا جو سیلاب اس نے اپنے اندر چھپا رکھا ہے، وہ بند توڑ کر باہر آئے اور اس کے پتھرائے ہوئے دل و جان کو دھو کر گداز کر دے۔ ظفر درود شریف پڑھتا جا رہا تھا اور محسن پر ایک وجدانی کیفیت طاری تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو امنڈ امنڈ کر اس کی صدیوں کی پیاسی روح کو سیراب کیے جا رہے تھے۔ اس کے اندر کا سناٹا ٹوٹ رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ظالم دنیا کے ستائے ہوئے ویران خانہ دل میں کوئی سما رہا ہے اور ایک عجیب سا احساس اس کے جسم و جان میں تحلیل ہو رہا ہے۔ ظفر نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ عبادت ایک عجیب سرمستی اور نشہ کی طرح محسن کے وجود پر طاری ہوتی گئی۔ ایسے محسوس ہوتا جیسے ایک نہایت ٹھنڈا ٹھنڈا روح کو سکون دینے والا مرہم ہے جو اس کے زخموں سے لہولہو جسم پر پھیل جاتا ہے اور اس کی تھکی ہوئی اداس آنکھیں، آہستہ آہستہ مند جاتیں...... اب وہ نارمل ہو رہا تھا اور اس نے شراب اور دوسری نشیات کے لیے ضد کرنی بھی چھوڑ دی تھی۔ اس کے دوست اب پُرامید ہو رہے تھے لیکن پھر بھی کبھی کبھار ایسا ہوتا کہ اس پر دورہ پڑ جاتا۔ اس کے پُرسکون چہرے پر کرختگی آ جاتی۔ آنکھیں پتھرا جاتیں اور جبڑے سخت ہو کر جم جاتے مگر پھر یکدم ہی جیسے اسے کچھ یاد آ جاتا۔ اس کا لرزتا ہوا ہاتھ جیب کی طرف جاتا اور جیب میں پڑی تسبیح کو مٹھی میں بھینچ لیتا۔ ایک ٹھنڈی آہ کے ساتھ اللہ کا نام اس کے سانسوں پر تیرتا ہوا اس کے سینے سے باہر آ جاتا۔ اور اس کی پتھرائی ہوئی

آنکھوں میں آہستہ آہستہ چمک ابھرنے لگتی۔ بھنچے ہوئے لب وا ہو جاتے۔ چہرے سے کرختگی تحلیل ہو کر اس پر ایک نور سا بکھر جاتا۔ اس کے لب آہستہ آہستہ ہلنے لگتے اور وہ خود جیسے وجد کے سے عالم میں جھوم جھوم کر ذکر الٰہی میں مشغول ہو جاتا۔

''کیا کام ہے'' دوسرے دوست اس کی یہ حالت دیکھ کر مذاق سے قہقہہ لگا کر کہتے مگر ظفر نہایت سنجیدگی سے کہتا۔

''ارے نہیں دوستو...... یہ تو اب واپس آ رہا ہے لیکن ایک نئے راستے سے...... یہ راستہ دشوار تو ہے لیکن اولیاء اللہ کی درگاہوں پر بے غرض پڑے رہنے والوں کو بھی خدا خالی ہاتھ نہیں لوٹاتا۔ اب تم دیکھ لینا، آہستہ آہستہ ایک نیا محسن تشکیل پائے گا۔ وہ تو شکر ہے کہ یہ ہمیں مل گیا اور ہم اسے اٹھا لائے'' ظفر خوش ہو کر بولا۔

''جانے دو یار پھر ہم کچھ کہیں گے تو تم ناراض ہو گے'' ایک دوست ہنس کر بولا تو ظفر سنجیدہ ہو کر کہنے لگا۔

''میں نے بھی اپنا نظریہ بیان کیا ہے۔ باقی میں نے ہر کسی کی سوچ کی اجارہ داری تو نہیں لے رکھی ہے'' فکر ہر کس بقدر ہمت اوست' والی بات ہے''۔

اور واقعی جب محسن پوری طرح تندرست ہو کر چارپائی سے اٹھا تو اس کا دوسرا روپ جس نے دیکھا حیران رہ گیا۔ لوگ دیکھتے کہ ایک جواں سال دبلا پتلا لمبے قد کا انسان نظریں جھکائے دنیا و مافیہا سے بے خبر کسی فکر میں غلطاں و پیچاں اپنی ہی ذات میں گم جیسے کسی جستجو نے مضطرب کر رکھا ہو۔ چہرے پر بے چینی اور تجسس لیے آہستہ خرامی سے کبھی کبھی اِدھر سے اُدھر آتا جاتا نظر آتا ہے۔ ناواقف لوگ اس پر کبھی کبھار مزاحیہ فقرہ بھی چست کر دیتے جس کا اس پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ وہ نظریں جھکا کر دھیمے لہجے میں گفتگو کرتا۔ جب وہ اپنی لمبی لمبی پلکوں والی غلافی آنکھیں اٹھا کر دوسروں کو دیکھتا تو معلوم پڑتا کہ یہ آنکھیں بیداری میں کوئی الم ناک خواب دیکھ رہی ہیں۔ گورا رنگ اب سانولا ہو گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ ہنستا مسکراتا سب کچھ بھول گیا ہے۔ بہت ہوا تو تراشیدہ ہونٹوں کے کونے ذرا دب سے گئے۔ جیسے وہ ہنسانے کی کوشش کرنے والے کا دل رکھ رہا ہے۔ بعض دفعہ ایسے محسوس ہوتا جیسے وہ دیکھتے ہوئے بھی کچھ نہیں دیکھ رہا۔ اگرچہ اب وہ کافی حد تک نارمل ہو چکا تھا تاہم نہ اسے لباس کی پرواہ تھی نہ کسی اور چیز کی۔ کلچے اور پُرشکن لباس میں وہ متضاد سی شخصیت معلوم ہوتا تھا۔ حالانکہ وہ اب بھی کافی جاذب نظر انسان تھا لیکن بے حسی کی کیفیت اسے اب اس صحرا میں لیے پھرتی تھی جہاں نہ سرسراتے ہوئے خوبصورت حریری لباس تھے نہ حسن و شباب کی محفلیں اور نہ ہی سرود آگیں کھنکتے ہوئے قہقہے۔ کبھی وہ کلبوں اور رقص گاہوں کا زندہ دل و سرمست ممبر تھا، اور آج اسے تقدیر کس ڈگر پر لے آئی تھی۔

اب دوست احباب نے اس کی طرف سے قدرے اطمینان کا سانس لیا تھا کہ وہ پھر ایک دن غائب ہو گیا۔ سخت پریشانی کے عالم میں رضا، ظفر اور اسد اسے اسی درگاہ پر ڈھونڈنے آئے مگر وہ وہاں نہ مل سکا۔ شہر میں جتنی درگاہیں تھیں انہوں نے کھنگال ڈالیں۔ واپسی پر انہوں نے سوچا کہ شاید مسجد میں نہ چھپ گیا ہو تو قریبی مسجد میں گھس گئے۔ وہاں لاؤڈ اسپیکر پر مولوی صاحب چندے کی اپیل کر رہے تھے۔ بار بار لاؤڈ اسپیکر پر ایک نعت کا بند دہرانے اور جب کوئی نمازی آگے بڑھ کر رقم پیش کرتا تو وہ رک کر کہتے ''جزاک اللہ...... بارک اللہ...... اللہ کاروبار میں برکت دے، مشکلیں آسان کرے۔ یہ دیکھو جی میاں نبی بخش نے دس روپے کا

سیارہ ڈائجسٹ کی حسبِ روایت ایک اور عظیم پیشکش

والدین نمبر

شائع ہو گیا ہے۔

قیمت 175 روپے

- ایک تاریخی دستاویز جو انشاء اللہ یقیناً ہر گھر کی کامیابی اور فلاح کا ذریعہ بنے گی۔
- جس میں قرآن اور احادیث صحیحہ کی روشنی میں:
- والدین کے فضائل، آداب، حقوق، فرائض اور ان کے شایانِ شان مستند مواد اور محکم استنباط پر مبنی واقعات اور دیگر مواد کو یکجا کر دیا گیا ہے۔

خود بھی پڑھیے اور دوسروں کو بھی پڑھائیے

ہر گھر میں پیار و محبت کی تحریک کا آغاز کیجیے

سیارہ ڈائجسٹ۔ 240 مین مارکیٹ ریواز گارڈن لاہور
فون: 042-37245412

ٹوٹ دیا ہے" اور پھر نعت کا بند دہرانے لگے اور اب مولوی صاحب غصے سے بھرے ہوئے لاؤڈ سپیکر پر چلا رہے تھے۔

"ارے ارے یہ آپ لوگ دیکھ رہے ہیں ان کو، جو چندہ دیے بغیر بھاگے جا رہے ہیں، اجی صاحب انہوں نے تو مسجد کو حمام سمجھ رکھا ہے۔ نہ لیا نہ دیا آئے اور نہائے چل بھئی...... کیوں بھئی کیا یہ ایک ایک روپیہ بھی مسجد کی مرمت کے لیے نہیں دے سکتے؟"

اتنے میں ایک شخص چادر میں منہ چھپائے ہوئے آگے بڑھا اور مولوی صاحب کو کچھ رقم دینے لگا۔ رقم دے کر جونہی وہ پیچھے ہٹا۔ مسجد کی چٹائی سے الجھ کر لڑکھڑایا اور اس کی چادر کی بکل کھل گئی۔

"محسن!" تینوں دوست جو ابھی ابھی مسجد میں داخل ہو کر دروازہ میں قریب ہی کھڑے تھے بیک آواز بولے اور فوراً آگے بڑھ کر اس کو گھیرے میں لے لیا پھر اسے ایک طرف لے گئے اور پوچھنے لگے۔

"کیوں بھئی ہم تمہیں سارے شہر میں ڈھونڈ آئے اور تم یہاں چھپے بیٹھے ہو، کیا ہوا ہے بتاؤ نا......؟" رضا نے کہا۔

محسن خاموش رہا مگر اس کے تیوروں سے معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کہنا چاہتا ہو:

زیرِ دیوار بیٹھے ہیں تیرا کیا لیتے ہیں

"معلوم ہوتا ہے قنوطیت کا بھوت پھر سے سوار ہو گیا ہے سر پر۔ ارے میاں کچھ تو بول" رضا جھنجلا کر بولا۔

"ارے یہاں کیا تم اس سے تفتیش کر رہے ہو۔ گھر جا کر پوچھ لینا نا۔ چلو بھئی محسن" ظفر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "میں نہیں جاؤں گا تمہارے ساتھ" وہ ہاتھ چھڑا کر بولا "کیوں کیا کسی نے کچھ کہہ دیا ہے تمہیں؟" رضا نے پوچھا "آخر کیوں نہ جاؤ گے؟"

اسد نے کہا "کیا اب اس مسجد میں ڈیرہ جمانے کا خیال ہے؟"

"بات دراصل یہ ہے کہ میں نے بہت دن بوجھ بن لیا تم پر۔ اب ہمیشہ ہی مجھے مفت کی روٹیاں توڑتے ہوئے شرم آتی ہے"۔

"تو نہ توڑو مفت کی روٹیاں۔ تم کام بھی تو کر سکتے ہو نا" اسد ہنس کر بولا۔

"میں نارمل انسان نہیں ہوں۔ نامساعد حالات نے میرے قدموں کی طاقت چھین لی ہے۔ میرے حوصلے ٹوٹ چکے ہیں"۔ محسن نے دلگیر ہو کر کہا "مجھے کچھ سمجھ نہیں آتی کیا کروں؟"

"حوصلے ٹوٹ گئے تو کیا ہوا۔ یہ کیوں بھولتے ہو؟ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنہوں نے تمہیں ٹوٹ کر چاہا ہے اور اب بھی چاہ رہے ہیں۔ یہ یاد رکھو محسن۔ اگر ایک دفعہ پھر تم ہمارا ساتھ چھوڑ کر قنوطیت کے گھنے جنگل میں کھو گئے تو پھر ہم تمہیں کبھی نہ پا سکیں گے۔ اس وقت ہم تمہیں جذبات کی دنیا سے نکال کر مناسب و توازن دکھا رہے ہیں اور اگر تم نارمل نہیں ہو تو ہم تو پریکٹیکل ہیں۔ تم ہم پر بھروسہ کرو نا اور چلو ہمارے ساتھ۔ تم جس طرح چاہو گے اس طرح ہوگا۔ تم میری ہی فرم میں سے کوئی بھی کام پسند کر سکتے ہو"۔ اسد نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"اور پھر ایسا ہوا کہ اسد نے جو کہ بہت بڑے بزنس کا مالک تھا، اسے چھوٹے چھوٹے کام دینے شروع کر دیے جو محسن نے بہ احسن و خوبی کر دکھائے۔ جب اسد نے دیکھا کہ ابھی محسن کی صلاحیتوں کو زنگ نہیں لگا۔ تو کچھ وقفے کے بعد اسد نے منافعے کی رقم محسن کو لوٹا دی اور محسن نے تھوڑے سرمایہ سے اپنا ذاتی کام شروع کر دیا۔ جس میں اس کو کامیابی ہونا شروع ہو گئی۔ اور اس کے اثاثہ میں بتدریج اضافہ ہونے لگا۔ محسن کو اب وہ ہی کام تھے

دن بھر اپنے کاروبار میں محنت کرتا اور راتوں کو عبادت میں مصروف رہتا۔ وہ نہایت خاموشی سے سادہ زندگی گزارتا۔ دوست جب بھی اس کے اردگرد گپ شپ لڑانا شروع کرتے، وہ خاموشی سے جیب سے تسبیح نکال کر پڑھنے لگتا۔

"ارے بھئی کچھ تم بھی ادھر اُدھر کی بات کیا کرو۔ دیکھو تو دنیا میں کیا ہو رہا ہے" اس کے دوست اسے چھیڑتے ہوئے کہتے۔

"کچھ بھی مختلف نہیں ہے یارو۔ چھوڑو اب اس دنیا کے قصے نہ دہراؤ" وہ بیزاری سے کہتا۔

"پھر بابا میں باز آیا اس دنیا سے۔ دنیا کو سمجھ کر بیٹھے ہیں، اب دنیا دنیا کون کرے"۔

"لیکن بھئی یہ تمہارا چپ کا روزہ بھی تو ہمیں کھلتا ہے نا"۔ اسد ہنس کر کہتا۔

"دراصل بات یہ ہے کہ دوستو" محسن کچھ سوچ کر بولا" انسان اگر منہ سے چپ رہے تو ادراک کہاں کہاں لئے پھرتا ہے اور پھر میرے ایک بات نہ کرنے سے تمہیں کیا فرق پڑ جاتا ہے"۔ اس پر ظفر پھڑک اُٹھا" واہ کیا بات سے بات نکالی ہے بھئی۔ وہ جو کیا کہتے ہیں کہ:

صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے

مگر یار محسن ہمیں تو ضرور فرق پڑتا ہے تمہارے بات نہ کرنے سے۔ دیکھو! انسان کو سوشل انیمل کہا ہی اسی لیے جاتا ہے کہ وہ باہمی بات چیت میں حصہ لیتا ہے"۔ ظفر نے کہا۔

"شاید میں انسان ہی نہیں رہا ساتھیو" محسن کا ذہن متلاطم ہونے لگا۔ اسے ایسے لگ رہا تھا جیسے دور کوئی سسکیاں لے کر رو رہا ہو لیکن یہ اس کی اپنی ہی آواز تھی جو ماضی کے دہشت ناک کھنڈروں میں سے اُبھر رہی تھی۔ وہ زہرخند مسکراہٹ سے جیسے کراہتے ہوئے بولا" انسان انسانوں سے دور رہے تو پھر انسان کہاں رہتا ہے۔ انسان تو مہذب انسانوں میں پہچانا جاتا ہے۔ وہ اپنے کردار عمل کی بنا پر سماجی زندگی میں بحیثیت انسان گردانا جاتا ہے۔ درگاہوں کے تکیوں تاریک کونوں کھدروں میں چھپ کر میری اُمنگیں میرے ولولے میری زندگی کے مقاصد غرض ہر چیز نشے میں ڈوب کر تحلیل ہو جاتی تھی۔ پہلے میں سوچا ہی کرتا تھا مگر میں نے تنگ آ کر جوں جوں میں نے سوچنا بند کر کے خود کو مکمل طور پر مدہوشی کے سپرد کر دیا جیسے بپھری ہوئی لہروں سے لڑتے لڑتے ملاح کشتی لہروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دے، تو میں سب کچھ بھول گیا۔ دراصل میری بھی وہ بات تھی کہ جیسے آسمان سے گرا کھجور میں اٹک جائے اور جب کھجور سے اُترنے لگے تو دلدل میں جا پھنسے۔ ہاں وہ دلدل ہی تو تھی"۔ باتیں کرتے کرتے پھر محسن کے جبڑے بھنچنے لگے اور چہرے پر کرب نمودار ہونے لگا۔

"مجھے سمجھ نہیں آئی محسن تم میدان عمل چھوڑ کر کیوں بھاگ نکلے؟" ظفر جو محسن کی باتیں چپ کیے سن رہا تھا، خفگی بھرے لہجہ میں بولا" کیا اس لیے کہ اس دنیا کے چند بے ضمیر اور گھٹیا کردار کے لوگوں نے تم سے misbehave کیا؟ یار پھر کیا ہوا!! اس دنیا میں کیا کچھ نہیں ہوتا رہتا۔ تم کوئی پہلے آدمی تو نہ تھے۔ جس کے ساتھ ایسی انہونی ہوگئی اور پھر یہ مت بھولو کہ جو ہوا وہ سب دستِ غیب کا چکر تھا۔ خدا کے حکم کے بغیر تو پتا بھی نہیں ہل سکتا اور پھر ہم نہیں سمجھ سکتے کہ خدا کے کس کام میں کس بہتری کا راز پوشیدہ ہے"۔ ظفر نے جلدی سے محسن کے ہاتھ میں تسبیح پکڑاتے ہوئے کہا۔

تسبیح پکڑتے ہی محسن کو دوبارہ ہوش آنے لگا۔ اس کے چہرے پر کرختگی کی جگہ اِک نور سا پھیل گیا۔ وہ جلدی جلدی تسبیح کے دانے گرانے لگا۔ اس کے

ہونٹ آہستہ آہستہ اللہ کے ذکر سے ہلنے لگے اور آنکھیں مندنے لگیں تو سب اسے اس کے حال پر چھوڑ کر آپس میں دھیمے دھیمے باتیں کرنے لگے۔

"یار ایسا انسان جو کہ اللہ کا نام سنتے ہی پگھل کر موم ہو جاتا ہے، یہ سوچ کر حیرت کے ساتھ ترس بھی آتا ہے کہ کس طرح اتنی بڑی آزمائش سے دوچار ہو گیا" اسد نے آہستگی سے کہا۔

محمد ظفر نے یہ کہہ کر بات کا رُخ تبدیل کر دیا "ارے بھئی اب چھوڑو بھی اس موضوع کو کوئی اور بات کرو۔"

ڈوبنا تھا سو ناؤ ڈوب گئی
کیا کہیں کس کی ناخدائی تھی؟

گورنمنٹ ہائی سکول فار گرلز کی پرنسپل مس حسنہ ملک سکول کی وسیع وعریض بلڈنگ سے ملحقہ اوپر کے تین کمروں میں رہتی تھیں کیونکہ تیس سال کی عمر میں پہنچنے کے باوجود وہ فی الحال "مس" ہی تھیں لہٰذا اکیلی جان اور تنہائی کے خیال سے دور رہنا پسند نہ کرتیں۔ ان کے پرکشش اور باوقار سراپے کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ وہ جوانی میں خاصی قیامت ہوں گی۔ ان کی تمام زندگی میں صرف ایک ہی شخص ان کی دل کی دھڑکنیں تیز کرنے میں کامیاب ہو سکا۔ وہ ان کا منگیتر تھا۔ ایک منڈ جیالا اور خوبرو ہوا باز جو 1965ء کی جنگ میں دشمن کے جہاز پر شاہین کی طرح لپکا تھا مگر خود اس کو زمین پر صحیح وسلامت آنا نصیب نہ ہو سکا تھا۔ مس حسنہ بے چاری زندگی کی خوشیوں سے اس وقت محروم ہوئیں جب ان کے ارمانوں کے پھول کھلنے والے تھے۔ قسمت نے نجانے کیسا سنگین مذاق کیا تھا ان سے اور پھر اس کے بعد حسنہ کی نگاہوں میں کوئی بھی نہ سما سکا۔ اور اب تک شادی نہ کرنے کی یہی وجہ تھی۔ گھر والے کہہ کہہ کر جب ہار گئے اور حسنہ ٹس سے مس نہ ہوئیں تو انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا اور حسنہ ایم بی ایڈ کر کے مس ملک بن گئیں۔ اپنی غیر معمولی ذہانت اور خداداد صلاحیتوں کے طفیل پرنسپل کے عہدے پر پہنچنے میں دیر نہ لگی مگر تعلیم کی مزید ڈگریاں حاصل کرنے میں وہ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ ہو گئیں۔ ویسے بھی دنیا کی رنگینیوں نے تو مرنے والے کے ساتھ ہی منہ موڑ لیا تھا۔ میک اپ سے بے نیاز چہرے پر لانبی پلکوں والی اُداس اُداس بڑی بڑی آنکھوں سے جو دوسروں پر نگاہ ڈالتیں تو ہنستے ہوئے چہرے بھی اک بار سنجیدہ ہو جاتے۔ اب آ کر جو سٹڈی کرنے کی وجہ سے چند ایک چاندی کے تار بالوں میں آ گئے تھے، ان کو ایسے فخر سے ماتھے پر سجایا گویا یہ بھی کوئی ویسی ہی ٹرافیاں ہوں جن سے ان کی الماری بھری ہوئی تھی۔ سابقہ زندگی کی ناکامی اور محرومی کے ردعمل نے ان کو زود رنج بنا دیا تھا۔ وہ اپنی حسرتوں کی لاش سینے پر لگائے غیر یقینی مستقبل کے دھندلکے میں اس ویران راہ گزر پر کھڑی تھیں جہاں کسی نئی اُمنگ، نئی تمنا کا چاند طلوع نہیں ہوتا۔

آج کافی تھکا دینے والے آفس ورک کے بعد گھر آ کر وہ ذرا آرام کرنے لیٹی تھیں کہ باہر سے پھر شور کی آوازیں آنی شروع ہو گئیں۔ کوشش کے باوجود وہ جب سو نہ سکیں تو آواز دے کر آیا کو بلایا۔

"آیا، باہر سے کیا شور وغل کی آوازیں آ رہی ہیں؟ میں ایک منٹ کے لیے نہیں سو سکی۔"

"مس صاحب یہ جو سامنے سکول کی نئی عمارت بن رہی ہے نا۔ اچھی بھلی، اس کی کافی اونچی دیواریں بن چکی تھیں۔ تو اب اس کا ٹھیکیدار ان کو پھر گرا رہا ہے یہ سب وہی شور ہے" آیا نے بتایا۔

(جاری ہے)